اردو شاعری
میں
واقعاتِ کربلا

مُصنّفہ

ڈاکٹر نسیم نکہت

اردو شاعری

میں

واقعات کربلا

از ڈاکٹر نسیم آرا نکہت

(1993)

اس مقالے پر لکھنؤ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری منظور کی

زیر نگرانی

پروفیسر محمود الحسن رضوی

ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

حق اشاعت : منور جعفری

سنہ اشاعت : ۲۰۱۳

تعداد: چھ سو

ناشر: ڈاکٹر نسیم آرا نکہت

تعلیم: ایم اے (پی ایچ ڈی)

فون نمبر: 9415015186

طباعت: نظامی پریس، لکھنؤ

کمپیوٹر کمپوزنگ: تحسیر احمد

قیمت: ۵۰۰ روپے

تقسیم کار: دانش محل امین آباد،
نظامی پریس تلسی داس مارگ لکھنؤ

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

پیش لفظ

واقعہ کربلا وہ عظیم سانحہ غم ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر شاید کسی زبان کا ادب نہیں رہ سکا۔ دراصل اس واقعہ نے تاریخ عالم اور تاریخ انسانیت کے اتنے پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے کہ شاعر وادیب کو اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اردو شعر وادب میں اس کے اثرات اتنے وسیع اور غیر معمولی ہیں کہ اس کا تفصیلی تجزیہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یوں تو ادب پر اس کے اثرات اور شعری استعارات کے انداز میں اس کے مطالعہ کی طرف بہت سے ناقدین اور محققین نے توجہ کی ہے لیکن ابھی تک کسی نے اسے تحقیق کا موضوع نہیں بنایا، لیکن راقم الحروف نے محسوس کیا کہ اس پر باقاعدہ کام کیا جائے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ''اردو شاعری میں واقعہ کربلا'' کا انتخاب کر کے اس پر تحقیقی کام شروع کیا گیا۔ یہ کام بظاہر آسان معلوم ہوا تھا کیوں کہ یہ عناصر ہر دور اور ہر صنف میں بہ آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن اسی چیز نے اس میں دشواریاں بھی پیش کر دیں۔ یعنی اتنے وسیع سرمایہ کو سمیٹنا کتنا مشکل مرحلہ تھا اس کا احساس کرنا مشکل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی اور فارسی میں اس موضوع کو ہر صنف میں اہمیت دی گئی اور یہی اثرات تھے جن سے اردو کا ادبی سرمایہ اسے نظر انداز نہ کر سکا۔ چونکہ اردو شاعری نے فارسی کے سائے میں پرورش پائی اور غزل پر فارسی شاعری کے اثرات زیادہ مرتب ہوئے، غزل کے تمام اساسی مضامین کا مواد ایران سے ہندوستان آیا۔ دوسری طرف کربلا کے واقعات پر لکھے گئے مرثیوں کے ارتقاء نے بھی غزل کو متاثر کیا۔ مساوات، تزکیہ نفس، حق و باطل کا بھرپور اظہار مرثیوں کے ذریعہ ہوا۔ یہ تمام موضوعات مرثیے کی راہ سے اردو شاعری

میں بھی در آئے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ جب کوئی واقعہ لازمی معنی میں استعمال ہونے لگتا ہے اور اُس پر مختلف زمانوں اور ذہنوں کا اثر پڑتا ہے تو مختلف اظہاری وسائل کے عمل ورد عمل سے دو چار ہوتا ہے۔ فن کار کی واردات داخلہ تجربے اور قدرت کلام کا اثر بھی مختلف اظہاری وسائل کی نوعیت پر پڑتا ہے اظہار کے وسائل ہزاروں میں لیکن استعارے، خلامات، پیکریت، اسطور نگاری کا بے مثل خزانہ ہمیں واقعۂ کربلا میں ملتا ہے اس موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے فروفیسر شبیہ الحسن نونہروی صاحب نے مجھے رائے دی اور میرے نگراں محمود الحسن صاحب رضوی نے SYNOPSIS اس انداز میں بنائے کہ سب سے قبل مجھے اس کے مطابق اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑا اور رسولِ خدا صلعم کے زمانہ سے لے کر حضرت علیؑ کے دور اور پھر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے متعلق تفصیل سے اول باب میں ذکر کیا ہے پھر واقعاتِ کربلا کا مختصر جائزہ لینے کے بعد کربلا کے کرداروں کا مطالعہ کیا ہے۔

دوسرے باب میں مرثیوں کا مطالعہ کیا ہے اور قدیم مرثیوں سے لے کر جدید مرثیوں اور مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے اور تمام سعی کی ہے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔

تیسرے باب میں اردو شاعری کی ابتداء کے دور سے۔ لے کر بیسویں صدی سے قبل کے تمام شعراء کا مطالعہ کیا ہے اور اُن تمام شعروں کو جمع کیا ہے جن کے کلام میں واقعۂ کربلا کے استعارے ملتے ہیں۔

چوتھے باب میں غزل میں ہونے والی تبدیلیوں کے زیر اثر اس کو واضح کرنے کے لیے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی کشمکش کا ذکر کیا ہے جس میں تحریکِ آزادی اور ملک کی آزادی اور تقسیم ملک کے نتائج وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد شاعری پر اُس کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کا ذکر کیا ہے۔ آٹھویں باب میں دور جدید کی شاعری میں واقعہ کربلا کی کیا اہمیت ہے اس کا جائزہ لیا ہے اور اب ہر باب میں مختلف ادوار کے تقاضوں کے لحاظ سے واقعہ کربلا کے شعری استعارات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے کے سلسلے میں استاذ محترم پروفیسر محمود الحسن صاحب رضوی نے میری قدم قدم پر رہنمائی کی اور ان کی باریک بینی وتنقیدی نظر کی وجہ سے مقالے کو بہت صاف ستھری شکل حاصل ہوئی ہے۔ ان کی مخلصانہ کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ مقالہ مکمل ہوکر آپ کے سامنے ہے اس تحقیقی سفر میں مجھے مرثیوں کے باب کے سلسلے میں جناب نیر مسعود صاحب نے کافی کتابیں مہیا کرائیں میں ان کی بہت ممنون ہوں اور کتابوں کے سلسلے میں جناب عابد سہیل صاحب نے کافی مدد کی ان کی بھی مشکور ہوں۔ جناب کیفی اعظمی صاحب، علی سردار جعفری صاحب اور عبید اللہ علیم سلیم کوثر نے اپنے کلام کے سلسلے میں میری مدد کی اور مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام مجھے فراہم کرایا جو کہیں دستیاب نہیں تھا۔ میرا تحقیقی مقالہ آپ کے سامنے ہے میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اس میں کہیں کوئی کمی نہ رہنے پائے اور تمام شعراء کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، یہ مقالہ بالکل مذہبی بھی نہیں ہے بلکہ میرا انداز تحریر ادبی اور تحقیقی رہے اس کی بہت کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ اس کی معنویت پر توجہ کی جائے گی اور کوتاہیوں کے لیے معذرت قبول کرلی جائے گی۔

ڈاکٹر نسیم آرا نکہت

اردو شاعری میں واقعات کربلا

(چند تاثرات)

پروفیسر سید محمود الحسن

واقعہ کربلا محض اسلامی تاریخ کی اہم منزل نہیں ہے جس نے اس خیال کو مستحکم کیا کہ "حقا کہ بنائے لا اللہ ہست حسین" بلکہ اُس نے انسانی عظمت اور معاشرے کی بلندی کے ایسے حقائق پیش کر دیے جن پر عمل کر کے آج بھی حق و انصاف، شر کے مقابلہ میں خیر اور ذلت کی زندگی سے نجات حاصل کر کے عزت کی موت کو ترجیح دینے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کوئی شعبۂ حیات اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ شعراء کو جب اپنی شاعری کے ذریعہ مظلوم کی آواز بلند کرنے اور انسانیت کے اور اصولوں کی تبلیغ کے لیے کوئی مثال تلاش کرنی پڑی تو انہیں صرف واقعاتِ کربلا کا سہارا ملا۔ اردو شعراء نے عوامی زندگی کے غم، مصائب اور انفرادی شرائد و اکلام سے سکون حاصل کرنے کے لیے اسی واقعہ کو مثال بنا کر پیش کیا، کبھی واضح طور پر، کبھی علامات کے ذریعہ اگر ایک طرف مرثیہ گو شعراء نے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے اپنے فن کو ذریعہ بنایا تو دوسری طرف غزل گو شعراء نے بھی اپنے اشعار میں اس واقعہ پر

اشارے کر کے انسانی شعور کو بیدار کرنے پر توجہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتدائی منزل سے آج تک اس واقعہ کو کسی نہ کسی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ خاص طور پر جب انسانیت پر ظلم و جبر کی قوتیں حاوی ہوتی رہی ہیں۔ اُس وقت شعراء نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ چنانچہ بعض ایسی تصانیف سامنے آئیں ان میں ایسی علامات پیش کی گئیں جو واقعہ کربلا سے متعلق شاعروں نے نظم کیں ہیں لیکن تحقیقی طور پر ایسی کوشش نہیں کی گئی جن کے ذریعہ اردو شعراء کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیا جاسکے۔ اور جس کے مطالعہ سے مجموعی طور پر شاعری اور واقعہ کربلا کے تعلق کو ظاہر کیا جاسکے۔ چنانچہ محترمہ نسیم نکہت نے اسی احساس کے پیش نظر ''اردو شاعری میں واقعات کربلا'' موضوع کو اپنی پی ایچ ڈی کے مقالہ کے لیے منتخب کیا۔ ڈاکٹر نسیم نکہت خود ایک شاعرہ ہیں۔ انہوں نے ہر دور کے شاعروں کا مطالعہ کیا اور اسی لیے جن حقائق کی وضاحت کی ہے اور جو مثالیں پیش کی ہیں وہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ مقالہ میری نگرانی میں مکمل ہوا مجھے خوشی و اطمینان ہے کہ ڈاکٹر نسیم نکہت نے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور کافی محنت کر کے اس تحقیقی کام کو انجام دیا ہے۔ اس تحقیقی تصنیف کے علاوہ اگر وہ اس موضوع پر مزید کام کریں گی تو اس سے اردو ادب میں اضافہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس مقالہ کو ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا اور اس کے مطالعہ سے شائقین ادب استفادہ کریں گے۔

سید محمود الحسن

حرفے چند

(پروفیسر) ملک زادہ منظور احمد

علم و دانش، تلاش و تحقیق، جستجو و آواز کی کوئی منزل، منزل آخر نہیں ہوتی، ماضی کے نہاں خانوں سے پرانی شہادتیں سر اُٹھا کر پرانے مسلمات کو رد بھی کرتی ہیں اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اُنہیں مزید تائید اور توثیق سے نوازتی ہیں لیکن دونوں صورتوں میں بنیاد کا پتھر وہی نظریہ ہوتا ہے جو کوئی محقق روز اول پیش کر دیتا ہے اور بعد کے آنے والے انہیں نظریات کے رد و قبول کے حوالے سے اپنی اپنی شہادتیں اور تاویلات پیش کر کے اپنے لیے امتیاز کے پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ زیر نظر تحقیقی مقالہ ''اردو شاعری میں واقعات کربلا'' ایک تحقیقی کاوش ہے جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے ڈاکٹر نسیم آرا نکہت کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی اور جو یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر محمود الحسن کی نگرانی میں تحریر کیا گیا۔ ڈاکٹر نسیم آرا نکہت کا شمار دور حاضر کی معروف اور صف اول کی شاعرات میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی مجموعہ کلام شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں اور صرف ہندوستان کے مختلف شہروں ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک کے مشاعروں میں وہ مدعو کی جاتی رہی ہیں۔ اُن کی اسی شہرت نے اُن کی دیگر معتبر صلاحیتوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ لوگ

انہیں ایک شاعرہ کی حیثیت سے تو خاطر خواہ جانتے اور پہچانتے ہیں مگر بحیثیت دانشور اُن کے زیر نظر تحقیقی مقالہ کی اشاعت ان کی تحقیقی صلاحیتوں کا اشاریہ بنے گی اور اُنہیں علمی حلقوں میں بھی وہ ہی شہرت اور امتیاز عطا کرے گی جو عوامی حلقوں میں اُن کی شاعری نے اُن کو عطا کی ہے۔

کربلا اردو شاعری کا مختلف حوالوں سے موضوع ہر دور میں ابتدائی دور کے مسالموں سے لے کر دور حاضر تک اس کے علامتی اور استعاراتی نظام نے مختلف اصناف ادب پر اپنی پرچھائیاں ڈالی ہیں۔ مرثیوں کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ اردو غزلوں کے حسن و جمال میں اس نے اضافے کیے ہیں۔ نہ جانے کتنے محاورات، استعارات الفاظ وتراکیب کی بازگشت جو واقعات کربلا سے ماخوذ و مستعار ہیں، صرف ہندو پاک کے شعراء کے کلام ہی میں نہیں سنائی دیتی بلکہ ان شعراء کے کلام میں بھی حسن اور تاثیر پیدا کر رہی ہیں جو اردو کی نئی بستیوں میں آباد ہیں۔ اردو منظومات اور اردو غزلوں نے معنی آفرینی، تاثیر اور دردمندی کے علاوہ جزشکر، ایثار کی پیکر تراشی کا فن واقعات کربلا سے سیکھا ہے اور اپنے حسن میں اضافے کیے ہیں۔ ڈاکٹر نسیم نکہت ہمارے ہدیہ تبریک کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اس اہم موضوع کو اردو شاعری کے حوالہ سے اپنے تحقیقی مقالہ کا عنوان بنایا اور فکر و نظر کے بہت سے نئے پہلو اردو قارئین کے سامنے پیش کیے۔

ملک زادہ منظور احمد

۱۴ اکتوبر ۲۰۱۳ء

سیمانت نگر، کنچن بہاری مارگ

کلیان پور لکھنؤ

HaSnain Sialvi

جہاں احتجاج ہے وہاں کربلا ہے

ڈاکٹر شارب ردولوی

واقعہ کربلا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے ہر شخص کو متاثر کیا وہ خواہ کسی ملک سے اور کسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہو، یہی سبب ہے کہ اس کا اظہار مختلف زبانوں میں اپنے اپنے انداز میں مل جاتا ہے اور یہ صرف مرثیے تک محدود نہیں ہے۔ اس کا اظہار زبانی شعری روایت Real Oral Trediton of History Poetry سے لے کر آج کی جدید ترین اصناف میں مل جاتا ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے اشعار میں اس کا حوالہ نہ آیا ہو۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری نے ایسے قدیم شعراء کے اشعار کی نشاندہی کی جن میں مرثیے سے الگ واقعہ کربلا کے اشارے ملتے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے واقعہ کربلا ایک شعری استعارہ لکھ کر نہ صرف ایسے جدید و قدیم شعراء اور ان کے اشعار کا تفصیل سے ذکر کیا بلکہ واقعہ کربلا کی اہمیت اور آج کے حالات میں اس کی گہری معنویت پر روشنی ڈالی ان کا یہ مطالعہ اردو تنقید کے جدید حوالوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا کا بیان واقعہ کی شکل میں تو مرثیے تک رہا لیکن اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں مرثیہ کا نام ہی واقعہ کربلا کا اشاریہ بن گیا لیکن شاعری میں کہاں کہاں اس کے اثرات گئے ہیں اور کن معنوں اور عصری تقاضوں کے ساتھ ان کا استعمال ہوا ہے یہ توجہ

طلب بات ہے۔

'اردو شاعری میں واقعہ کربلا' ڈاکٹر نسیم نکہت کا مقالہ ہے جس میں انہوں نے پوری اردو شاعری میں اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کہ کہاں کہاں کس کس طرح سے واقعہ کربلا کا اظہار ہوا ہے اور کہاں اس کی اشاریت نے شعر کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ اس ضخیم مقالے میں انہوں نے کربلا کے تاریخی پس منظر کے ساتھ اردو میں بیسویں صدی سے قبل کے شعراء اور مرثیہ نگاروں کے کلام کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے زیادہ مثالیں نظموں اور غزلوں سے دی ہیں۔

دوسرے ابواب میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کے اہم شعراء جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، کیفی اعظمی، سردار جعفری، جاں نثار اختر، مخدوم، مجاز اور احمد ندیم قاسمی کے کلام کے ایسے حوالے دیے جن میں براہ راست کربلا سے متعلق کوئی حوالہ ہے یا بالواسطہ اسکا اشارہ ملتا ہے۔ کربلا کے واقعہ نے ذہنوں کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ ان کی فکر کا حصہ بن گیا۔ اس لیے جہاں زندگی کے جبر و کرب کا ذکر ہے یا جہاں احتجاج ہے ایسے تمام اشعار میں بین السطور میں کربلا کا اثر دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر نسیم نکہت خود ایک اچھی شاعرہ ہیں اور ایک تخلیقی فنکار ہونے کی وجہ سے دوسروں کی تخلیق کی معنویت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں۔ انہوں نے بڑی محنت سے مقالہ لکھا ہے اور انہوں نے جو مثالیں دی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح واقعہ کربلا نے پوری اردو شاعری کو متاثر کیا ہے ان کو ان کی اس ادبی و تحقیقی کاوش کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔

پروفیسر شارب ردولوی

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

سی 95 سیکٹر ای، علی گنج، لکھنؤ

فہرست مضامین

پیش لفظ ڈاکٹر نسیم آرا نکہت ۲

﴿باب اول﴾

واقعہ کربلا تاریخی، مذہبی، معاشرتی اور ادبی اہمیت

الف: مذہب اسلام کے بنیادی اصول اور رسول خدا کی عظمت
ب: اسلام اور اس کی مخالف قوتیں، اسلامی لشکر سے مقابلہ
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی
رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد
ج: حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے امتیازی پہلو اور خصوصیات
امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ کی تربیت اور ان کی شخصیت میں
اسلام اور انسانیت کے تحفظ کا رجحان
د: واقعہ کربلا ایک مختصر جائزہ
ھ: امام حسنؑ کی شہادت مقصد اور نتائج
و: واقعہ کربلا کے اہم کردار
امام حسینؑ اور ان کے اصحاب
فوج یزیدی کے کردار

باب دوم

اردو مرثیہ اور واقعہ کربلا کی اشاعت

الف: اردو میں مرثیہ نگاری کا ارتقاء (بیسویں صدی سے قبل)

ب: اردو مرثیہ (بیسویں صدی میں)

مرثیہ میں جدید رجحانات اور سیاسی سماجی اور معاشرتی مسائل کا اظہار

باب سوم

بیسویں صدی سے قبل اردو شاعری میں واقعات کربلا

الف: غزلوں میں واقعات کربلا کی عظمتوں کا اظہار

ب: نظموں اور دیگر اصناف سخن میں واقعات کربلا کے اشارے

باب چہارم

بیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی وسیاسی اور معاشی کشمکش

الف: آزادی کی جدوجہد، جلیاں والا باغ کا واقعہ

خلافت تحریک، مسلم لیگ کا قیام اور مطالبہ پاکستان

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات

گاندھی جی کی ہندوستان چھوڑ تحریک

ملک کی آزادی اور پاکستان کا قیام

تقسیم ملک کے نتائج

ب: ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریات

ترقی پسند شاعری میں عوام اور سماجی کشمکش کا مطالعہ

باب پنجم

اردو شاعری میں واقعات کربلا (۱۹۰۱ء تا ۱۹۳۶ء)

الف: غزل میں واقعات کربلا کے اشارے اور علامتوں کا اظہار
دیگر اصناف میں واقعہ کربلا

باب ششم

ترقی پسند شعراء میں واقعات کربلا

الف: ممتاز ترقی پسند شعراء کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ

باب ہفتم

جدیدیت سے متاثر شعراء کے کلام میں واقعات کربلا

الف: دور جدید کے انسان کی مایوسی اور انتشار

ب: انفرادیت پرستی اور عدم استحکام کی کیفیت
مغرب کے جدید فلسفیوں کے نظریات کا مطالعہ

ج: دور جدید کے غزل گو شعراء اور واقعہ کربلا

د: جدید نظموں میں واقعات کربلا کے اشارے

باب ہشتم

دور جدید کی شاعری میں واقعات کربلا کی اہمیت

ایک مجموعی جائزہ

باب اول

واقعہ کربلا تاریخی، مذہبی، معاشرتی اور ادبی اہمیت

الف: مذہب اسلام کے بنیادی اصول اور رسول خدا کی عظمت

ب: اسلام اور اس کی مخالف قوتیں، اسلامی لشکر سے مقابلہ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد

ج: حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے امتیازی پہلو اور خصوصیات

امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ کی تربیت اور ان کی شخصیت میں

اسلام اور انسانیت کے تحفظ کا رجحان

د: واقعہ کربلا ایک مختصر جائزہ

ہ: امام حسنؑ کی شہادت مقصد اور نتائج

و: واقعہ کربلا کے اہم کردار

امام حسینؑ اور ان کے اصحاب

فوج یزیدی کے کردار

اسلام کے بنیادی اصول

انسان اشرف المخلوقات ہے یہ فضیلت اسے دو چیزوں کی بدولت حاصل ہے۔ اول عقل، دوم زبان عقل سے وہ غور کرتا ہے اور زبان سے بیان کرتا ہے اور زبان کے ذریعہ نسل در نسل اپنا پیغام پہنچاتا رہتا ہے۔ لیکن عقل صرف فکر ہی کر سکتی ہے، اگر اسے صحیح رہنمائی حاصل نہ ہو تو وہ گمراہ بھی ہو سکتی ہے مثلاً انسان نے اس طاقتور چیز کو خدا مان لیا جو اسے عظیم لگی یہاں تک کہ پتھر کے بت تراش کر انہیں سجدہ کیا یہ عقل کی ہی کوتاہی تھی اس لئے عقل کو ایسے رہنما کی ضرورت ہوئی جو ہر علم و فضل میں یکتا ہو اور ہر عیب سے پاک ہو اس لئے خدا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلکہ یوں کہیں کہ انبیاء اور مرسلین نے قوانین عدل لوگوں تک پہنچائے اور خدا کے حکم کے مطابق چلنے کا حکم دیا۔ اصل میں دین کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور دین اسلام مساوات محبت اور عدل و انصاف کا دین ہے۔ اور دینی احکام کو اعتقاد و عمل کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی اصول دین اور فروع دین۔ وضاحت کے طور پر مولانا خوئی کی تحریر پیش ہے:

> ''اصول دین پر اعتقاد واجب ہے اور وہ تعداد میں پانچ ہیں یعنی (۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوت (۴) امامت (۵) قیامت'' [۱]

---

[۱] توضیح المسائل، اشاعت ۱۴۰۴ھ، صفحہ ۱۹، از آیت اللہ العظمیٰ السید ابو القاسم الموسوی الخوئی

توحید سے مراد خالق کائنات کے وجود اور اس کے وحدہٗ لاشریک ہونے پر اعتقاد ہے۔

عدل: خداوند عالم عادل ہے وہ انصاف کرنے والا ہے خدائے پاک قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ ''تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا'' وہ تم کو آسانی دینا چاہتا ہے، دشواری میں مبتلا نہیں کرتا''۔ اللہ ہر طرح کے نقص و قبح سے پاک ہے۔

نبوت: نبی یا رسول کو خداوند عالم نے اس مقصد کے لئے منتخب کیا ہے کہ وہ اس کے بندوں کو ان امور کی خبر دے جن کا اسے حکم دیا گیا ہو ان امور کا حکم نبی کو کسی بشر کے واسطے سے نہیں بلکہ جبرئیل کے واسطے سے ہوتا ہے۔

امامت: دین و دنیا کی اس عمومی حکومت کو کہتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں ایک شخص کو حاصل ہوتی ہے تا کہ وہ شریعت کی حفاظت کرے۔

قیامت: قیامت میں خداوند عالم اجسام کو دوبارہ زندہ کرے گا تا کہ نیکو کاروں کو ان کی نیکی کی جزا اور بدکاروں کو ان کی بدی کی سزا دی جائے۔ یہ دن کب آئے گا اس کا علم صرف خداوند عالم کو ہے۔

بہر حال جس طرح کسی عمارت کے کھڑے رہنے میں کھمبوں کی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح اسلام کی بنیاد بھی پانچ کھمبوں پر منحصر ہے ان کے مضبوط ہونے سے اسلام مضبوط ہوتا ہے ان پانچ چیزوں کے بغیر نہ تو اسلام مضبوط ہو سکتا ہے اور نہ انسان کی ہستی میں اسلام کا ظہور ہو سکتا ہے، اسلام انسان میں خدا پرستی یا عبادت کی زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کے انہیں اصولوں کی اشاعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی جن کی عظمت و بلندی کو سمجھے بغیر کوئی مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام سے قبل عرب جاہل اور ظالم تھے وہ تہذیب اور خلوص سے قطعی ناواقف تھے اور بت پرست تھے حریص طبیعت تھے رقابت اور خانہ جنگی ان کا مزاج تھا، اس بات کے ثبوت

کے طور پر مولانا حفیظ ہوشیار پوری کی تحریر پیش ہے:

''انسان جو ہمیشہ تسکین اور سکون کی جستجو میں لگا رہا ہے اس نے حصول مقصد کے لئے طرح طرح کے نسخے تجویز کئے اور ان کو آزمایا کبھی فطرت کے ہنگامے کو متلون شخصی قوتوں کے ارادوں اور خواہشوں کی طرف منسوب کیا اور بے شمار دیوتا تراش لئے۔ اپنی سلامتی کے لئے ان سے ڈرنے لگا اور خوش کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا اس اشرف المخلوقات نے اپنے کئی خالق وضع کر لئے ان کے سامنے اچھی اچھی چیزوں کی نذریں پیش کرنے لگا جو چیزیں اپنے آپ کو پسند ہوں گی''۔[1]

اس طرح نوجوانوں، خوبصورت لوگوں کی قربانی بھی دی جاتی تھی اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے لوگ اپنی اولاد بھی قربان کر دیتے تھے۔ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے اور ایک ایک بت کی روز پرستش کی جاتی تھی اور پورا کا پورا نظام ہی بگڑا ہوا تھا، اور اسے بدل دینا قطعی ناممکن تھا اور ضرورت تھی کہ ایک ایسا نظام ہو جس کے بنائے اصولوں میں دنیا سچ اور جھوٹ حق اور باطل کا فرق محسوس کر سکے۔ مولانا سید علی نقی نقن صاحب نے لکھا ہے:

''ایسے وقت میں محمد بن عبداللہ اسلام کا زلزلہ افگن پیغام انقلاب لے کر دنیا کے سامنے آگئے اور مردہ انسانیت کو زندگی کا مژدہ سنایا''۔[2]

اسی بات کو رضوان الدین خاں کے لفظوں میں پیش کیا جا رہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ان نازک حالات میں جب مادہ پرستی اپنے پورے جاہ و جلال سے شمع روحانیت کو گل کرنا چاہتی تھی۔ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک

---

[1] اسلامیات، صفحہ ۶، از: حفیظ ہوشیار پوری، ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی، ۲۵/ اکتوبر ۱۹۵۱

[2] شہید انسانیت، صفحہ ۳۷، از: مولانا علی نقی نقن صاحب۔

ہنگامہ برپا تھا دنیا کے بیش تر حصے پر شیطان کا تسلط تھا کہ عرب کے اندر اسلام کا ظہور ہوا۔ فاران کی چوٹی سے رشد و ہدایت کا آفتاب افق سما پر جلوہ افروز ہوا جہالت و ضلالت کی تاریکی دور ہوئی اور دنیا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور عملی زندگی نے جو روح پھونکی اس کے اثر سے اسلام دیکھتے ہی دیکھتے روئے زمین پر چھا گیا۔"[1]

اور اس طرح ان پجاریوں سے جو خدا اور بندوں کے درمیان وسیلہ بنے ہوئے تھے ان امیروں سے جو نہ خدا کا قانون مانتے تھے اور نہ مزدوروں کی محنت کا پھل دیتے تھے۔ ظلم اور انسانیت کے خلاف سلوک کرتے تھے ان سے لوگوں کو نجات مل گئی۔ اس سے قبل بھی بہت سے نبیؑ اس مقصد کے لئے آچکے تھے لیکن کوئی اتنا کامیاب نہ ہو سکا جتنی کامیابی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت دنیا کو بے حد ضرورت تھی اور کیوں ضرورت تھی اس بات کے جواب میں ہم بابا خلیل احمد کی تحریر پیش کرتے ہیں:

"جس طرح ہم ناک کے ذریعے سونگھتے ہیں دماغ کے ذریعے سوچتے سمجھتے ہیں ہاتھوں کے ذریعے چھوتے اور پیروں کے ذریعے چلتے ہیں اسی طرح وہ بزرگ اور قابل احترام "وسیلہ" جس کے ذریعے ہم خدا کا مقدس پیغام پاتے ہیں اس کو قرآن شریف کی زبان میں نبی رسول یا پیغمبر کہتے ہیں۔"[2]

---

[1] نقوش اسلام، صفحہ: ۶، حصہ اول، از: رضوان الدین خاں، مطبوعہ: فرینڈس بک ہاؤس علی گڑھ، جولائی ۱۹۷۹ء

[2] اسلام اور مسلم، صفحہ ۱۶، از: بابا خلیل احمد، عالم پورہ بنارس، ۱۹۶۰ء

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے ذریعے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اسلام کے پرچم کے سائے میں ایک عالم کو جمع کرنے کے لئے معبود برحق اور خدائے کل ثابت کرتے ہوئے سب کا قبلۂ مقصد قرار دے دیا تاکہ لوگوں میں احساس اخوت ومساوات پیدا ہو، اور خدا کے بندے ایک ہو جائیں یہی اسلام کا ایک اصول تھا سب کو برابری کا حق دینے کے بعد ایک امتیازی فرق قائم کر دیا گیا اور وہ تھا انسانی کردار۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مقصد رسالت ہی یہی قرار دیا ہے کہ میری بعثت محض انسان سدھار اور اچھے اخلاق کی تکمیل کی غرض سے ہے یعنی رسالت کا مقصد ہی یہ تھا تو اب رسالت کے متعلق مولانا صدرالدین اصلاحی کیا لکھتے ہیں دیکھئے:

> ''رسالت کے لفظی معنی سفارت اور پیغامبری کے لئے ہیں شریعت کی اصلاح میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے اور انہیں اپنی مرضی کی راہ بتانے کے لئے قائم کیا ہے اس کا دوسرا نام نبوت ہے۔''[۱]

اور اللہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اسلام کے نور سے بھر دیا جس طرح اندھیروں میں سورج کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسی طرح اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت تھی۔

دراصل رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے ذریعے عدل وانصاف، نظم وضبط اور امور خلق کو بہترین طریقہ پر چلانے کی تعلیم دنیا کو دی ایک طرف کفر کا اندھیرا تھا تو دوسری طرف اسلام کا آفتاب۔ ان آفتاب کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں مولانا وحیدالدین خاں کی تحریر

---

[۱] اسلام ایک نظر میں، صفحہ: ۴۳، از: مولانا صدرالدین اصلاحی، مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی-۶، اکتوبر ۱۹۶۱ء

دیکھنی چاہئے:

''ایسی حالت میں چودہ سو سال پہلے والے پیغمبر اسلام کو ماننا اور آپ کا ساتھ دینا ان لوگوں کے لئے کوئی سادہ واقعہ نہ تھا یہ قائم شدہ دین سے نکل کر ایک ایسے دین کو اختیار کرنا تھا جو ابھی قائم نہیں ہوا تھا، یہ مفادات سے وابستہ سچائی کو چھوڑ کر مجرد سچائی کو اختیار کرنا تھا یہ مادی عظمتوں سے اوپر اٹھ کر غیر مادی عظمتوں کا ادراک کرنا تھا۔ یہ حال کے پردے میں مستقبل کا مشاہدہ کرنا تھا یہ مخصوص خداؤں سے گذر کر چھپے ہوئے خدا کو پالینا تھا'' ۱؎

لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس تحریک میں اس قدر کامیاب ہوئے کہ نہ پہلے اور نہ کبھی آگے اس کامیابی کی مثال مل سکے گی۔ اسلام کو اگر عقیدت سے ہٹ کر دیکھئے تو بھی اتنا جامع مضبوط اور اتنا واضح مذہب کوئی دوسرا نظر نہیں آتا ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معاشرے کی تشکیل کی جو ہر قسم کے ظلم واستحصال سے پاک تھا اور عالم گیر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا، آپ نے وحشی وصحرائی قبائل کو اسلام کے عقائد اور تعلیم وتربیت کے ذریعے ایک مہذب وترقی یافتہ قوم بنا دیا۔ عبدالسلام قدوائی ندوی کے لفظوں میں دیکھئے یہ تحریر ہماری بات کا ثبوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''دنیا کی تاریخ میں رنگ ونسل اور ملک وقوم کی تفریق کے خلاف یہ پہلا کھلا ہوا اعلان تھا اور ساری نوع انسان کو یکساں سمجھنے اور سب کی فلاح و بہبود کے لئے یکساں جدوجہد کرنے کا یہ پہلا بیان تھا وہ مصلح اعظم جو دستور لے کر آیا تھا اس کے اندر صاف صاف تصریح تھی کہ ﴿یا ایھا الناس انا خلقنا

۱؎ احیائے اسلام، صفحہ ۱۸، از: مولانا وحید الدین خاں، مطبوعات اسلامی مرکز، ۱۹۸۲ء، مکتبہ رسالہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان، اسٹریٹ، دہلی-۶

کم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عندالله اتقاکم﴾ یعنی اے لوگوں ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں اقوام و قبائل کی شکل صرف اس لئے دی ہے تاکہ ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو"۔ ۱

اسلام کے انہیں اصولوں کی اشاعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی جن کی عظمت و بلندی کو سمجھے بغیر کوئی مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ حضرت قریش کے معزز ترین قبیلہ بنی ہاشم سے تھے آپ کے والد کا نام جناب عبداللہ بن عبدالمطلب اور والدہ کا نام حضرت آمنہ بنت وہب تھا، آپ کی پرورش والد و والدہ کے انتقال کے بعد دادا عبدالمطلب نے کی لیکن ان کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ کے چچا حضرت ابوطالب نے آپ کی پرورش کی۔ شیخ احمد حسین صاحب کے مطابق:

"تاریخ الخمیس میں ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بقولے بارہویں ربیع الاول کو اور بروایت سترہویں ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ ۲

جوان ہونے پر جب آپ کو فکر معاش ہوئی تو اپنے خاندانی پیشے تجارت کو پسند فرمایا اور آپ کی راست بازی حسن معاملہ صداقت اور دیانت و پاکیزہ اخلاق کے چرچے ہوتے تھے اور لوگ اپنا سامان اور امانتیں آپ کے پاس رکھوایا کرتے تھے لوگوں نے آپ کو امین کا لقب دیا تھا۔ اس بارے میں اے اے ہاشم صاحب لکھتے ہیں کہ

---

۱ دنیا اسلام سے پہلے اسلام کے بعد، صفحہ ۶۴، از: عبدالسلام قدوائی ندوی، اگست ۱۹۷۲ء، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، دہلی-۲۵

۲ تاریخ احمدی، ص ۸، نواب شیخ احمد حسین صاحب خاں بہادر، نامی پریس، لکھنؤ۔ ۱۹۴۶ء

''آپ کی عادتیں بچپن ہی سے نیک تھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے وعدہ پورا کرتے تھے لوگوں کی امانت میں خیانت نہیں کرتے تھے مسافروں کی مدد کرتے تھے بیوہ اور یتیموں کے ساتھ ہمدردی کرتے تھے بہت ہی جلد آپ اپنی عادت کی وجہ سے مقبول ہو گئے۔''[۱]

پھر ان تمام باتوں سے متاثر ہو کر حضرت خدیجہ نے جو ایک شریف و مالدار بیوہ تھیں آپ کے پاس عقد کا پیغام بھیجا جو آپ کے چچا اور آپ نے قبول فرمایا اور غالباً ۵۹۴ء میں آپ کا عقد حضرت خدیجہؓ سے ہوا، آپ بچپن اور شباب میں بھی مراسم شرک سے نفرت کرتے تھے اور انہیں غلط تصور کرتے تھے، رفتہ رفتہ عمر بڑھنے کے ساتھ آپ کی طبیعت گوشہ نشینی اور عزت نشینی کی طرف مائل ہونے لگی۔ اس سلسلے میں سید علی حیدر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۲۸ رسال کے ہوئے تو گوشہ نشینی کا شوق پیدا ہوا، کوہ حرا پر جس کو جبل ثور بھی کہتے ہیں اور جو مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے تشریف لے جاتے اور ایک غار میں جو چار ہاتھ لمبا اور ڈیڑھ ہاتھ چوڑا تھا بیٹھ کر خانہ کعبہ کو دیکھا کرتے اور ذکر حق میں مشغول رہتے۔[۲]

۴۰ رسال کی عمر میں ایک دن اسی طرح عالم تنہائی میں حضرت جبرئیل وحی لائے اور سب سے پہلے حضرت خدیجہ حضرت علی علیہ السلام اور زین بن حارث کو ان کے پیغمبر ہونے کا پتہ چلا۔

اس کے بعد آپ نے اپنا فرض انجام دینا شروع کیا جوں جوں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی مشرکین کی مخالفت بھی بڑھ رہی تھی اور اس بات کے واضح ثبوت

۱۔ اسلامی تاریخ، صفحہ ۲، از: اے اے ہاشم، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۷ء

۲۔ تاریخ آئمہ، صفحہ ۱۰۶، از: مولانا سید علی حیدر

کے طور پر مالک رام صاحب کی تحریر دیکھئے:

"جب تبلیغ وسیع ہونے لگی اور بعض بڑے گھروں کے نوجوان اور غلام حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ پانی سر سے گذرتا جارہا ہے اور اب مزید بے اعتنائی سے کام نہیں چلے گا تو وہ جارحانہ مخالفت پر اتر آئے۔"[1]

بنی امیہ اس مخالفت میں سب سے زیادہ آگے تھے کوئی تکلیف باقی نہیں رہی جو انہیں نہ دی گئی ہو۔ اسی دوران میں حضرت خدیجہ اور حضرت ابوطالب کے انتقال سے آپ بہت زیادہ کمزور و تنہا رہ گئے۔ اور قریش کے ظلم بھی بڑھ گئے آپ مکہ والوں سے بالکل ناامید ہو چکے تھے اس لئے طائف تشریف لے گئے لیکن طائف میں بھی اچھا سلوک نہ ہوا آخر کار آپ واپس مکہ آ گئے۔

ھجرت: اب خدا کی مدد سے قبیلہ اوس وخزرج اسلام لے آئے، لیکن اس سے دشمنوں کی سازش اور بھی بڑھ گئی خطرہ بڑھتا گیا تھا اس لئے آپ نے ہجرت اختیار کی۔ اور اصحاب کو بھی اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کریں۔ جب سب اصحاب ہجرت کر گئے اور جس شب آپ کو ہجرت کرنا تھی قریش نے بہت سے قبائل کے سرداروں کو ساتھ لے کر آپ کا گھر گھیر لیا، ان کا ارادہ آپ کو قتل کرنے کا تھا۔ آپ کے حکم سے حضرت علی علیہ السلام آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ صبح کو سب کی امانتیں واپس کر کے آنا۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا ہے۔ ان کے لفظوں میں ان کی تحریر کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ:

"یہ سخت خطرے کا موقع تھا جناب امیر کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے

---

[1] اسلامیات، صفحہ ۵۹، از:، مالک رام، مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ستمبر ۱۹۸۴ء

قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے
لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ فرش گل تھا۔''[1]

ادھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم چار اصحاب کے ساتھ مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے، مقام قبا میں حضرت علی علیہ السلام آپ سے آکر مل گئے، قبا میں آپ نے مسجد کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد مدینہ روانہ ہو گئے، مدینہ میں بھی پہلا کام آپ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا کیا۔ اہل مدینہ کے حالات سدھرنے شروع ہو گئے اور اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ اور بحوالہ تاریخ اسلام یہ تحریر پیش ہے کہ

''اس دانائی اور سادگی کے اصول سے اس سلطنت کی بنیاد پڑی جو قلیل مدت میں بہت عظیم الشان طاقت حاصل کرنے والی اور دنیا کی زبردست سلطنتوں کو ہلا دینے والی تھی۔''[2]

---

[1] سیرۃ النبی، صفحہ ۱۹۷، از: مولانا شبلی نعمانی

[2] تاریخ اسلام، جلد دوم، صفحہ ۴۷

اسلام اور اس کی مخالف قوتیں

اسلامی لشکر سے مقابلہ رسول خدا صلعم کی زندگی میں

جنگ بدر: قریش یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان کہیں بھی چین سے بیٹھیں آخر کار ان لوگوں نے بڑی فوج لے کر مدینہ پر چڑھائی کر دی مسلمانوں کی تعداد ہی کتنی تھی آپ کے ساتھ صرف ۳۱۳ رلوگ تھے لیکن آپ مقابلہ کے لئے نکل پڑے۔ بدر کی پہاڑی پر دونوں کا مقابلہ ہوا اور نہ سواری کا ہی کہیں انتظام تھا نہ ہتھیار ہی کہیں تھے۔ لیکن یہ لوگ مطمئن تھے۔ اللہ نے مسلمانوں کی مدد کی چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد قریش کو پوری شکست ہوئی۔ اس جنگ میں ان کے بڑے بڑے سردار کام آئے، ابو جہل مارا گیا، جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اور ستر (۷۰) آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ مولوی عبد السلام صاحب قدوائی فرماتے ہیں کہ

> ”یہ لوگ حضرت کے بڑے دشمن تھے مکہ میں انہوں نے آپ کو بہت ستایا تھا اور مسلمانوں پر بڑے ظلم کئے تھے کوئی اور ہوتا تو اس وقت ان سے اچھی طرح دل کھول کر بدلہ لیتا لیکن حضور تو بڑے ہی رحم دل اور نیک تھے آپ نے ان کو

معمولی تکلیف تک نہ پہنچائی اور مسلمانوں کو تاکید کردی کہ خبردار کسی قیدی کو تکلیف نہ ہونے پائے جن کے پاس کپڑے نہ تھے ان کو کپڑے پہنائے صحابہ خود کھجوریں کھا کر گذارا کرتے تھے مگر قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے اسی طرح کچھ دن آرام سے رکھنے کے بعد پھر معاوضہ لے کر سب کو چھوڑ دیا۔'' [1]

اس جنگ کے متعلق شیخ نواب احمد حسین نے تحریر کیا ہے:

''مورخ اب الوروی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ ماہ رمضان سنہ ۲ ہجری میں بدر کی لڑائی واقع ہوئی جس سے اللہ تعالیٰ نے دین کو قوت دی''۔ [2]

اس جنگ میں مسلمان فاتح ہوئے اور کفار کی شکست ہوئی اور ابو جہل قتل کیا گیا ''پھر غزوہ بنی قینقاع کا واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کو کافی غنیمت حاصل ہوئی اس کے بعد سویق اور قرقرہ کدر کے غزوات ہوئے اور اسی سنہ ۲ ہجری میں جناب فاطمہؑ بنت رسولؐ اللہ کا عقد نکاح حضرت علی علیہ السلام سے ہوا''۔ [3]

جنگ احد سنہ ۳ ہجری

ہجرت کے تیسرے سال نہایت اہم جنگ ہوئی جسے جنگ احد کہتے ہیں۔ بدر میں جن جن کے اعزہ واقربا مارے گئے تھے وہ سب مدینہ والوں سے انتقام لینے کے لئے بڑی تعداد میں فوج لے کر اور بڑی تیاریوں سے مدینہ والوں سے بدلہ لینے کے جنگ کرنا چاہتے

۱۔ ہماری بادشاہی، صفحہ ۱۰، از: مولوی عبدالسلام قدوائی، ناظم دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ۔

۲۔ تاریخ احمدی نواب احمد حسین، صفحہ ۳۴، ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۴۶ء حیدری کتب خانہ، 3A مرزا علی اسٹریٹ، امام باڑہ روڈ، بمبئی-۹

۳۔ تاریخ احمدی نواب احمد حسین پریانواں، صفحہ ۳۶

تھے سب سے بڑے سردار مارے گئے تو ابوسفیان ہی وہاں ان سب کا سردار بچا تھا اور اس کی بیوی ہندہ جس کے اعزہ اس جنگ میں مارے گئے تھے وہ بھی بہت زیادہ اکسار ہی تھی کہ بدلہ لیا جائے۔ بہر حال تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوا اور احد کے پاس آ کر خیمے لگا دیئے گئے۔

مکہ کی عورتوں نے بھی اس جنگ میں خوب حصہ لیا وہ دف بجاتی ہوئی اور کشتگان بدر کو روتی ہوئی جاتی تھیں، اس جنگ کے متعلق پروفیسر جی ایس دارا صاحب کا حوالہ دیکھئے:

> ''مکہ کی عورتوں نے اس لڑائی میں بہت حصہ لیا وہ جنگ بدر کے مقتولوں پر مرثیہ پڑھتیں تھیں اور لڑائی سے منھ موڑنے والوں پر تبرا بولتی تھیں۔ سردار ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی شریک تھی۔ ہندہ بڑی کینہ جو عورت تھی۔''[۱]

بہر حال اس جنگ میں قریش کے تین ہزار آدمی جمع ہوئے جن میں سات سو زرہ پوش سپاہی اور دو سو سوار تھے۔ اس جنگ کے متعلق مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے لکھا ہے کہ

> ''جنگ بدر کے بعد ایک طرف تو خود اہل مکہ کے دلوں میں آتش فشاں موجزن تھی دوسری طرف مدینے کے یہودیوں اور منافقوں نے ان کو برانگیختہ کرنے میں کوتاہی نہیں کی، تیسری طرف ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جس کے باپ اور بھائی بدر میں قتل ہوئے تھے ابوسفیان کو غیرتیں دلائیں چنانچہ ابوسفیان جو تمام سرداران مکہ کے مقتول ہونے کے بعد مکہ میں سب سے بڑا سردار سمجھا جاتا تھا جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوا۔''[۲]

۱۔ رسول عربی، ص ۱۰۶، پروفیسر جی ایس دارا صاحب، ۱۹۷۹ء، ساجو بک ڈپو آفریدیان رام پور

۲۔ تاریخ اسلام، صفحہ ۱۵۸، حصہ اول، ۱۹۸۶ء، مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، تاج کمپنی ترکمان گیٹ، دہلی۔

ادھر لشکر کفار نے چوتھی شوال روز چہارشنبہ کو یہ لشکر ذوالحلیفہ میں پہنچ کر مقیم ہوا جو مدینہ کے روبرو واقع ہے، ادھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صاحب بھی ایک ہزار انصار وصحابہ کے ساتھ باہر نکلے اور درمیان مدینہ واحد صف آرا ہوئے ان جنگوں میں تمام اصحاب وانصار تھے جنگ کے درمیان ابوسفیان نے چال چلی مسلمانوں کو دھوکہ ہوا کہ کفار بھاگ گئے بس کیا تھا مسلمان صفیں توڑ کر مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے یہاں تک کہ درے کے تیرانداز بھی جگہ چھوڑ کر مال لوٹنے لگے بس کیا تھا دونوں طرف سے گھیر کر ابوسفیان اور خالد بن ولید نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا لیکن مسلمان آخر دم تک جنگ کرتے رہے کفار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینا چاہتے تھے لیکن انصار نے آپ کو گھیرے میں لے لیا اس جنگ میں لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، لیکن جلد ہی سب کو خبر مل گئی کہ آپ صحیح سلامت ہیں نواب احمد حسین صاحب پریانواں نے تحریر فرمایا ہے کہ

"راوی کا بیان ہے کہ کفار کے سب نشان برداروں کو حضرت علی علیہ السلام نے قتل کیا تھا اور جب کفار کے نشان بردار مقتول ہو کر فی النار ہو چکے تو پیغمبر صاحب نے مشرکین کی ایک جماعت کو دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا ان پر حملہ کرو۔ علی علیہ السلام نے حملہ کر کے ان میں سے بعض کو قتل کیا اور بعض کو منتشر کیا۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور گروہ کو دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام کو ان پر حملے کا حکم دیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے ان میں سے بھی اکثر کو قتل کیا اور بعضوں کو متفرق کر دیا یہ حال مشاہدہ کر کے جبرئیل امین علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ دیکھئے ہمدردی یہ ہے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیوں نہ ہو علی علیہ السلام مجھ سے ہے اور میں علی علیہ السلام سے ہوں۔ جبرئیل امین نے کہا کہ

اور میں تم دونوں سے ہوں۔ ناگاہ لوگوں نے یہ آوازِ غیب سنی کہ 'لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار'' [1]

اسی جنگ میں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے اور آخر میں آئندہ سال پھر مقابلہ ہوگا یہ کہہ کر ابوسفیان قریش کے ہمراہ واپس لوٹ گیا، لیکن یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور قریش پھر تیاریوں میں لگ گئے تاکہ پورے زور و شور سے حملہ کر کے مسلمانوں کو زیر کر سکیں۔

جنگ احزاب : اس کے بعد سنہ ۵ ہجری میں قریش و کفار نے تمام مخالف قوتوں کو جمع کر کے اجتماعی طاقت سے دس ہزار کا لشکر لے کر حملہ کیا اسے جنگ احزاب کہتے ہیں۔ اس میں مسلمان صرف ۳۰ رہزار تھے لیکن اس مرتبہ بھی مخالف فوجوں کو شکست حاصل ہوئی اور صلح نامہ شرائط کے ساتھ صلح بھی ہوگئی لیکن قریش زیادہ دنوں تک اپنی شرائط پر قائم نہیں رہ سکے، اس لئے ایک مرتبہ پھر جنگ کی تیاری ہوئی۔

جنگ خیبر : سید علی حیدر صاحب کے مطابق

''صفر سنہ ۷ ہجری ۶۲۸ء میں مشہور خیبر کی جنگ ہوئی، سنا گیا کہ خیبر کے یہودیوں نے جو مدینہ اور اس کے نواح سے جلاوطن ہوئے تھے مسلمانوں سے جنگ کی بڑی تیاری کی ہے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر سولہ سو آدمیوں کے ساتھ چلے مگر جب مسلمان خیبر میں پہنچے تو وہاں کے یہودی اپنے قلعوں میں پناہ گزیں ہوگئے وہاں کا بے پناہ بہادر پہلوان مرحب تھا اس کے مقابلے کے لئے جو لوگ گئے وہ بھاگ کر واپس آگئے۔ آخر کار پھر حضرت علی علیہ السلام کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور حضرت علی علیہ السلام نے آشوب چشم کے باوجود مرحب کو قتل کیا، اور خیبر کو

---

[1] تاریخ احمدی، صفحہ ۱۴۱، نواب احمد حسین پریانواں

فتح کیا آپ نے جنگ کے دوران خیبر کا ایک در اکھاڑ لیا اپنے بچاؤ کے لئے وہ در روایت کے مطابق ۸؍آدمی بھی پلٹ نہیں سکتے تھے۔[۱]

اس جنگ کے متعلق تاریخ اسلام میں ہے کہ

''خیبر کے علاقہ میں یہودیوں کے پاس ایک دوسرے کے قریب چھ زبردست قلعے تھے یہودیوں نے اسلامی لشکر کے پہنچنے پر میدان میں نکل کر مبارزطلبی کی ان میں مرحب اور یامردو بہت بڑے بہادر اور پیل تن جنگ جو تھے۔''[۲]

اور حضرت علی علیہ السلام نے مرحب کو قتل کیا اور در خیبر کو فتح کیا اسی سال سنہ ۶ ہجری میں ماہ ربیع الاول میں غزوہ ذی قرد بھی ہوا اس کے بعد غزوہ بنی مصطلق کا واقعہ پیش آیا اور اسی سال ماہ ذیقعدہ میں غزوہ حدیبیہ واقع ہوا۔

جنگ خندق: تقریباً ۲۴؍ہزار کی فوج نے مدینہ پر چڑھائی کی اتنی بڑی فوج مسلمانوں کے مقابلہ کو کبھی نہیں آئی تھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت سلمان فارسی نے رائے دی کہ مدینہ کے چاروں طرف ایک خندق کھود دی جائے کفار آئے تو انہیں مقابلے میں بڑی دشواری ہوئی مجبور ہو کر چاروں طرف سے گھیر لیا، یہ وقت مسلمانوں کے لئے بڑی پریشانی کا تھا، کئی کئی دن کھانے کو نہیں ملتا تھا منافق ساتھ چھوڑ گئے۔ خندق پار سے دشمن تیر اور پتھر برسا رہے تھے۔ ایک مہینہ تک محاصرہ قائم رہا۔ مسلمان اللہ کا نام لے کر ہمت سے کام لیتے تھے آخر کار دشمنوں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور ایسی آندھی

۱۔ تاریخ آئمہ، صفحہ ۹۴، از: سید حیدر، طبری جلد سوم

۲۔ تاریخ اسلام، حصہ اول، صفحہ ۱۹۴۔ از: مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، ۱۹۸۶ء، مطبوعہ: تاج کمپنی، ترکمان گیٹ، دہلی

آئی کہ ان کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ لوٹ گئے۔

صلح حدیبیہ: حدیبیہ دشمن کے حملے کے وقت دفاع کے لئے موزوں جگہ تھی۔ حدیبیہ مکہ معظمہ سے صرف دس بارہ میل دور ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تصادم کرنا نہیں تھا پھر آپ کو حرمت کے مہینے کا پاس بھی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قریش کو مذاکرات پر رضامند کرلیا۔ فوری جنگ کا خطرہ ٹل گیا، اور بساط سیاست پر قریش مات کھا گئے۔ یہ ان کی شکست کا پیش خیمہ تھا۔ پروفیسر جی ایس دارا کے مطابق:

> مکہ زیارت کے لئے آنا مسلمانوں کا ایک ایسا پیدائشی حق تھا جیسا کہ اور قوموں اور قبیلوں کا تھا مگر مشرکان مکہ غایت درجہ کے تندخو آدمی تھے۔ ہر وقت حجت پر تلے رہتے تھے اور کوئی نہ کوئی بات سامنے رکھ کر فتنے وفساد پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بڑا غنیمت سمجھا کہ بغیر لڑائی وخونریزی کے مسلمانوں کو کعبہ کا منہ دیکھنا پھر نصیب ہوا۔[1]

صلح حدیبیہ کے بعد خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا ایمان لانا اس سال کا قابل ذکر واقعہ ہے۔ یہ دونوں دنیا کے عظیم ترین سپہ سالار اور فاتحین میں سے تھے۔ اس کے بعد جب کچھ اطمینان میسر ہوا تو آپ نے آس پاس کے بادشاہوں کے پاس دعوت اسلام کے خطوط بھیجے ان میں سے قیصر روم، نجاشی بادشاہ حبشہ، خسرو پرویز، شہنشاہ ایران، عزیز مصر، روسائے یمامہ۔ ان میں نجاشی نے اسلام قبول کرلیا۔ خسرو پرویز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ چاک کر ڈالا۔ مقوقس نے بہت سے تحائف اور کنیز ماریہ قبطیہ آپ کی خدمت میں ارسال کی اور حارث نے آپ کا نامہ پھینک دیا۔ اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا اسی دوران میں غزوہ موتہ کا واقعہ ہوا۔ اصل موتہ شام کے علاقہ میں واقع ہے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] رسول عربیؐ، صفحہ: ۱۱۸، از: پروفیسر جی ایس دارا، ۱۹۷۹ء، ساجو بک ڈپو آفریدن رام پور۔

بصری کے حاکم کو دعوت اسلام دی۔ سرحد پر بلقا کا علاقہ تھا۔ جس کا حاکم شرحبیل بن عمرو تھا۔ شرحبیل نے حضرت حارث بن عمیر ازدی جو کہ قاصد تھے کا قتل کر دیا اور مسلمانوں پر حملے کی تیاری میں لگ گیا۔

غزوہ موتہ : اسے مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو قیصر روم سے مدد حاصل کی۔ لاکھوں کا لشکر جمع ہو گیا۔ لیکن وہ لوگ حملہ کرنے کی پہل نہ کر پا رہے تھے، چنانچہ شام کی سرحد کے نزدیک موتہ کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی اس لئے فتح تو نہ ہو سکی لیکن جنگ احد کی طرح ہی فوائد پہنچے اور شرحبیل اور ہرقل کو ناکامی ہوئی۔

تاریخ اسلام میں ہے کہ

> ''ایک گاؤں مشارف نامی کے قریب دشمن کی جمعیۃ کثیر مقابل نظر آئی مگر مسلمانوں نے وہاں مقابلہ مناسب نہ سمجھا وہاں سے کترا کر مقام موتہ کی طرف بڑھے تاکہ جنگ کے لئے اچھا میدان ہاتھ آئے۔[1]

فتح مکہ: بہر حال جنگ میں مسلمان نہ تو فاتح ہوئے اور نہ ہی ہارے۔ بہر کیف اس کے بعد مسلمانوں کے سامنے ایک عظیم مقصد اور تھا اور وہ تھا یہود کے بعد تحریک اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش تھے۔ اس لئے مکہ کی فتح بے حد ضروری تھی اب وقت آ گیا تھا کہ مکہ کی سمت رخ کیا جائے۔

مولوی عبد السلام قدوائی لکھتے ہیں:

> ''قریش نے معاہدہ توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ پر چڑھائی کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔''[2]

---

[1] تاریخ اسلام، صفحہ ۲۰۲، از: مولانا اکبر شاہ خاں، نجیب آبادی۔

[2] ہماری بادشاہی، صفحہ ۱۷، مولوی عبد السلام قدوائی۔

اور ڈاکٹر نصیر احمد تحریر کرتے ہیں:

۱۰ ررمضان ۸ ہجری کو آپ نے دس ہزار مجاہدین کے ساتھ مکہ کی طرف پیش قدمی کی لیکن عام شاہراہ اختیار کرنے کے بجائے مکہ معظمہ سے ایک منزل دور مرالظہر ان کے مقام پر آپ نے چھاونی ڈال دی اور فوجوں کو اس نہج سے دور دور پھیلا دیا کہ قریش ان کی تعداد کو اصل سے زیادہ سمجھ کر مرعوب و خوفزدہ ہو جائیں اور ہمت ہار کر بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دیں۔"[1]

اور نواب احمد حسین پریانواں فرماتے ہیں:

"تاریخ ابن الوردی میں ہے کہ بیس رمضان روز جمعہ کو مکہ فتح ہوا۔"[2]

ابوسفیان نے اپنی رضا یا جان کے خوف سے اسلام کی صداقت کا اقرار کرلیا اس کے بعد جوق در جوق لوگ مسلمان ہونے لگے اور مکہ پر اسلام کا تسلط ہو گیا فتح مکہ کے بعد حنین کی وادی میں جنگ حنین ہوئی اور اس میں بھی وہی صورت حال پیش آئی جو کہ جنگ احد میں آئی تھی یعنی مسلمانوں نے مشرکین کو پیچھے کھدیڑ دیا اور ڈھیرے ڈھیرے تیروں کی زد پر آگئے، اور آفت یہ کہ مال غنیمت کی طرف ان کا دھیان چلا گیا۔ ادھر تیراندازوں نے تیروں کی بارش شروع کردی صفیں درہم برہم ہو گئیں لیکن اس صورت حال میں بھی آپ کی جرأت اور ثابت قدمی اور حضرت علیؓ نے صورت حال کو سنبھال لیا آخر کار نئے جوش نئی تنظیم اور نئے ولولے سے پھر حملہ کیا گیا۔ اس مرتبہ کفار اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ان کو شکست ہوگئی اور وہ جنگی قیدی بنائے گئے اس کے بعد جب مسلمان میدان چھوڑ کر بھاگے تھے۔ نواب احمد حسین صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] پیغمبر اعظم و آخر، صفحہ ۵۹۳، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ۱۹۸۴، تاج کمپنی ۳۱۵۱ ترکمان گیٹ، دہلی

[2] تاریخ احمدی، صفحہ ۶۸

''ولی اللہ صاحب دہلوی ازالۃ الخفا میں لکھتے ہیں کہ جب بروز غزوہ حنین مسلمان پسپا ہو کر بھاگے تو حضرت علیؓ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو معرکہ جنگ میں ثابت قدم رہے۔[1]

اس کے بعد رومیوں نے جنگی منصوبہ بندی کی اور آپ کے جاسوسوں نے آپ کو اس کی اطلاع دی تو فوراً جوابی کارروائی کی تیاری شروع ہوگئی۔ رومیوں سے جنگ کے لئے آپ نے تیس ہزار مجاہدین کا لشکر تیار کرلیا جس میں صرف دس ہزار سوار تھے۔ عرب میں قحط پڑا تھا اس کے باوجود مسلمانوں کے لشکر نے پیش قدمی کی اور تبوک کے مقام پر چھاونی ڈالی بیس دن تک دشمنوں کا انتظار کیا لیکن وہ لوگ مقابلے کی ہمت نہ کرسکے، مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی فتح تھی، اب اسلام عرب سے نکل کر دنیا میں پھیل چکا تھا اور اس سلسلے میں عبداللہ عنان بیرسٹر (قاہرہ) کے خیالات دیکھئے:

عربوں کا وادی مکہ سے نکل کر عرصہ جنگ میں کود پڑنا اور ان کا قلیل تعداد اور ناکافی جنگی سازوسامان کے باوجود تاریخ عالم کی وہ بڑی سلطنتوں کو پاش پاش کرنے پر اقدام کرنا یقیناً نہایت حیرت انگیز، دہشت خیز اور قابل غور ہے ہمارے اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں کہ عربوں نے اسلام کے ظہور قدسی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایران کی سلطنت کے تختے الٹ دیئے جو بڑے تمدن کی مالک تھے جس کے پاس بے شمار جنگی سازوسامان اور بے پناہ فوجیں تھیں۔[2]

۱۔ تاریخ احمدی، صفحہ ۳۷

۲۔ تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات، عبداللہ عنان بیرسٹر قاہرہ، مترجم محمد عبدالوہاب، جلد اول، جولائی ۱۹۷۱ء، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، اردو بازار، دہلی-۶

اب سارے عرب میں اسلام پھیل چکا تھا آپ نے آخری حج کا ارادہ کیا اعلان کیا گیا کہ اس سال آپ خود حج کی قیادت فرمائیں گے تمام مسلمان آپ کے ساتھ حج کی شرکت کی سعادت حاصل کرنے کیلئے ہو گئے۔ بہر حال مکہ پہنچ کر آپ نے حج ادا فرمایا عرفات کے مقام پر آخری خطبہ دیا۔ جو نسل انسانی کے لئے مشعل راہ ہے۔ اس کے بعد حجۃ الوداع کے تقریباً ایک ماہ بعد ماہ صفر سنہ ۱۱ ہجری میں پہلی بار آپ کو دردسر کی معمولی سی شکایت ہوئی یہ وصال کی عملی تیاری کی ابتدا تھی۔

تاریخ اسلام میں ہے کہ:

دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ ہجری کو اس دار فانی سے آپ نے انتقال فرمایا''[۱]

اور نواب احمد حسین پر یانواں کے مطابق:

طبقات ابن سعد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بروز دوشنبہ دوسری ربیع الاول سنہ ۱۱ ہجری کو ہوئی۔[۲]

بہر حال یہ شمس اسلام دنیا کو پُر نور کرنے کے بعد خود پردہ پوش ہو گیا۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد

فتح مکہ کے بعد سنہ ۹ ہجری سے قبائل عرب کے وفور کثرت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے لگے اور عرب گروہ در گروہ مسلمان ہونے لگے، اور حضرت کی وفات سے پہلے تقریباً پورا عرب مسلمان ہو گیا۔

۲۸ صفر المظفر یا ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ ہجری کو حضرت نے وفات پائی۔[۳]

۱۔ تاریخ اسلام، صفحہ ۲۳۱، اکبر خاں نجیب آبادی۔

۲۔ تاریخ احمدی، صفحہ ۱۰۴

۳۔ تاریخ احمدی، نواب پر یانواں

سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب طاب ثراہ کے مطابق:

یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی ورثہ دار جوان کے اہل بیت تھے، اسلامی انقلاب اور اس کے خصوصیات وامتیازات کے محافظ تھے۔[1]

لیکن لوگ عیش وعشرت میں بسر کرنے لگے محلوں میں رہنے لگے، ریشمی لباس پہننے لگے جب کہ اہلبیت وہی اپنے چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے اور محنت سے روزی کماتے تھے، اور حلال مال پر زندگی بسر کرتے تھے جو دولت ملتی وہ غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اس لئے دوسرے لوگوں سے اہل بیت سے کشمکش ہونا لازمی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ کا تصادم اسی کشمکش کا نتیجہ تھا اہل بیت کے طرف دار تعداد میں کم تھے چونکہ دولت وطاقت معاویہ کے پاس تھی اور عرب ہمیشہ سے حریص اور لالچی تھے، دوسری بات بنی ہاشم کے قدیمی روایات اور سیاست اور شرافت کے امتیاز کی وجہ سے عرب خاندانوں کو ان سے پہلے ہی حسد اور عناد تھا اسی لئے نسلی تعصب بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے ان تمام باتوں کے علاوہ سب سے اہم کردار باغ فدک کا تھا جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ صلوۃ اللہ علیہا کو جہیز میں دیا تھا لیکن اس کی آمدنی سے اہل عرب کو نفقہ ملتا تھا۔ خلیفۂ وقت نے باغ فدک حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کو دینے سے انکار کر دیا اس وجہ سے حضرت فاطمہ کو بہت صدمہ ہوا، ویسے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت فاطمہ کو کسی نے خنداں نہیں دیکھا اور چھ مہینے بعد ہی ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ حضرت فاطمہ کی رحلت سے قبل تک حضرت علیؑ کی وجاہت بدستور قائم رہی لیکن بعد وفات فاطمہ علیؑ کی جانب سے لوگوں کے رخ پھر گئے۔ تاریخ احمدی میں ہے کہ

---

[1] شہید انسانیت، صفحہ ۱۰۳، سید العلماء مولانا سید علی نقوی صاحب

حضرت فاطمہ کی وفات تک کسی ایک بنی ہاشم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔[۱]

حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد سب سے بیعت لی۔ اور اہل بیعت کے حالات خراب ہوتے چلے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے امتیازی پہلو

جناب عبدالمطلب تک حضرت علی علیہ السلام کا نسب وہی ہے جو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ جناب عبدالمطلب کے دو بیٹے جناب عبداللہ اور جناب ابوطالب تھے۔ جناب عبداللہ کے صاحبزادے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب ابوطالب کے فرزند حضرت علی علیہ السلام تھے آپ کی مادر گرامی جناب فاطمہؑ بنت اسد تھیں۔ سید علی حیدر صاحب فرماتے ہیں کہ

"سنہ ۳۰/عام الفیل (غالباً ۵۹۸ء یا ۶۰۰ء) میں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔ ۱۳/رجب کو جمعہ کے دن حضرت کی ولادت باسعادت ہوئی حضرت کے والد والدہ نے کبھی بت پرستی نہیں کی اور حضرت نے کبھی بت کو نہیں مانا۔[۲]

حضرت علی علیہ السلام کی ایک مخصوص فضیلت یہ بھی ہے کہ ان کی پیدائش خانہ کعبہ میں ہوئی۔

بحوالہ تاریخ آئمہ مروج الذہب، جلد ۵، ۱۹۷۵ء ازالۃ الخفا، مقصد، ۲،

۱۔ تاریخ احمدی، صفحہ ، احمد نواب پریانواں

۲۔ تاریخ آئمہ، سید علی حیدر، صفحہ ۱۸۰۰، تاریخ آئمہ، سید علی حیدر، صفحہ ۱۷۵، تاریخ کامل، علامہ ابن اثیر جذری، جلد ۳، صفحہ ۱۵۸

ص ۲۵۱، ومطالب السوول، ص ۳۷، وغیرہ

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی حضرت علی علیہ السلام کا نام رکھا اور اپنے لعاب دہن سے بہت دنوں تک غذا دیتے رہے۔ اس طرح حضرت علی علیہ السلام کی پرورش بھی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور سب سے قبل حضرت علی علیہ السلام بچوں میں آپ کے پیرو ہوئے اور آپ پر ایمان ظاہر کیا اور آپ کی تصدیق کی۔

سبقتکم الی الاسلام طراً ☆ علاماً بلغت او ان حلمی

بحوالہ تاریخ کامل جلد ۳، صفحہ ۱۵۸، واستیعاب، جلد ۲، ص ۴۸۲، ابوالفداء جلد ۱، ص ۱۱۶، وکنز العمال، جلد ۶، ص ۳۹۲، بحوالہ تاریخ کامل علامہ ابن اثیر جذری لکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کا رنگ گندمی تھا، آنکھیں بڑی اور کشادہ تھیں ہونٹوں پر مسکراہٹ سی تھی۔ (ترجمہ اسد الغابہ، جل ۷، ص ۵۲)

ہنس مکھ اور خوبصورت تھے سینہ پر بال بہت تھے ہاتھ پاؤں کے پٹھے مضبوط تھے مثل شیر کے سینہ تھا۔ اسلام کو ایک حامی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ناصر کی ضرورت ہوئی تو آپ تن تنہا نصرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر آمادہ ہوگئے، شب ہجرت آپ نے جاں نثاری کی مثال پیش کی جسے پیش کرنے میں دنیا کی تاریخ عاجز ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ صحابہ میں مواخاۃ کرائی اور دونوں مرتبہ اپنے کو حضرت علی علیہ السلام کا اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بھائی قرار دیا۔ جناب سیدہ سے حکم خدا کے مطابق آپ کا عقد کیا، زہد و سادگی زندگی بھر آپ کے ساتھ رہی۔ جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر جنگ میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور تقریباً ہر جنگ آپ کی شجاعت کی وجہ سے فتح ہوئی ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کسب کر کے رزق کمانے کی کوشش کرتے تھے حضرت اپنے ہاتھ سے باغ سینچا کرتے تھے۔ غریب ومسکین ویتیم کی مدد کیا کرتے تھے۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ ان کے غسل و کفن میں مشغول رہے اور وہاں خلیفہ کے اختیارات لوگوں نے ہاتھ میں لے لئے۔

جب کہ روایت کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں آپ کو اپنا وصی مقرر کر دیا تھا۔ بحوالہ تاریخ احمدی اور بحوالہ تاریخ آئمہ ص ۱۴۱، ۱۴ ارذی الحجہ کو مکہ سے مدینہ چلے مقام خم میں تالاب غدیر تھا وہاں پر خطبہ فرمایا:

''میں تمہارے درمیان دو امر عظیم چھوڑے جاتا ہوں، ایک قرآن دوسرے میرے اہل بیت اگر تم ان دونوں کی پیروی کرتے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔[1]

حضرت علی علیہ السلام نے ہمیشہ صبر سے کام لیا اور فتنہ وفساد کو پسند نہ کیا اور خلافت کے لئے کوشش بھی نہ کی اپنے حقوق کی پامالی کے باوجود ۲۵ سال تک بالکل خاموش رہے اور اس کے بعد لوگوں کے بے حد اصرار پر آپ نے خلافت قبول کی اور اس کے بعد بنی امیہ آپ سے برسرپیکار ہو گئے اور آخر کار آپ کو شہید کر دیا گیا۔

اصول اسلام کی پابندی آپ بہت سختی سے کرتے تھے، اور اپنے ہر قول و فعل میں نہایت شریف اور پابند تھے آپ کا کل اعتماد سچائی اور حق پر تھا۔ مسٹر کارلائل نے حضرت علی علیہ السلام کے متعلق کہا ہے: بحوالہ کتاب ہیروز ورشپ لکچر دوم

یہ نوجوان علیؑ ایسا شخص تھا کہ ضرور ہے ہر شخص اس کو پسند کرے وہ ایک صاحب اخلاق فاضل اور محبت سے بھرپور اور ایسا بہادر شخص تھا جس کی آگ جیسی تیز وتند جرأت کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ اس شخص کی طبیعت میں عجب طور کی جوان مردی تھی شیر سا تو بہادر تھا مگر باوجود اس کے مزاج میں

---

[1] تاریخ احمدی، نواب پریانواں، صفحہ ۱۴۱۔

ایسی نرمی، رحم دلی، سچائی اور محبت تھی کہ ایک ایسا ہی جواں مرد کے شایان ہونی چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام کے متعلق مسٹر اوکلی نے بحوالہ تاریخ عرب کے صفحہ ۳۳۲ راور صفحہ ۳۳۶ پر لکھا ہے کہ

تمام مسلمانوں میں بالاتفاق علی علیہ السلام کی عقل و دانائی کی شہرت ہے، آپ کے صد کلمات ابھی تک محفوظ ہیں جن کا عربی، ترکی، فارسی میں ترجمہ ہوگیا ہے، آپ کے اشعار کا دیوان بھی ہے، جس کا نام ''انوار الاقوال'' ہے، اور بوڈلین لائبریری میں آپ کے اقوال کی ایک بڑی کتاب موجود ہے جس کا نمونہ اس تاریخ میں شامل ہے لیکن آپ کی مشہور ترین تصنیف ''جفر و جامعہ'' ہے جو ایک وصلی پر ایک بعید الفہم خط میں جس کے ساتھ اعداد و ہندسے بھی شامل ہیں لکھی ہوئی ہے، یہ ہندسے ان تمام عظیم الشان واقعات کو جو ابتدائے اسلام سے رہتی دنیا تک ہونے والے ہیں بتلاتے ہیں یا ان پر دلالت کرتے ہیں یہ وصلی جو آپ کے خاندان میں بطور امانت رہا کی ہے اس وقت پڑھی نہیں جاسکتی ہے البتہ امام جعفر صادق علیہ السلام اس کے کچھ حصوں کی تشریح کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن ان کے مطالب کا مکمل حل بارہویں امام کے لئے مخصوص ہے جن کا لقب آپ کے فضل و کمال کے باعث مہدی ہے علاوہ ان کتابوں کے متعدد مصنفین کی کتابوں میں ہمکو بہت جملے اور کلمات حکمت علی کے نام سے ملتے ہیں۔[1]

جب آپ کو خلافت ملی تو آپ نے پہلے خطبے میں حکم دیا کہ بیت المال کا دروازہ کھول

---

[1] تاریخ، اوکلی، صفحہ ۲۸۶، ۲۸۷

دو اور کل مال لوگوں میں تقسیم کر دو جنگ جمل جو حضرت عائشہ کی وجہ سے ہوئی جنگ نہروان جو خارجیوں سے ہوئی سب میں آپ کی فتح ہوئی۔

(بحوالہ تاریخ عرب از تاریخ گلمن، ص ۲۸۶، ۲۸۷) مورخ گلمن نے لکھا ہے کہ

''حضرت علی علیہ السلام اس لحاظ سے بھی قابل احترام ہیں کہ آپ ہی وہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے علم وفن کی کتابت کی پرورش کی اور حکمت سے مملو اقوال کا ایک بڑا مجموعہ آپ کے نام سے منسوب ہے، آپ کی زندگی حسرت و آلام وشکست سے مملو تھی آپ نرم دل متحمل مزاج دنیاوی لذت و عافیت سے بے پروا اور بے فکر تھے مخالفت اور انتقام کو طرح کے عادی تھے صلاح ومشورہ میں آپ کی دانائی اور آپ کی مسلم اور مشہور فراست بہت ہی اعلیٰ پایہ کی تھی [1]

مشاہدہ بتاتا ہے کہ حضرت علیؑ ہی وہ بچہ تھے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور انہوں نے سب سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور انہوں نے قرآن کو جمع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ اور حضرت علی علیہ السلام ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم نحو کو وضع فرمایا، ویسے کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہ سب سے پہلے اسلام پر ایمان لائیں۔

خلافت اختیار کرنے کے بعد سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام کو حضرت عائشہ سے جنگ جمل کرنا پڑی چونکہ خود حضرت عائشہ نے فوج کشی کی تھی۔

اور بحوالہ تاریخ احمدی، اور تاریخ احمد اور تاریخ مروج الذہب میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی روانگی کوفہ سے صفین کی طرف ۲۵ رشوال ۳۶ ہجری

---

[1] تاریخ عرب، ص ۲۸۶، ۲۸۷

کو ہوئی ہے۔[1]

اور تاریخ ابوالفداء میں ہے کہ پھر ۳۷ ہجری شروع ہوئی اور ایک ماہ تک دونوں لشکروں میں قتال کی نوبت نہ آئی۔ ماہ صفر کے شروع ہونے پر دونوں لشکروں میں کثرت سے لڑائیاں واقع ہوئیں، آخر جب شکست قریب دیکھی تو شام کے لشکر نے نیزوں پر قرآن بلند کئے اور اس طرح جنگ ختم ہوئی لیکن اقرار نامے کے مطابق حضرت علی علیہ السلام اور ان کے گروہ کے لوگوں نے ابوموسیٰ اشعری کو اپنا حکم اور معاویہ کے گروہ نے عمرو بن عاص کو اپنا حکم ہونا منظور کیا۔

عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ اشعری کو جب معاویہ کے حق میں نہ دیکھا تو کہا کہ ان دونوں کو ہی علیحدہ کر کے کسی تیسرے کو خلیفہ مقرر کریں، ابوموسیٰ اشعری اس پر متفق ہو گئے لیکن جب سب کے سامنے ابوموسیٰ اشعری نے کہا کہ میں حضرت علیؑ کو معزول کرتا ہوں اور معاویہ کو بھی معزول کرتا ہوں تو عمرو بن عاص نے کہا کہ میں حضرت علی علیہ السلام کو معزول کرتا ہوں اور معاویہ کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں۔ اس طرح عمرو بن عاص نے عیاری سے مع اہل شام معاویہ کے پاس جا کر امر خلافت کا مژدہ پیش کیا۔ اسی وقت سے حضرت علی علیہ السلام کے امر میں ضعف اور معاویہ کے امر میں قوت پیدا ہوگئی اور اس کے بعد سے معاویہ نے برابر یہ کوشش جاری رکھی کبھی مدینہ پر چڑھائی کی کبھی حجاز کی جانب لشکر بھیجا کبھی مصر فتح کیا اور دھیرے دھیرے اپنی خلافت کے لئے مضبوط فضا تیار کر لی۔ آخر کار ماہ رمضان المبارک میں عبدالرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔

حضرت علی مرتضٰی علیہ السلام کی قبر مطہر نجف اشرف (عراق) میں ہے۔

---

[1] تاریخ احمدی، نواب پریانواں

حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ کی تربیت اوران کی شخصیت میں اسلام اور انسانیت کے تحفظ کا رجحان

پارۂ جگر علی مرتضیٰ علیہ السلام اور سیدہ عالیہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے لعل حضرت امام حسینؑ مسلمانوں کے تیسرے امام ہیں۔ سنہ ۶۱ ہجری ۱۰ رمحرم الحرام کو آپ کربلا میں شہید ہوئے۔ حضرت امام حسن مجتبیٰ، امام حسینؑ، پیغمبر اسلامؐ (رسول خدا) کے مطابق (سیدا شباب اهل الجنة) جوانان اہل بہشت کے سردار ہیں۔

تربیت: جب حضرت پیدا ہوئے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ختمی مرتب نے آپ کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی اور ساتویں روز عقیقہ کیا اور ایک یا دو مینڈھے ذبح کئے اور جناب سیدہ عالمیہ صلواۃ اللہ علیہا سے فرمایا کہ ان کے بالوں کے برابر وزن کر کے چاندی خیرات کرو۔

بحوالہ شہید انسانیت، صفحہ ۲۲ر مولانا علی نقی صاحب لکھتے ہیں:

اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی ان دو بچوں کی پرورش کا مرکز بنی۔[۱]

---

[۱] شہید انسانیت، صفحہ ۲۲ر، مولانا علی نقی نقن صاحب۔

ایک حسنؑ اور حسینؑ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک طرف نانا کا اسوہ حسنہ تھا جو بانی اسلام تھے دوسرے طرف باپ جو مجاہد اور محافظ اسلام تھے اور تیسری طرف ماں جو طبقہ خواتین کے لئے تعلیمات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی ترجمان بننے کے لئے پیدا ہوئی تھیں۔

بقول اقبالؔ

مزرع تسلیم را حاصل بتول ☆ مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

مسجد میں پانچوں وقت نماز باجماعت اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بصیرت آفریں وعظ اور خطبے مسلمانوں کا شوق اور جوش اور گھر میں رات دن عبادت و ذکر الٰہی کی آوازیں تکبیر کی صدائیں وحی کی آیتیں غزوات کے تذکرے اسلام کو ترقی دینے کے مشورے اور غریبوں کی خبر گیری کمزوروں کی دستگیری اور مظلوموں کی دادرسی بس ہر وقت یہی ذکر ہے۔ ایک طرف تو فطرت کے مخصوص عطیے دوسری جانب یہ نورانی اور روحانی ماحول اور اس پر تربیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایسے بلند معلّم کہ جن کا مقصد رسالت ہی قرآن کے اعلان کے مطابق تزکیہ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت تھا۔ اور آپ نے خود بھی اعلان کیا تھا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل میرا اصلی نصب العین ہے۔ (قرآن کریم سورہ بقرہ آیت ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران، آیت ۱۶۵، جمعہ آیت ۲) پھر کیوں کر ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل بیت کی تربیت میں اس فرض کو نظر انداز کردیتے جو بحیثیت معلّم اخلاق کے بحیثیت بزرگ خاندان کے اور بحیثیت ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ پر عائد ہوتا تھا اس لئے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کم سنی سے ہی ان دونوں بچوں کو اپنے اخلاق و اوصاف کا نمونہ بنا دیا۔ اور ان آئینوں میں جن کو قدرت نے کمال کا جوہر عطا کیا تھا رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پورا عکس اتار دیا۔

سنہ ۱۰ ہجری میں نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ کا موقع آیا تو اس موقع

پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ تھامے آگے آگے حسن و حسین علیہما السلام اور پیچھے پیچھے فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا۔ اس کا مقصد حق کے کامل نمائندوں کا خلق سے تعارف تھا۔ دوسری طرف تربیت کا انداز تھا کہ ضرورت کے وقت حفاظت اسلام کی ان سے ہی امید ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ تھام کر کہتے تھے کہ دیکھو آج تو میں موجود ہوں لیکن کل جب میں نہ رہوں تو تم اسی طرح حفاظت اسلام کے لئے نکل پڑنا، امام حسین علیہ السلام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں یعنی میرا کام اور میرا نام دنیا میں حسین کی بدولت قائم رہے گا۔ سات برس کے سن میں آپ کے سر سے نانا کی شفقت کا سایہ اٹھ گیا۔ اور وہ گھر جہاں ہر وقت لوگوں کا اجتماع رہتا تھا۔ سنسان نظر آنے لگا، حضرت فاطمہ زہرا کی مسلسل گریہ وزاری اور حضرت علیؑ کی خاموشی امام حسینؑ کے سامنے تھی۔ اس کے بعد والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اور صرف اپنے والد کی ذات کے ساتھ آپ نے سات برس کے سن سے لے کر چھتیس برس کی عمر تک کا وقت اس طرح گذارا کہ حضرت علی ایسے حکیم الٰہی، عالم، معلم اخلاق انسانی اور مجموعہ فضائل نفسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ یاب ہوتے رہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا کہ جب عام نظام اسباب کی دنیا میں انسانیت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے اس عمر کے آغاز سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بلیں پڑتی ہیں حسین علیہ السلام کے لئے ان تمام منازل کی ظاہری تکمیل علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی نگرانی میں ہو رہی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام لوگوں کی بے توجہی حق فراموشی اور سرد مہری سے کبیدہ خاطر ضرور تھے لیکن جب بھی کسی مسئلہ میں ان کی ضرورت پڑ جاتی وہ بلا عذر امداد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے اور اپنے فرض کو انجام دینے اور اسلام کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنے کا درس امام حسینؑ اور امام حسنؑ کو اس طرح ملتا رہا۔ (بحوالہ شہید انسانیت از مواعق محرقہ، ص ۷۶)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے خلافت کے لئے جنگ نہیں کی بلکہ انہوں نے عہد کیا کہ عبا دوش پر نہ ڈالوں گا جب تک کہ قرآن جمع نہ کرلوں ہے۔[1]

انہوں نے اپنے والد کے طرز عمل میں یہ نصب العین نمایاں پایا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں مگر ہمیں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں روکنا چاہئے، انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ قرآن اور اسلام کا ساتھ ان کے والد نے کسی عالم میں نہیں چھوڑا اور ان کی حفاظت کرنا ہر حال میں اپنا فرض سمجھا تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر اگر حضرت علی علیہ السلام چاہتے تو حکومت حاصل کر لیتے چونکہ خلیفہ دوم نے انہیں اس کمیٹی میں رکھا تھا جو چھ لوگوں پر مبنی تھا۔ اور اس کمیٹی کو خلیفہ سوم کا چناؤ کرنا تھا۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام کتاب اور سنت پر عمل کے علاوہ کسی دوسری شرط کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ امام حسنؑ اور امام حسین علیہما السلام نے ایک اہم سبق کا عملی نمونہ دیکھا جس پر ان کے آئندہ اقدامات کی بنیاد قائم تھی وہ یہ کہ شریعت اور مسلمان حکمرانوں کی سیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں اگر حکومت شریعت کی پابند نہ ہو تو مسلمان کا فرض ہے اسے تسلیم نہ کرے اور چاہے اس کے لئے اسے کوئی بھی قربانی پیش کرنی پڑے۔ لیکن کبھی غلط حکمران کو حاکم نہ مانے اور کسی غلط کار کے غلط اقدامات کو دولت و ثروت کے دباؤ میں آ کر کبھی تسلیم نہ کرے یا اگر جان کا خطرہ دکھا کر ڈرا دھمکا کر غیر شرعی بات ماننے کو کہا جائے تو مسلمان کو اس کے خلاف جنگ کرنی چاہئے یہ سوچے بغیر کہ دشمن کتنا طاقتور ہے اس سے جیت ملے گی یا ہار صرف اپنا مقصد مد نظر رکھتے ہوئے جہاد کرنا چاہئے۔

بحوالہ تاریخ احمدی اور تاریخ ابن جریر طبری، صفحہ ۱۶۹، میں ہے کہ پھر حضرت عائشہ مکہ گئیں اور جب باب المسجد کے پاس اتریں تو لوگ ان کے حضور میں جمع ہوئے۔ حضرت

---

[1] شہید انسانیت، صفحہ ۷۶، مولانا علی نقی نقن صاحب۔

عائشہ نے کہا:

''ایہا الناس! عثمان ظلم سے مقتول ہوئے اور خدا کی قسم میں ان کے خون کا بدلہ لوں گا۔[1]

تو جنگ جمل حضرت عائشہ نے خود شروع کی لیکن حضرت علی علیہ السلام نے فریق مخالف کی سرگروہ ام المومنین عائشہ کے ساتھ جنگ ہارنے کے بعد جو شریفانہ اور باعزت برتاؤ کیا کہ کسی فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔ اور جنگ صفین میں ''بحوالہ تاریخ ائمہ سید علی حیدر صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کے لشکر میں جنگ چل رہی تھی معاویہ کے لشکر نے پانی پر قبضہ کرلیا اور حضرت علی علیہ السلام کے لشکر پہ پانی بند کر دیا گیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے پانی کے لئے جنگ کا حکم دیا اور آپ کی فوج کا قبضہ گھاٹ پر ہوگیا اب معاویہ اور ان کا لشکر گھبرائے اور کہلوایا کہ ہم پر پانی نہ بند کریں، حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ ہم تم لوگوں پر پانی نہیں بند کریں گے اطمینان رکھو۔

یعنی مخالف جماعت کتنی ہی انسانیت اور اخلاق میں پست ہو ہمیں ہمیشہ بلند ظرفی سے کام لینا چاہئے اور انسانیت کی بلندی کا تحفظ کرنا ضروری ہے۔ پھر بھلا ایسے باپ کے بیٹوں کو انسانیت اور اسلام کا تحفظ کتنا عزیز رہا ہوگا۔ جن کو قدم قدم پر یہ تعلیم ملی کہ اسلام اور انسانیت کا تحفظ ہمارا فرض ہے اور نصب العین ہے۔ ہم پنجتن اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ اسلام کی حفاظت کرنی ہے۔ اور ہر لحہ انسانیت کا تحفظ کرنا ہے۔ عام تاریخی حالات اور ظاہری اسباب کے تحت یہ اہم تجربے اور یہ تعلیم جو ایک ربع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو حاصل ہوتے رہے ایک انسان کے بلندی اخلاق وصفات اور پختہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

---

[1] تاریخ احمدی، صفحہ ۱۶۹، نواب پر یانواں

واقعہ کربلا ایک مختصر جائزہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعہ کربلا تاریخ عالم میں اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری واقعہ ہے جو انسانی تاریخ کی روح اور اسلامی تعلیمات کا جوہر ہے۔ اس واقعہ میں نفسیات انسانی کے دونوں پہلو پوری طرح آشکار ہیں روحانیت اور انسانیت پوری تکمیل کے ساتھ امام حسین علیہ السلام اور ان کے کردار سے ظاہر ہوتی ہے۔ کربلا میں اخلاقی معاشرت سیاست وتہذیب کے علاوہ روشن ضمیری کے پہلو واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مادیت اور روحانیت میں ہمیشہ جنگ رہی ہے اور یہ ہر دور میں رہی ہے مذہب روحانیت کا علم بردار ہے۔ کربلا کی جنگ مذہب اور مادیت کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ تھی ایک جانب تمام مادی مظاہر تھے وہ کسی کو بھی مرعوب ومتاثر کرنے کے لئے کافی تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ یزید کے سامنے بیعت کے لئے سر خم کر دیا جائے اور دوسری جانب صرف وہ نادیدہ حقیقتیں تھیں جنہیں مذہب اختیار کرتا ہے اور ساری دنیا نے دیکھا کہ مادیت امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء کو متاثر کرنے میں ناکام رہی ہے اور انکار بیعت (جو غیبی طاقت پر ایمان کا نتیجہ تھی) آخر تک قائم رہا اور فتح حاصل کر کے دنیا کے سامنے ایک عظیم مثال قائم کی۔ جامع وکامل اور انفرادی طور پر جیسی اجتماعی قربانی کربلا میں امام حسین علیہ السلام نے پیش کی وہ تاریخ انسانی میں عدیم المثال ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد کتنے ہی انقلاب آئے تمدن نے کتنی ہی کروٹیں لی معیار واخلاق

میں تغیر آیا لیکن واقعہ کربلا تیرہ سو سال سے اسی عزت واحترام کے ساتھ قائم ہے۔ اصل میں یہ قربانی ایسے مشترک انسانی اصول کی حفاظت کے لئے کی گئی ہے کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اس اصول کی بھی قدر ومنزلت ہوگی۔ اور اس یادگار قربانی کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعے سے بڑھ کر کسی واقعے سے متعلق نظم ونثر کا اتنا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا کربلا کے واقعہ کو کچھ وقت ہی گذرا ہوگا کہ شاعروں نے اس واقعے سے متعلق شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔

"مستقل طور پر اس واقعہ پر تصانیف کی ابتداء پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ہوئی اور اس کے بعد برابر مورخین واقعہ کربلا پر مقاتل لکھتے ہیں۔"[1]

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے کسی موضوع پر اس قدر نہیں لکھا گیا ہے جتنا کہ واقعہ کربلا کے متعلق کہا گیا اور لکھا گیا پھر بھی ابھی بہت کچھ کہنے کی ضرورت باقی ہے ادھر جدید غزلوں میں واقعہ کربلا کا ذکر شدت سے کیا جارہا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری کو واقعہ کربلا سے بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس موضوع کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ بہت سے شعراء نے اس میں اپنے اپنے حساب سے رنگ بھرے ہیں۔ پھر بھی تصویر نامکمل ہے اب آیئے مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔ واقعہ کربلا کا تاریخ گواہ ہے کہ حضرت حسن علیہ السلام حضرت علی علیہ السلام کے خلف الصدق تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ کے دل میں عالم اسلام پر حکومت کرنے کا ارادہ تھا اس کیلئے انہوں نے جنگیں کیں سازشیں کیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کی زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے۔

"حضرت علی علیہ السلام سے دم آخر حضرت حسن علیہ السلام کی جانشینی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نہ منع کرتا ہوں نہ حکم دیتا ہوں

---

1. شہید انسانیت، صفحہ ۱۵۰، از مولانا علی نقن صاحب۔

تم لوگ ایسے زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔''[1]

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد معاویہ کو اپنا دیرینہ خواب پورا کرنے کا موقع مل گیا چنانچہ انہوں نے عراق پر فوج کشی کر دی۔ حضرت حسن علیہ السلام مسلمانوں کے خون کی قیمت پر خلافت خریدنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے صلح کو بہتر سمجھا۔ صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ امیر معاویہ کے بعد امام حسن علیہ السلام ہی خلیفہ ہوں گے مگر تمام شرائط کے باوجود مخفی طور پر کارروائیاں جاری رہیں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو سنہ ۵۰ ہجری ۲۸ صفر المظفر کو جعدہ بنت اشعث سے زہر دلوا کر شہید کر دیا گیا۔ یعنی یزید کو خلیفہ بنانے کے لئے ہر طرح سے کوشش کی گئی۔ معاویہ کو حجاز سے خطرہ تھا معاویہ نے مکہ اور مدینہ کا سفر کیا اور وہاں پانچ بزرگ حضرات سے (۱) حضرت عبداللہ بن عمر (۲) عبداللہ بن عباس (۳) عبداللہ بن زبیر (۴) حسین ابن علی (۵) عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہم سے الگ الگ گفتگو کی۔ کوئی یزید کے حق میں نہ تھا لیکن معاویہ نے اعلان کروا دیا کہ انہوں نے بیعت کر لی ہے۔ بہرحال معاویہ کے زمانے میں خلافت اسلامی موروثی اور شخصی حکومت کے قالب میں آ گئی جس سے اس کی اصل روح بدل گئی معاویہ کے انتقال کے بعد یزید تخت نشین ہوا اور تخت نشینی کے بعد اس کے سامنے ان پانچ بزرگوں کی بیعت کا سوال پیدا ہوا ان لوگوں کی جانب سے مخالفت کا خطرہ تھا۔ جس سے حجاز اور عراق میں یزید کے خلاف انقلاب برپا ہو سکتا تھا۔ یزید نے ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو بیعت لینے کے لئے بھیجا اور کہا کہ اگر ذرا بھی تامل کریں تو سر قلم کر دینا۔ ولید نے معاویہ کی موت کی خبر اور یزید کا حکم سنایا:

''حضرت امام حسین علیہ السلام نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھی اور کہا کہ مجھ جیسا آدمی چھپ کر بیعت نہیں کر سکتا اور نہ یہ میرے لیے زیب ہے جب

---

[1] تاریخ اسلام، صفحہ ۳۷۹، حصہ اول

عام لوگوں کو بیعت کے لئے بلاؤ گے تو میں آجاؤں گا ولید راضی ہو گیا اور امام حسین علیہ السلام واپس لوٹ گئے ابن زبیر ایک رات کی مہلت لے کر راتوں رات مکہ نکل گئے مکہ پہنچ کر وہ حرم میں پناہ گزیں ہو گئے۔[۱]

امام حسین علیہ السلام معہ اہل وعیال سنہ ۶۰ ہجری میں مکہ روانہ ہو گئے، کوفہ والوں نے آپ کو برابر دعوت دی کہ کوفہ تشریف لائیں۔ حضرت نے اپنے چچیرے بھائی حضرت مسلم کو حالات جاننے کے لئے کوفہ بھیجا مگر جب مسلم وہاں پہنچے تو حالات مناسب تھے انہوں نے امام حسین علیہ السلام کو خط بھیجا کہ آجایئے مگر بعد میں حالات بہت خراب ہو گئے۔ ابن زیاد نے حضرت مسلم کو قتل کروادیا حضرت مسلم کا خط پا کر امام حسین علیہ السلام نے کوفہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اہل مکہ اور اعزہ کوفہ والوں کی غداری سے باخبر کرتے رہے لیکن امام حسین علیہ السلام مع اہل وعیال ذی الحجہ سنہ ۶۰ ہجری کو کوفہ روانہ ہو گئے۔ مقام .... میں آپ کو حضرت مسلم کی شہادت کی خبر ملی لیکن سفر آگے کا جاری رہا آگے جا کر مقیم ذی حشم میں حر بن یزید تمیمی ایک ہزار سپاہ کے ساتھ امام حسین علیہ السلام کو گھیر کر دشت کربلا تک لانے کے لئے پہنچا۔ ۳ محرم کو عمر بن سعد چار ہزار فوج لے کر کربلا پہنچا۔ ۷ محرم سے حسین علیہ السلام کے لشکر پر پانی بند کر دیا گیا۔ ۹ محرم کو آخری گفتگو ہوئی۔ امام حسین علیہ السلام نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور ایک رات کی مہلت مانگی، رات میں سب لوگوں کو جمع کیا اور خطبہ فرمایا کہ

"لوگو! موعودہ وقت آن پہنچا اس لئے میں تم کو اجازت دیتا ہوں اگر روشنی میں جاتے شرم آتی ہے تو میں شمعیں گل کئے دیتا ہوں تم لوگ اندھیرے میں چلے جاؤ۔[۲]

۱۔ بحوالہ تاریخ اسلام، صفحہ ۴۴

۲۔ بحوالہ تاریخ اسلام، ج ۲، صفحہ ۵۲

جاں نثاروں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ دس محرم الحرام کو نماز صبح کے بعد اہل بیت کے خیموں کی حفاظت کا انتظام کرنے کے بعد بہتر جاں نثاروں کی فوج مرتب کی، میمنہ پر زہیر بن قیس اور میسرہ پر حبیب ابن مظاہر اور علم حضرت عباس علیہ السلام بن علی علیہ السلام کو مرحمت کیا۔ حر بن یزید تمیمی اہل کوفہ کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ گئے۔ جنگ شروع ہوئی ایک طرف ہزاروں کا لشکر دوسری سمت بہتر سپاہی لیکن یہ لوگ بڑی شجاعت سے لڑتے رہے یہاں تک کہ سارا لشکر شہید ہوا اور آخر کار امام حسین علیہ السلام نے جام شہادت پیا۔ بس اتنا ہی نہیں بلکہ امام کو قتل کر کے ان کے حرم کے خیمے جلا دیئے گئے اور سروں سے چادریں چھین لی گئیں۔ طرح طرح کے مظالم کئے گئے، اہل بیت کی حالت دیکھ کر اور دربار یزید میں جو خطبہ حضرت زینب صلوٰۃ اللہ علیہا نے دیا تو یزید کانپ اٹھا، آخر کار ۲۰ رصفر کو یہ قافلہ واپس کربلا پہنچا اور امام زین العابدین علیہ السلام نے شہدائے کربلا کے سروں کو تن سے ملا کر دفن کر دیا اس کے بعد یہ لٹا ہوا قافلہ مدینہ روانہ ہو گیا۔ اہل بیت کی حالت دیکھ کر مدینہ میں کہرام برپا ہو گیا اور اہل مدینہ یزید کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنے لگے۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے مقصد اور نتائج

بحوالہ انیس کے مرثیے صفحہ ۳۲ بیگم صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ

"مگر یہ داستان کربلا یہیں پر ختم نہیں ہوئی مقتول و مفتوح حسین علیہ السلام کو وہ زبردست فتح حاصل ہوئی کہ آج ساڑھے تیرہ سو سال بعد تک ان کا نام "زندہ" ان کا کارنامہ امر ان کی شہادت دنیا کا عظیم المیہ اور بے مثال واقعہ ہے۔ دنیا بھر کے حق پرست حسین علیہ السلام کے سامنے سر جھکاتے اور ان کی بارگاہ میں نذر عقیدت پیش کرتے ہیں اور یزید کا نام ہی گالی کے مترادف ہو گیا۔[1]

---

[1] انیس کے مرثیے، از: صالحہ عابد حسین، صفحہ ۳۲

دوستوں سے کیسا سلوک کرنا چاہئے اپنوں سے کس طرح مساوات مدنظر رہنا چاہئے اس کا سبق بھی امام حسین علیہ السلام نے جگہ جگہ دیا عاشور کے دن مصائب کا ہجوم لیکن ہر کسی کے ساتھ ایک سا سلوک سب کی لاشیں خود امام حسین علیہ السلام اٹھا کر لائے۔ ان کے کردار سے معاشرے کو انسان ہمدردی صاف گوئی امن پسندی اور رواداری کا پیغام حاصل ہوا۔ ہر قوم خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں کسی ملک یا کسی بھی عہدے سے تعلق رکھتے ہوں حسین علیہ السلام کی عظمت کو نسل بشری کی معراج کمال تصور کرنے میں حق بجانب ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی صاحب نے رسالہ کاروان حیات ممبئی صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے کہ

"امام حسین علیہ السلام کا کارنامہ تاریخ عالم کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے حسین علیہ السلام کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں محض حق کی حمایت کے لئے وطن چھوڑ دیتے ہیں اہل بیت اور ناصروں کو لے کر چلچلاتی دھوپ میں اور آگ برساتی ہوئی فضا میں مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق کا سفر کرتے ہیں۔ کربلا میں ان کے مختصر سے قافلے کو گھیر لیا جاتا ہے۔ ۷۲ کے مقابلے میں ۳۰ ہزار کا لشکر صف آرا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ وقت کا مطالبہ ہے کہ حسین علیہ السلام میری بیعت کرو۔ حسین علیہ السلام اس پر اٹل ہیں کہ سر کٹتا ہے تو کٹ جائے لیکن دین بے دینی کی نور نار کی حق باطل کی حمایت نہیں کرسکتا۔ یزید کا کہنا ہے کہ میں ظلم وتشدد کی ہر قوت میدان میں اتار دوں گا۔ حسین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ میں تلوار کا مقابلہ کردار سے کروں گا۔ یزید کو طنطنہ ہے کہ میرے پاس بادشاہت ہے دولت ہے حکومت ہے اقتدار ہے حسین علیہ السلام کو ناز ہے کہ میرے پاس ایمان ہے حق پرستی کا جذبہ ہے انسانیت کی امانت ہے، اخلاق کا سرمایہ ہے یزید کا کہنا ہے کہ بیعت لے کر رہوں گا۔

حسین علیہ السلام کا فیصلہ ہے کہ جان دے دوں گا مگر ایمان پر آنچ نہ آنے دوں گا۔[1]

تو یہ ثابت ہوگیا کہ حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء ایک غلط نظام سے مفاہمت کرکے اس کے تحت زندہ رہنے کے بجائے اس کے خلاف مردانہ وار جنگ کرتے ہوئے مرجانا پسند کرتے تھے۔ حسین علیہ السلام ظلم سے باطل سے، ناانصافیوں سے، گناہ سے مفاہمت کے بجائے موت کو ترجیح دینا پسند کرتے تھے۔ انہیں اپنے خاندان کی تاراجی منظور تھی لیکن باطل کا غلبہ قبول نہ تھا وہ حق کے نظام میں زندہ رہنا چاہتے تھے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو زندگی ان کے لئے بے معنی تھی۔

حسین علیہ السلام نے طاقت کا مقابلہ کردار سے کیا، اور یہ ثابت کر دیا کہ اقتدار کا مقابلہ بے بسی کثرت کا مقابلہ قلت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے کیسے کیا جاسکتا ہے، یہ وہ طریقہ جنگ تھا جس کا مشاہدہ اس سے قبل دنیا نے نہیں کیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام نے قصروں کے عیش وطرب میناروں کی چمک دمک سے لوگوں کی نگاہیں موڑ کر اسلامی اصولوں کی برق تجلی کو عمل کی اس معراج پر پہنچایا کہ بس وہی دکھائی دے اور اپنے کردار کو اس بلندی پر لے گئے کہ آفتاب کی طرح چمک اٹھے وہ انسان کے کانوں کو ساز و نغمہ سے بے گانہ بنا کر اسلام کی آواز سے شناسا کر دینا چاہتے تھے۔ ان کا نصب العین تھا کہ دنیا کو بتادیں کہ حکومت، سلطنت اور چیز ہے، اور اسلامی تمدن اور تہذیب اور اس کے اصول اور ہیں، امام حسین علیہ السلام کا مقصد قطعی نیا نہ تھا بلکہ ان سے قبل تمام انبیاء علیہم السلام یہی مقصد لے کر آچکے تھے لیکن جو فتح امام حسین علیہ السلام کو حاصل ہوئی وہ نہ ان سے پہلے کسی کو ملی نہ ان کے بعد نظر آئی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے دور یزید تک بنی امیہ کی

---

[1] کاروان حیات، صفحہ ۶۱، از: ذاکر حسین فاروقی

ترقیاں کس کو معلوم نہیں دولت وثروت وسعت مملکت وحشم وحزم کے لحاظ سے وہ قیصر وکسریٰ کی ہمسری کرتے نظر آتے تھے لیکن نفس پرستی اور تن پروری کے اعتبار سے ان سے بھی کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ چونکہ قانون قدرت کے مطابق ان کا زوال قریب آچکا تھا۔ اس پر یزید نے بغیر امام حسین علیہ السلام کی روحانی عظمت سمجھے انہیں قتل کروادیا اس کا نتیجہ ظاہر تھا تباہی۔

بہر حال اس کے بعد حسین علیہ السلام کا صبر واستقلال ایک مثال بن گیا جو ہر موقع پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح حسین علیہ السلام نے قوت برداشت اور جرأت اظہار کی وہ مثال قائم کی جو ظلم کی طاقتوں کے لئے ہمیشہ خطرہ بنی رہی۔ بقول جوشؔ:

یہ آج جو اک گونج ہے آزادی کی
یہ بھی ہے حسینؑ ابن علیؑ کی آواز

اسی طرح امام حسین علیہ السلام نے صبر وضبط کی وہ مثال قائم کی جو ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی۔ بحوالہ سید ارشاد حسین اظہر ایڈوکیٹ نے کاروان حیات ممبئی صفحہ ۶۷ پر تحریر کیا ہے کہ

"حسین صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ وہ رہتی دنیا تک ہر معرکہ جبر وظلم میں رہبر ورہنما ہیں۔"[1]

آگے چل کر نتائج کا ذکر کرتے ہوئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے شہادت کے فلسفے پر ایک جاودانی کتاب لکھ دی ہے ہر کس وناکس کے لئے ایک نعرہ دے دیا ہے، انقلابی نعرہ اور قربانیوں کا اصلاحی نعرہ حصول حیات ابدی کا نعرہ ظالموں کی اصلاح کا نعرہ، حق وحریت کا نعرہ، جیو اور جینے دو کا نعرہ، جو رہتی دنیا تک ہر نفس انسانی کو راہ دکھاتا رہے گا اور دنیا کی پرخار وادیوں سے نکال کر روحانیت کی بلندی تک پہنچاتا رہے گا اور مردہ انسان کے قلب کو حیات کی انوار سے روشن کرتا رہے گا۔ ان کی قربانی ایک منظم حیثیت رکھتی تھی اگر وہ

---

[1] کاروان حیات، صفحہ ۶۷، از: ارشاد حسین اظہر ایڈوکیٹ۔

اپنی شہادت سب سے پہلے دیتے تو کہا جاتا کہ مصائب سے گھبرا کر جان دے دی۔ لیکن انہوں نے آہستہ آہستہ قربانی کے تمام منازل طے کئے اور ثابت کر دیا کہ آپ کا اقدام کسی وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ معاملہ فہمی اور فرض شناسی پر مبنی تھا۔ ان کا مقصد تھا کہ اپنے سے نسبت رکھنے والی عزیز سے عزیز تر ہر شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کردیں اللہ کی راہ میں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ نہ رہ جائے تو اس متاع گراں مایہ کو بھی قربان کر دیں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ اگر انسان اپنی خواہشوں اور نفس کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا تو دنیا کا کوئی ظالم اسے غلام نہیں بنا سکتا۔

اس وقت عالم اسلام عیش و عشرت میں غرق تھا۔ مشقت کی بجائے آرام طلبی اور خود غرضی کا دور دورہ تھا وہ سب ایک جھٹکے سے جاگ گئے اور یہ جھٹکا ان کے دلوں اور ذہنوں کو واقعہ کربلا کی وجہ سے لگا تھا اور اس سے انہیں سچ کا ساتھ دینے اور صحیح سمت کا تعین کرنے کی روشنی حاصل ہوئی وہ لوگ اندھیروں میں ڈوبے تھے امام حسین علیہ السلام کے خون ناحق نے ان کی آنکھوں کو ایسی روشنی بخشی کہ انہیں اپنی راہیں تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ پیش آئے اور وہ راہ حق تلاش کر سکیں یعنی مردہ ذہنوں اور مردہ قوموں کو اس واقعہ نے بیدار کر دیا اور اسلام کو نئی زندگی بخشی۔

واقعات کربلا کے اہم کردار

حضرت امام حسین علیہ السلام: واقعہ کربلا میں سب سے زیادہ اہم کردار امام حسین کا ہے۔ امام حسین علیہ السلام پر کربلا میں ظالموں نے جو ستم ڈھائے ان سے دین کے ستون ہل گئے شرع کی بنیا متزلزل ہوگئی اور اس پر آنکھیں روئیں دل زخمی ہوئے یہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ بڑی اور ہولناک مصیبتوں میں گھر جانے کے بعد مومن کے لئے سرمایہ تسلی بن جاتی ہے اسے یہ احساس ہوا کہ جب امام معصوم کو مصیبتوں سے سابقہ ہوا تو ہماری کیا حقیقت ہے:

نظام عدل کا امیر انتخاب چاہئے
زمین چیخنے لگی ہے بوتراب چاہئے
یزید کے سوال کا جواب کب کا ہو چکا
حسین کے جواب کا کوئی جواب چاہئے

حسین علیہ السلام ۵ رشعبان سنہ ۴ ہجری مطابق ۵ رجون ۶۲۶ء کو پیدا ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسین رضی اللہ عنہ نام رکھا، آپ کی وفات کے وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر سات سال سات مہینے اور سات دن کی تھی۔[1]

---

[1] الحسین، صفحہ ۳۸، جناب قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی، عمر ابوالنصر، مترجم شیخ محمد احمد پانی پتی ۱۹۸۰ء، ناشر ایوان کمپنی ۶ رنخاس کہنہ الہ آباد

حسین علیہ السلام کے عمل نے جو نمونے دنیائے اسلام کے سامنے پیش کئے انہوں نے ایک انصاف پسند انسان کو یہ اندازہ کرنے کا موقع فراہم کیا کہ امام حسین علیہ السلام اور یزید کے کردار میں حق و باطل کا ایک معرکۃ الآراء تصادم ہے، جو اظہر من الشمس ہے۔ نیز یہ کہ امام حسین علیہ السلام نے اتنی گراں قدر قربانی کن خطروں کو مٹانے کے لئے منظور فرمائی۔

تباہی میں سفینہ آگیا تھا امت جد کا
یہ کشتی بحر خوں میں ڈوب کر شہ نے نکالی ہے

خضر رہبر اور نہ چارہ گر مسیحا چاہئے
ہم کو ہادی بس شہید کربلا سا چاہئے

کس مشقت سے عبادت کا سر انجام کیا
اے مرے سید مظلوم بڑا کام کیا

سر دیا اس نے دم عصر دعائیں دے کے
ظہر تک جس نے اٹھائے تھے اکہتر لاشے
ظلم بے جا کو تھکا مارا بڑی محنت سے
سبق آموز عمل تھا یہ ہمارے ہی لئے
مرحبا دین محمدؐ کے جگانے والے
سید شیر الٰہی کے گھرانے والے
شان بے لوث عبادت کی دکھانے والے
پھر سے اسلام کو اسلام بنانے والے

ہے سجدہ گاہ مودت کہ ارض کرب و بلا
یہاں تو کعبہ ہی کعبہ دکھائی دیتا ہے
یہ مسجدیں یہ نمازی یہ عابدوں کی صفیں
مرے امام کا صدقہ دکھائی دیتا ہے

حسین علیہ السلام ابن علی علیہ السلام کی اس بے مثال شہادت نے اسلام کے فلسفۂ جہاد وقربانی کی جس روایت کو روشن کیا اس کا گہرا اثر ادبیات پر بھی پڑا۔[1]

امام حسین علی علیہ السلام کی عظمت کا اندازہ ہمیں اس حدیث سے ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں فرمائی تھی اس سلسلے میں الحاج مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی تحریر فرماتے ہیں

> سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اے دنیا والو! بس مختصر یہ سمجھ لو کہ ''حسین منی و انا من الحسین'' حسین علیہ السلام مجھ سے ہے اور میں حسین علیہ السلام سے ہوں، خدا اسے دوست رکھے جو حسین علیہ السلام سے دوست رکھے۔[2]

امام حسین علیہ السلام کی صفات کا کیا ذکر کیا جائے ہزاروں کتابیں لاکھوں حدیثیں ان

---

[1] شب خون، صفحہ ۲، اگست ۱۹۸۷ء، گوپی چند نارنگ

[2] چودہ ستارے، صفحہ ۲۲۰، سید نجم الحسن کراروی، ۱۵ شعبان ۱۳۹۳ھ، امامیہ کتب خانہ، مغلی حویلی اندرون موچی دروازہ، لاہور-۸

کے متعلق ہیں، اور سب میں مختلف انداز سے ان کی تعریف کی گئی ہے، سید نجم الحسن کراروی ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

صفر سنہ ۵۰ ہجری کو جب امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے تو امام حسین علیہ السلام صفات حسنہ کے واحد مرکز بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ میں جملہ صفات حسنہ موجود تھے اور آپ کے طرز حیات میں محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ کا کردار نمایاں تھا اور آپ نے جو کچھ کیا قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا۔[1]

قانون قدرت کے مطابق ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یزید کی فتح ہوتی اور حسینیت کا چراغ گل ہو جاتا لیکن ہوا یہ کہ غم حسین علیہ السلام کی ناتوانی نے یزید کی توانائی کا گلا گھونٹ کے رکھ دیا اور اپنی مقتولیت کی ضرب سے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا وہ موت جس کے صرف تصور سے بڑے بڑے ساونتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں، وہی موت جب حسین علیہ السلام کے سامنے آئی تو ایسی حقارت سے اسے دیکھ کر حسین علیہ السلام مسکرائے کہ خود موت کی نبض ساکت ہو کر رہ گئی۔

"اے حسین! اے دریائے زہر سے آب حیات پینے والے بھرے طوفان کو اپنے سفینے میں ڈبونے والے حریم شہادت کے سب سے اونچے منارے اے ہمت مردانہ کے اوتار اور اے ثبات و عزم کے پروردگار ازل سے لے کر ابد تک کی انسانیت کا غلامانہ سلام قبول کرے۔ (یادوں کی بارات سے اقتباس)

عباس ابن علی بن ابی طالب: آپ کی والدہ ام البنین تھیں، آپ امام حسین علیہ السلام کے مختلف البطن بھائی تھے، لیکن امام حسین علیہ السلام آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور حضرت عباس علیہ السلام امام حسین علیہ السلام سے بے پناہ محبت و عقیدت کرتے تھے

---

[1] بحوالہ مطالب الرسول، صفحہ ۲۴۲، صواعق محرقہ، صفحہ ۱۱۴، نور الابصار، صفحہ ۱۱۳، و صحیح ترمذی، ج ۶، ص ۳۰۷۔

ان کی چھوٹی صاحبزادی حضرت سکینہ جو صرف چار برس کی تھیں ان سے بھی حضرت عباس علیہ السلام بہت محبت کرتے تھے۔

۴ رشعبان سنہ ۲۶ ہجری مطابق ۱۸ رمئی ۶۴۷ء یوم سہ شنبہ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ امام حسین علیہ السلام کے مستقل علمبردار تھے آپ کو کربلا میں جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی۔ صرف پانی لانے کا حکم ملا تھا۔[1]

بات ہے ایمان کی قرآن ناطق ہیں حسین
اور یہ عباس اس کی بولتی تفسیر ہے
ان کے روضے کو نگاہ معرفت سے دیکھئے
ایسا لگتا ہے کہ اک قصر وفا تعمیر ہے
پھیلے ہوئے ساحل ہے کہ دامان وفا ہے
بہتا ہوا دریا ہے کہ فیضان وفا ہے
پھیلے تو بہت تنگ ہے دامان مہ و سال
سمٹا ہوا نقطے میں جو قرآن وفا ہے
روشؔ

(نواب باقر علی خاں روش لکھنوی مصنف کائنات روش)

ان کی وفا ایک مثال بن گئی۔ لوگ ان کے نام کے ساتھ وفادار لگاتے ہیں، جب شمر نے ان کو اور ان کے بھائیوں کو امان دینا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ تجھ پر اور تیری امان پر خدا لعنت کرے تو ہمیں امان دیتا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کے لئے ترے پاس امان نہیں ہے۔ وفاداری کی یہ مثال کیا کم ہے، جب نہر فرات پر آپ نے قبضہ کرلیا تو چاہتے تو

---

[1] چودہ ستارے، صفحہ ۲۵۱، نجم الحسن صاحب

پانی پی سکتے تھے، لیکن چلّو میں پانی لے کر دوبارہ پھینک دیا کہ سکینہ کو پانی پلانے سے پہلے خود کیسے پانی پی لیتے۔ اور انہوں نے دنیا کو دکھا دیا کہ تین روز کی پیاس وفا سے بڑھ کر نہیں ہے اور ان کی وفا دنیا کے لئے مثال بن گئی۔

بھرا تو چلّو میں پانی مگر رہے پیاسے
خصوصیت یہی عباس نیک نام میں ہے
انہیں وفا کا سمندر نہ کس طرح سے کہوں
انہیں کے نام کا پانی وفا کے جام میں ہے
گوہر سالکی

وفاداری، جاں نثاری، ہمت، حوصلہ یہ سب ان میں بدرجہ اتم موجود تھے ان کے دونوں ہاتھ جب قطع کر دیئے گئے اور سر پر گرز لگایا گیا اور وہ گرے تو جسد مطہر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور حضرت عباس آسمان وفا کا چمکدار ستارہ بن گئے بلکہ آفتاب وفا بن گئے فرات کی لہروں میں اب تک ان کی وفا کی خوشبو پائی جاتی ہے۔

حبیب ابن مظاہر: جناب حبیب بن مظاہر ابن ریاب ابن اشتر ابن جحوان ابن فقعس ابن طریف ابن عمر بن قیس ابن حرث ابن ثعلبہ ابن دوان ابن اسد القاسم الاسدی کے بیٹے امام حسین علیہ السلام کے بچپنے کے دوست تھے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کا بھی شرف حاصل تھا، یہ اصحاب امیر المومنین میں بھی تھے اور ہر جنگ میں شریک رہے، انہوں نے کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل کا پورا پورا ساتھ دیا۔ یہ شہادت مسلم کے بعد کربلا کو پا پیادہ روانہ ہو کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے[۱]

شب عاشور جب حضرت عباس علیہ السلام ایک رات کی مہلت مانگنے جب عمر سعد

[۱] چودہ ستارے، ص ۲۴۷، نجم الحسن صاحب قبلہ، ۱۳۹۳ھ، امامیہ کتب خانہ حویلی موچی دروازہ، لاہور-۸

کے پاس گئے تو حبیب ابن مظاہر ساتھ میں تھے آپ نے بہت زبردست جنگ وقتال کیا جب آپ شہید ہو گئے تو امام حسین علیہ السلام نے بہت درد سے کہا تھا کہ اے حبیب میں تم کو اور اپنے اصحاب کو خدا سے لوں گا۔[1]

زہیر ابن قین: جناب زہیر ابن قین ابن قیس نماری بجلی کے بیٹے تھے یہ قوم کے سردار اور رئیس تھے سنہ ۶۰ ہجری میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہوئے۔[1]

امام حسین علیہ السلام کی زندگی میں جب شمر نے آپ کے خیمے جلانا چاہے تو جناب زہیر نے اس سے شدید مقابلہ کر کے اسے باز رکھا تھا اور نماز ظہر کے وقت امام حسین علیہ السلام کے سامنے سعید کے ساتھ سینہ سپر رہے اور میدان جنگ میں زبردست جنگ کی شہادت کے درجے پر فائز ہوئے۔

نافع بن بلال: جناب نافع، بلال ابن نافع ابن جمل ابن سعد العشیرہ ابن مدحج جملی کے بیٹے تھے آپ شریف النفس سردار قوم بہادر اور قاری قرآن راوی الحدیث تھے۔[2]

آپ ہر جنگ میں امیر المومنین کے ساتھ رہے کربلا میں جب حضرت عباس پانی کی جدوجہد کے لئے نہر پر تشریف لے گئے تھے تو نافع بن ہلال آپ کے ساتھ تھے اور میدان جنگ میں شدید قتال کرنے کے بعد قتل ہو گئے۔

مسلم بن عوسجہ: جناب مسلم عوسجہ ابن سعد ابن ثعلبہ ابن دودان ابن اسد ابن حزیمہ ابوحجل اسدی سعدی کے بیٹے تھے یہ شریف، عابد وزاہد اور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے اکثر اسلامی جنگوں میں شریک رہے کوفہ میں مسلم بن عقیل کی مدد کی اور میدان کربلا میں بڑی دلیری سے جنگ کی اور آخر کار جنگ کرتے کرتے شہید ہو گئے۔

---

[1] چودہ ستارے، صفحہ ۲۴۷

[2] چودہ ستارے، صفحہ ۲۴۷

بریر ہمدانی: جناب بریر ابن خضیر ہمدانی مشرقی، بنو مشرق کے قبیلہ ہمدان کے ایک معمر تابعی تھے یہ نہایت بہادر عابد و زاہد اور بے مثل قاری قرآن تھے، انہوں نے کوفہ سے مکہ جاکر امام حسین علیہ السلام کی ہمراہی اختیار کی اور تاحیات ساتھ رہے، شب عاشور پانی لانے میں عظیم جدوجہد کی تھی۔ اور زبردست جنگ کرنے کے بعد شہادت حاصل کی تھی۔

حضرت علی اکبر: یہ امام حسین علیہ السلام کے صاجزادے تھے حضرت علی اکبر صورت و سیرت و آواز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے، آپ نے بڑی بہادری سے جنگ کی تھی اور صفیں الٹ دی تھیں، حضرت علی اکبر کا اصلی نام علی لقب اور کنیت ابوالحسن تھی آپ کی عمر شہادت کے وقت ۱۸ رسال تھی۔

جون غلام ابوذر: جون کا رنگ سیاہ تھا اور یہ غلام تھے انہوں نے امام حسین علیہ السلام کی وفاداری میں بڑی شدید جنگ کی اور آخر کار جام شہادت نوش فرمایا۔

حضرت قاسم بن حسین علیہ السلام: یہ امام حسن علیہ السلام کے بیٹے تھے اور شہادت کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ سال تھی آپ کا عقد امام حسین علیہ السلام کی صاجزادی بی بی کبریٰ سے ہوا تھا۔ آپ نے بہادری سے جنگ کی اور جام شہادت پیا لیکن دشمنوں نے آپ کی لاش پر گھوڑے دوڑائے۔

حر بن یزید تمیمی: یہ یزید کی فوج کا ایک کمانڈر تھا جو ابن زیاد کے حکم سے حسین علیہ السلام کو گھیر کر لانے کے لئے بھیجا گیا تھا اور وہ امام حسین علیہ السلام کے گھیر کر کربلا تک لایا تھا سفر میں جب اس کے لشکر کا پانی ختم ہو گیا تو اس کی فوج پیاس سے بے حال تھی اس وقت امام حسین علیہ السلام نے دشمن کو پانی سے سیراب کیا۔ حر اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا تھا اور بعد میں امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت اور حق پرستی کا ایسا اثر ہوا کہ وہ امام حسین علیہ السلام کے لشکر میں شامل ہو گیا اور اپنی جان امام مظلوم کے لئے پیش کر دی اور اپنے غلام اور بیٹوں کی

شہادت بھی پیش کی اور اپنے کو زندۂ جاوید بنالیا۔

جناب حضرت زینب صلواۃ اللہ علیہا: آپ فصاحت و بلاغت اور زہد و عبادت، فضیلت، شجاعت اور سخاوت میں اپنے باپ ماں سے بے حد مشابہ تھیں زندگی کے بیش تر حصے اور سفر کربلا میں وہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رہیں۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس بھیانک ماحول میں بھی نظم و نسق کی دیکھ بھال اور قیادت کی ساری ذمہ داری حضرت زینب صلوٰۃ اللہ علیہا پر ہی تھی ایسے حالات میں اتنے فرائض اس خوبی سے دنیا کی کسی خاتون نے نہیں نبھائے ہوں گے انہوں نے کربلا سے شام اور شام سے مدینہ واپسی تک جس عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا اور اپنے بھائی کی شہادت کے مقصد کا جس طرح تحفظ کیا اس کی مثال کہیں نہیں ملتی ہے۔ عبادت گذاری ان کا وصف تھا ان کے خطبے قوت گویائی اور فصاحت کا شاہکار ہیں ایسی معنویت اور تاثیر سے پُر ہیں جس کی مثال عرب جیسے ادب میں نہیں ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کی تحریر حوالہ کے بطور پیش کر رہے ہیں۔

> ''جناب زینب صلواۃ اللہ علیہا کے سارے کردار اور صفات کے لئے اگر مختصر ترین فقرہ استعمال کیا جائے تو بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ وہ اس پر ہول مہم میں شریکۃ الحسین علیہ السلام تھیں۔''[1]

ہٹا کر ظلم و استبداد کے چہرے سے پردے کو
سر زینبؑ کی چادر نصرت شبیر کرتی ہے

ہنر لکھنوی

---

[1] ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب قبلہ نونہروی، صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، صفحہ ۸۱، ۱۹۸۲ء، الواعظ مدرسۃ الواعظین، ۱۶ رکینگ اسٹریٹ، لکھنؤ-۲۲۶

صالحہ عابد حسین فرماتی ہیں:

کربلا کی وہ شیر دل خاتون جو کہ بعد قتل حسین علیہ السلام اس حسینی مشن کی قیادت کرتی ہے جو کہ انقلاب کے دوسرے مرحلے یعنی خون کے بعد پیام کو اپناتی ہے جس کی تقاریر و خطبات سے کوفہ و شام کے کوچہ و بازار و دربار لرزاں ہو گئے وہ خاتون جس نے شام کے بازار میں یزید کو للکارا جس کے کلمات نے اموی حکومت کی بنیادوں کو ہلا دیا اور انقلاب امنڈتا ہوا سرزمین عرب کے افق پر نمودار ہونے لگا۔[1]

وہ مجاہدۂ اعظم کہلاتی ہیں خاتون کربلا اور مظلومۂ نینوا کہلاتی ہیں۔ حضرت زینب صلوٰۃ اللہ علیہا امام حسین علیہ السلام کی بہن ہیں، اور امام حسین علیہ السلام کے بعد واقعۂ کربلا میں سب سے اہم کردار ان کا ہی ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام: تمام شہیدوں نے تلوار سے جنگ لڑی اور ہمت اور وفا کے جوہر دکھائے، امام حسین علیہ السلام نے صبر کی حدیں ختم کر دیں ایسا صبر پیش کیا لیکن جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو امام زین العابدین علیہ السلام کا صبر بھی عظیم معلوم ہوتا ہے یہ صبر و ضبط کی جنگ آپ نے کس طرح لڑی اس کا ثبوت یہ ہے کہ اہل حرم کو ایک رسّی میں باندھ کر اور اونٹ پر بٹھا کر لے جایا گیا آپ کو طوق خاردار اور بیڑیاں پہنائی گئیں درّے لگائے گئے، سکینہ کو طمانچے مارے گئے۔ یہ قربانی کیا کم تھی یہ صبر معمولی تو نہ تھا۔ یہ سب کچھ خاموش رہ کر برداشت کرنا بہت مشکل کام تھا، آپ اپنے آباؤ اجداد کی طرح امام معصوم، اعلم زمانہ اور افضل کائنات تھے۔ علماء کا بیان ہے کہ آپ علم، زہد، عبادت میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ آپ بہت بڑے عالم اور فقہ اہل بیت میں بے مثل و بے نظیر تھے۔

---

[1] ''الواعظ'' ۱۹۸۲ء محترمہ صالحہ عابد حسین، صفحہ ۱۳۱

فوج یزید کے کردار

ابن سعد: اس کا نام عمر تھا اس کے والد سعد بن وقاص تھے، لیکن ابن سعد نے کربلا میں جو امام کے ساتھ کیا اس سے اسے مسلمان عمر بن سعد نہیں کہتے، بلکہ ابن سعد کہتے ہیں کفر و اسلام سے قطع نظر اپنے باپ کے ناخلف ہونے کے اعتبار سے ابن سعد تقریباً ایسا ہی تھا کہ جیسا ناخلف نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ اپنے محترم باپ کے قابل احترام نام کو اس نے رسوا کیا، میدان کربلا میں یزیدی فوج کا سپہ سالار یہی ابن سعد تھا۔ اہلبیت اطہار علیہم السلام کا قتل عام ہوا۔ اور ابن سعد کی زیر قیادت ہوا اس کی فوج کے ہاتھوں ہوا۔

ابن زیاد: عبداللہ بن زیاد بڑا جری مضبوط اور سخت دل نوجوان تھا امیر معاویہ نے سب سے پہلے اسے خراسان کی ولایت سپرد کی تھی، جب یزید نے اسے بصرہ کے ساتھ کوفہ کا بھی والی بنا دیا تو پورے عراق کی حکومت اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اسی کے حکم سے امام حسین علیہ السلام کو گھیر کر کربلا لایا گیا اور اس کے حکم سے کربلا میں سب شہید کیے گئے۔

شمر ذی الجوشن: بہت بہادر اور ظالم شخص تھا یہ حضرت ام البنین کا بھائی تھا لیکن دولت اور ثروت کی خواہش میں ایسے زبردست گناہ اس نے کئے ہیں کہ اس ظلم کی مثال کہیں ملنا مشکل ہے۔ یہ یزیدی فوج کے پیدل دستے کا نگہبان یا سپہ سالار تھا اور روایت کے مطابق امام حسین علیہ السلام کا سر کند خنجر سے اسی نے کاٹا تھا اور امام حسین علیہ السلام کے خیموں میں آگ اسی نے لگائی تھی۔ یہ حضرت عباس علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کو امان دینا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے کہا کہ تجھ پر اور تیری امان پر خدا کی لعنت ہو اور امام حسین علیہ السلام کے لئے جان لٹا دی لیکن اس ظالم کا دل کہیں نہ بدلا۔

حرملہ بن کاہل اسدی: یہ بہت زبردست تیرانداز تھا اور اس نے حضرت علی اصغر

علیہ السلام کی گردن اور امام حسین علیہ السلام کا بازو تیر سہ شعبہ سے ایک مرتبہ میں چھید دیا تھا اور ننھے بچے پر بھی ترس نہ کھایا تھا اس سے بڑھ کر ظالم وشقی اور کون ہوگا، اسی نے امام حسین علیہ السلام کے فرزند عبداللہ کے ہاتھ کاٹے تھے اور شہید کیا تھا۔

یزید ابن معقل: یہ بھی جنگ جو اور ظالم شخص تھا، اس نے حضرت بریر ہمدانی پر پیچھے سے وار کر کے ان کو شہید کر دیا۔

عمرو بن حجاج: یہ دریائے فرات کی محافظ فوج کا سردار اور بڑا تجربہ کار سپاہی تھا۔

حصین بن نمیر: یہ یزیدی فوج کا سردار تھا، اور اس نے حضرت حبیب بن مظاہر کا سرتن سے جدا کیا تھا۔ اور جنگ میں خاص ذمہ دار تھا۔

سنان بن انس: اس نے کربلا میں بیحد ستم ڈھائے تھے قتل حسین علیہ السلام میں پورے طور پر شریک رہا تھا اس کے ایک کمر بند کے لئے حضرت امام حسین علیہ السلام کے دست مبارک کو توڑا تھا اور امام حسین علیہ السلام کو قتل کر کے فخر و مباہات کرتا تھا۔ اسی نے کربلا کی لوٹ میں امام حسین علیہ السلام کی زرہ اور انگوٹھی لی تھی۔

عمر بن صبیح صیداوی: اس نے امام حسین علیہ السلام کے لشکر کو نیزوں کی مار سے بری طرح زخمی کیا تھا اور عبداللہ بن مسلم کو شہید کیا تھا یہ بہت زبردست نیزہ باز تھا۔

ہانی بن شبث خضرمی: اس نے عبداللہ بن علی، عبداللہ بن عمیر کلبی اور عبداللہ بن حسن علیہ السلام کو قتل کیا تھا، اور لاشوں پر گھوڑے دوڑائے تھے۔

شیث بن ربعی: اس نے جنگ میں بہت اہم حصہ لیا اور تمام تکلیفیں امام مظلوم کو دیں اور امام کے چہرے پر تلوار لگائی تھی، یہ سرداران کوفہ میں سے ایک تھا، اور یہ اپنی جماعت لے کر کربلا پہنچا تھا۔

حصین بن تمیم: کوتوال شہر کوفہ تھا اسی کی سرداری میں قادسیہ کے ناکے پر جو باقی تین

ہزار فوج تھی وہ پوری کی پوری ابن زیاد کے حکم سے کربلا لے آیا تھا اور امام حسین علیہ السلام کے لشکر سے جنگ کی تھی۔

ان تمام بڑے بڑے سرداروں کو ابن زیاد نے کثیر فوج کے ساتھ کربلا بھیجا تھا اس پر امام حسین علیہ السلام کی اس قدر ہیبت طاری تھی کہ اس نے اتنے بڑے بڑے سردار اور ان کے لشکر صرف ۷۲ر اصحاب وانصار حسین کے مقابلے کے لئے جمع کر لئے تھے۔

حجاج بن ابی بکر: یزیدی لشکر کا سردار تھا، اور اس نے ہی امام حسین علیہ السلام کو کوفہ آنے کے لئے خط لکھے تھے۔

عمروہ بن قیس احمسی: یہ یزیدی فوج کے سوار فوج کا سپہ سالار تھا اور عمر ابن سعد کا غلام تھا۔

آحش بن مرقد: اس نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت۔ کے بعد ان کے جسم مطہر پر گھوڑے دوڑائے تھے۔

عبداللہ بن قطیعہ طائی: اس نے حضرت عون بن عبداللہ حضرت زینب کے بڑے صاحبزادے کو زخمی کیا تھا۔

باب دوم

اردو مرثیہ اور واقعہ کربلا کی اشاعت

الف

اردو میں مرثیہ نگاری کا ارتقاء (بیسویں صدی سے قبل)

ب

اردو مرثیہ (بیسویں صدی میں)

مرثیہ جدید رجحانات اور سیاسی سماجی اور معاشرتی مسائل کا اظہار

اردو میں مرثیہ نگاری کا ارتقاء

بیسویں صدی سے قبل

مرثیہ اردو زبان و ادب کا عظیم سرمایہ ہے اور یہ اردو کا واحد ادب پارہ ہے جس میں اردو کو فارسی زبان پر برتری حاصل ہے، مرثیہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔ مرثیے سے ہمیں جینے کا شعور و سلیقہ آداب وضع داری اور علم مجلس کے انداز سیکھنے کو ملتے ہیں۔

مرثیہ نے زندگی کے غم اندوز پہلو کی ترجمانی کی ہے اور ارسطو کے مطابق غم اندوزی کے بغیر شائستگی نفس امر محال ہے، مرثیے کی یہ غم اندوزی انسانی نفس کو مہذب اور شائستہ بناتی ہے، ادب نے مرثیے کے ذریعے انسانی زندگی کو سنوارا اور نکھارا۔ مرثیے کی اہمیت ہمیشہ بڑھتی ہی جائے گی مرثیہ ہماری تہذیبی قدروں کا ترجمان ہے۔ یہ بات تمام مورخ مانتے ہیں کہ اردو شاعری کو مرثیے نے وسعت وتنوع اور وقار بخشا ہے تقریباً تین صدیوں کے دوران یہ صنف ارتقا کے مختلف مدارج سے گذری ہے۔

ابتدائی دور کے مرثیے صرف ایک ضرورت اور مقصد کے لئے کہے گئے وہ مقصد مجلسوں کی زینت اور رونا رلانا تھا مرثیہ نگاری کی بنیاد دکن میں پڑی، گولکنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین نے اس کی ترقی اور سرپرستی خوب کی جس کی وجہ سے اردو مرثیے مقبول خاص و عام

ہوئے جس عہد میں شمالی ہندوستان میں مثل مشہور تھی کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو'' اس وقت دکن میں اردو شاعری کا معیار مرثیہ نگاری تھا۔ اس وقت جو شاعر اچھا مرثیہ گو ہوتا تھا اتنا ہی بڑا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ مرثیہ کے پھیلاؤ اور ارتقاء سے متعلق محترم سفارش حسین فرماتے ہیں:

''اردو مرثیے کا پھیلاؤ لگ بھگ ساڑھے چار سو برس پر ہے، جس کی ابتداء دکن سے ہوتی ہے پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں دکن شمالی ہند کے حملوں سے بڑی حد تک بچا رہا اس لئے اسے سیاسی یک سوئی نصیب رہی جس کے نتیجے میں ثقافتی کاموں کی طرف توجہ کرنے کا موقع مل سکا اور چیزوں کو چھوڑ کر صرف دکنی ادب ہی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دکنی کو جو اردو کی ابتدائی شکل ہے قبول عام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سرکاری درجہ بھی مل گیا'' [1]

اس کے بعد فارسی شاعری دربار تک پہنچی اور اپنا لباس بدلا اور دکنی زبان سے خود کو اس طرح سجایا کہ بادشاہوں اور امیروں کے دل کا بہلاوا بن گئی مگر عوام سے اس کا تعلق برقرار رہا۔ عوام کی زندگی میں عقیدت کے جذبے کی تسکین کو ایک اہمیت حاصل ہے، اس لئے ہر زبان کے ابتدائی ادب میں اس سرمائے کی فراوانی ہے اسی طرح دکنی بھی علاوہ دوسری قسموں کے مرثیے سے بھی مالا مال ہے۔ لغت میں مرثیے کے معنی کچھ بھی ہوں اردو میں اس کا عام مفہوم یہ مانا گیا کہ وہ نظم جو کربلا کے خونریز واقعہ پر لکھی گئی۔ اب اس مفہوم میں بہت پھیلاؤ آ گیا ہے۔ اب تک جس دکنی مرثیے کا پتہ چلا ہے وہ قطب شاہ کا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید علی حیدر صاحب نے تحریر کیا ہے

''سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا مرثیہ نگار ہے جس کے مرثیہ دو بیتی سے

---

[1] اردو مرثیہ، صفحہ ۶۴، سفارش حسین۔

شروع ہوئے جن میں تین مصرعے بند کے اور ایک مصرعہ ٹیپ کا ہوتا تھا۔

ایک نمونہ ملاحظہ ہو"۔

یک پوت کو دیئے زہر   یک پوت پہ کھینچے خنجر

کافر کئے کیسے قہر   یو زخم کاری ہائے ہائے[1]

لیکن سولہویں صدی کے پہلے نصف میں اور اس سے قبل مرثیہ نہیں لکھا گیا ایسا ممکن نہیں مگر مرثیہ لکھا تو گیا ہے سامنے نہیں آسکا۔ اس شک کو تقویت اس حقیقت سے بھی پہنچتی ہے کہ سولہویں صدی کے پہلے نصف میں وہ مجلس کے انداز کی ایک طویل نظم کا پتہ چلتا ہے جس کا نام "نوسرہار" اور مصنف شیخ اشرف ہیں۔ اٹھارہ سو شعر کی اس طویل نظم میں دس باب چھبیس فصلیں ہیں۔ آخر میں سنہ تصنیف بھی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

بازار جیوں کی تاریخ سال   بعد از ہجرت نبی حال

نو سو ہوئے اکلے نو   یہ دکھ لکھیا اشرف نو

نا نو دھریا اس نو سرہاد   لیکن یہ سب دکھ کا بہار

انکھیا انجھو دکھ دھو   لکھیا میں یہ دکھ رو رو

یک یک بول یہ موزوں آن   تقریر ہندوی سب بکھان

لیکن مثنوی نوسرہار کو مرثیہ نہیں کہا جاسکتا اب قدیم ترین مرثیہ کی مثال تو مل نہیں سکی۔ اس لئے ہمیں یہی ماننا ہوگا کہ سترہویں صدی عیسوی میں مرثیے کہنے والوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے، جس میں ظل اللہ، عبداللہ، قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، شاہی، نصرتی، اور مرزا بیجاپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

محمد قطب شاہ ظل اللہ محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا تھا۔ اور داماد تھا۔ عبداللہ قطب شاہ ظل

---

[1] ڈاکٹر سید علی حیدر، مرثیہ شناسی، صفحہ ۱۳، ناشر سید علی حیدر، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۸۴ء

اللہ کا بیٹا تھا۔ نصرتی، شاہی کا مصاحب اور اس کے دربار کا بلند مرتبہ شاعر تھا۔ مرزا بیجاپوری محض مرثیہ گو شاعر تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے نصف میں عشقی، ہاشمی، شاہ قلی خاں شاہی، کاظم، اور نوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عشقی ابوالحسن تانا شاہ گولکنڈہ کے آخری سلطان کا تخلص ہے۔ ہاشمی بیجاپور کا رہنے والا تھا اور پیدائشی اندھا تھا۔ اس کو ریختی کا موجد کہا جاتا ہے۔

اس صدی میں مرثیے میں دو خاص تبدیلیاں ملتی ہیں، ایک پیکر اور دوسری بیان میں تفصیل۔ اس صدی میں خوشنود بیجاپوری، شاہ راجو سید یوسف حسینی وغیرہ بھی قابل ذکر مرثیہ گو شاعر ہیں۔ ان کے علاوہ لطیف غلام علی خاں سیوا بیجاپوری، رام راو ساکن گولکنڈہ، افضل محمد افضل، شفیع، مشہور، شرف النساء، بحری قاضی محمد بیجاپوری وغیرہ مرثیے گو شعراء کا بھی نام کافی اہم ہے۔

ماننا ہوگا کہ قلی قطب شاہ ہی پہلا مرثیہ گو شاعر ہے وجہی اور قطب شاہ دونوں معاصرین ہیں ان ہی کے مرثیے قدیم ترین مرثیے کے بطور موجود ہیں۔ غواصی جو کہ وجہی کا ہم عصر اور ہم پلہ شاعر تھا گو عمر میں اس سے چھوٹا تھا اپنے ایک مرثیے میں کہتا ہے

غم سوں پکڑ بیت الحزن یعقوب نے کھویا نین
شیریں کے بھانے کوہ کن اپ جیو گنوایا ہائے ہائے

سترہویں صدی عیسوی میں مرثیے کہنے والوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے اس صدی میں زبان نے خاصی ترقی کی۔ اس کے پہلے نصف میں ظل اللہ، عبداللہ، قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، شاہی، نصرتی اور مرزا بیجاپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے محرم کے مراسم کو اس خوبی سے رائج کیا کہ تمام لوگ ہر قوم و مذہب کے لوگ ان ایام کو خاص اہتمام سے منانے لگے۔

"محرم میں مراسم عزاداری کی تفصیل حدیقت السلاطین میں ملتی ہے۔ جو عبداللہ

قطب کے عہد کی تصنیف ہے۔[۱]

ان مراسم کی حیثیت عوامی تقریبوں کی سی تھی سال بھر لوگ ان کا اہتمام کرتے تھے۔ بادشاہی محل کے علاوہ شاہی محل اور دوسرے امراء کے یہاں بھی عزاداری ہوتی تھی جس میں لوگ بیان شہادت کرتے تھے۔ کچھ مرثیے پڑھتے تھے مرثیہ خوانی میں کچھ لوگ اپنے کہے ہوئے شعر پڑھتے تھے اور کچھ دوسروں کے۔ اس طرح داد و تحسین حاصل کرنے اور شاعرانہ انداز بیان کی مہارت کے اظہار سے اپنے کو نمایاں کرنے کے لئے کچھ لوگ مرثیہ کہنے لگے اس کے علاوہ اس میں ایک پہلو عاقبت درست کرنے کا بھی تھا۔ اس سلسلے میں محترم ڈاکٹر سید محی الدین زور صاحب فرماتے ہیں

> ''محرم کے مراسم کو محمد قلی نے اس خوبی سے رائج کیا کہ شیعوں کے علاوہ سنیوں اور ہندوؤں نے بھی ان ایام کو خاص اہتمام سے منانا شروع کیا اور خاص کر محرم کے ابتدائی دس بارہ روز تک تو ایسی مصروفیتیں رائج ہو گئیں جن میں سلطنت قطب شاہیہ کا ہر متنفس حصہ لیتا تھا''۔[۲]

اس سے پہلے ہم نے تحریر کیا کہ ثبوت کے طور پر مرثیے فراہم نہ ہونے کی وجہ سے قلی قطب شاہ کو ہی پہلا مرثیہ گو شاعر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بات پوری طرح ثابت ہے۔ اس لئے ہم ڈاکٹر رشید موسوی کی رائے کا بھی ذکر کریں گے۔ مثلاً ان کے مطابق

> ''دکن میں مرثیہ کے اولین نمونے ہم کو وجہی اور محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔ وجہی اور محمد قلی دونوں معاصر تھے اور دونوں نے مرثیہ بھی لکھے ہیں

۱۔ اردو مرثیے کا ارتقاء، صفحہ ۴۷، ڈاکٹر مسیح الزماں، ۱۹۸۳ء۔ اتر پردیش اردو اکادمی

۲۔ مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ، صفحہ ۴۵، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔

ان دونوں میں مرثیہ کس نے پہلے لکھا اس کے طے کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی تاریخی بنیاد ایسی نہیں کہ جس کی بنیاد پر ہم کسی ایک کو اولیت کا شرف بخشیں'' [۱]

محرم کے سلسلہ میں ہر سال محمد قلی متعدد مرثیے لکھتا تھا جو مختلف موقعوں پر پڑھے جاتے تھے۔ قطب شاہ کے عہد میں مرثیہ گوئی کا اظہار رنج وملال کے لئے استعمال کیا گیا، انہیں حدود میں قلی قطب شاہ نے اپنا زور طبع دکھایا۔

کالا کیا کسوت مکا دیکھو اما مان دوک تھے
ظلمات بی کالا ہوا اس دکھ تے بھاری وائے وائے
آسماں پیچھے جالا ہوا سورج اگن والا ہوا
چندر سو جل کالا پڑا ہے دکھ اپاری وائے وائے
پنکھی لٹے ہیں سب پر ان رو رو بھرائے سمندراں
چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری وائے وائے

بہر حال قطب شاہیوں کے بعد عادل شاہی حکومت میں بھی محرم کے مراسم اسی طرح اہتمام سے ادا کئے جاتے رہے، عادل شاہی سلطنت کے اس دور میں جن مرثیہ گویوں کا کلام ملتا ہے، ان میں مرزا کی شخصیت سب سے نمایاں ہے، اس عہد کے نمایاں شعراء کا ذکر کرتے ہوئے کاظم علی خاں نے تحریر کیا ہے:

''اردو مرثیہ کے تاریخی وتدریجی ارتقاء کے باب میں اول اول ہمیں مرثیہ دکن میں ملتا ہے، اس بحث میں ہمیں نہیں پڑنا چاہئے کہ مرثیہ کی ابتدا شمالی

---

[۱] دکن میں مراسم عزاداری اور مرثیہ نگاری، ڈاکٹر رشیدہ موسوی، ستمبر ۱۹۷۰ء، مجلد عثمانیہ دکنی ادب نمبر، صفحہ ۱۱۸، ناشر: نیشنل بک ڈپو چارکمان حیدر آباد۔

ہند سے ہوئی یا جنوبی ہند سے لیکن یہ بات سب ہی مانتے ہیں کہ اردو مرثیہ کے ابتدائی دور میں جنوبی ہند کی خدمات بڑی اہم ہیں۔ سلاطین دکن نے مذہبی اور ادبی ضروریات کے پیش نظر خود بھی مرثیے کہے اور مرثیہ گویوں کی ہمت افزائی و سرپرستی بھی کی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں دکن میں اردو مرثیہ کے لئے اہم خدمات ہوئیں۔ اردو مرثیہ کے میدان میں اس دور میں ہاشم، رام راؤ سیوا، کاظم، نصرتی، غواصی، نوری اور مرزا کے نام قابل ذکر ہیں'' [1]

دکنی مرثیہ نگاروں کے متعلق ہم شارب ردولوی صاحب کے خیالات یہاں پر پیش کریں گے

''دکنی مرثیہ نگاروں کے یہاں صنف مرثیہ کے مزاج و آہنگ اور اس کے موضوعات کی نوعیت اور فنی لوازم کا ایک مخصوص تصور موجود تھا۔ وہ مرثیہ نگاری کے سلسلہ میں ''حسن فروغ شمع سخن'' کو دل گداختہ کی دین تصور کرتے ہیں، دکنی شعراء مرثیہ نگاری کے لئے سوز وگداز، اثر آفرینی، طبعی مناسبت اور عقیدت مندی کو ضروری سمجھتے ہیں، دکنی شعراء کے یہاں یہ صنف گریہ و بکا کے مذہبی مقصد کے تحت پیش کی جاتی تھی، شعری محاسن کے اظہار یا نمود فن، استادانہ کمال کے مظاہرے اور عرض ہنر کی غرض سے نہیں، دکنی شعراء مرثیہ کو ثواب دارین حاصل کرنے کا وسیلہ تصور کرتے ہیں اور اسے ''خون جگر'' سے تحریر کرنا چاہتے ہیں۔ [2]

---

[1] اردو مرثیہ اور مرزا دبیر، از: کاظم علی خاں

[2] اردو مرثیہ، صفحہ ۲۸، مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی۔

دکنی مرثیوں کے بارے میں بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں تسلسل کا فقدان ہے جس کا ایک سبب ہے غزل کی ہیئت کا استعمال کرنا، بعض دکنی شعراء نے تسلسل کی طرف خاص توجہ کی ہے، بیجاپور کے مرثیہ نگاروں کے مقابل گولکنڈہ کے مرثیہ نگاروں کے کلام میں تسلسل کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں شارب ردولوی کہتے ہیں:

''بیجاپور کے مرزا نے مرثیہ میں بعض اضافے کیے، اس نے موضوعات کی پیشکش میں بڑی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے، مرزا کے طویل مرثیوں کے تمہیدی حصے میں پس منظر کے طور پر مرثیہ کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے بعض منتخب مضامین بھی نظم کیے گئے ہیں'' [1]

اب ہم مرزا کی شاعری کے حوالے سے اس دور کی دکنی مرثیہ نگاری پر روشنی ڈالنے کے لئے ڈاکٹر مسیح الزماں کی تحریر پیش کر رہے ہیں:

''مرزا کا زمانہ قلی قطب شاہ کے تقریباً پچاس سال بعد کا ہے، اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں، علی عادل شاہ ثانی کے دور حکومت (۱۰۶۸-۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۵۷-۱۶۲۷ء) میں اس کے انتقال کا حال تفصیل سے ملتا ہے'' [2]

مرزا نے ساری عمر مرثیہ گوئی کی، اس نے کبھی کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ نہیں لکھا، مرزا کے مرثیوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا تسلسل ہے، مثال کے طور پر نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

کہوں قصہ شجاعت کا
سو قاسم کی شہادت کا

---

[1] اردو مرثیہ، صفحہ ۲۹، مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی

[2] اردو مرثیہ کا ارتقاء ابتدا سے انیس تک، صفحہ ۶۱، ڈاکٹر مسیح الزماں، ۱۹۸۳ء اتر پردیش اردو اکادمی

یزیدیاں کی عداوت کا
کرو زاری مسلماناں

حضرت قاسم کے مرثیہ کے بعد حضرت حر کے سلسلے میں مرثیہ کے بند ملاحظہ فرمایئے

یک گھڑی چندر نمن پائے ہیں جب دونوں شرف
ایک چلے سورج نمن اس رین جیسے دل طرف
حر تب آ اس رن پہ ایسا ہانک ماری ہول ناک
گئی گگن ساتواں اپر جس ہانک کی ہیبت کی دھاک
یوں کہے ہیں اوہوں شیر نر کہ میرے سر پہ آج
مصطفیٰ کے نور دیدہ کی شفقت کا ہے تاج
آج اگر رستم کو میں اپنا مقابل پاؤں گا
تو اسی باعث منے ملک عدم میں بھاؤں گا

مرزا پہلے مرثیہ گو ہیں جنہوں نے شوکت الفاظ اور زور بیان سے مرثیہ کو ادبی حیثیت سے بھی بلند کیا۔ سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں عشقیؔ، ہاشمیؔ، شاہ قلی خاں شاہیؔ، کاظمؔ، اور نوریؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عشقیؔ ابوالحسن تاناشاہ گولکنڈہ کے آخری سلطان کا تخلص ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن میں ایک بیاض میں اس کا مرثیہ ہے۔ اسی عہد کا ایک شاعر ہاشمی بیجاپور کا رہنے والا تھا اور پیدائشی اندھا تھا اس کو ریختی کا موجد کہا جاتا ہے، اس کی زبان بہت صاف اور بیان ہلکا پھلکا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مسیح الزماں فرماتے ہیں:

''ہاشم علی نے اپنی تمام عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور اپنے مرثیوں کو ردیف وار ایک مجموعے میں جمع کر کے اس کا نام دیوان حسینی رکھا''۔[1]

دیوان حسینی میں دو سو اڑتیس مرثیے ہیں جس کا قلمی نسخہ اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ نصیر الدین ہاشمی فرماتے ہیں:

''اس کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بصورت بیاض موجود ہے اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہاشم علی ایک باکمال مرثیہ گو تھا''۔[2]

ہاشم علی کے مرثیے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت دکن سے باہر بھی عزاداری کا رواج عام ہو چکا تھا، ہاشمی کی مرثیہ نگاری صرف مذہبی جذبے کی تسکین نہیں ہے بلکہ شاعرانہ حسن کی بہترین مظہر بھی ہیں اس کی ادبی کاوشیں، ان کے یہاں تخیل کی بلندی اور مشاہدہ کی باریکی کے ساتھ ساتھ ادبی کارکردگی بھی نمونہ کے طور پر دیکھئے:

لے چلے شہ کا کنوارا یا رسولؐ
یہ تمہارا تھا پیارا یا رسولؐ
یہ جنازے ساتھ جاتے سب محبؑ
یا حسینؑ کا کرتے نعرہ یا رسولؐ

آج تابوت شہ لے جاتے ہیں
سارے طفلاں یتیم جاتے ہیں

---

[1] مسیح الزماں، اردو مرثیہ کا ارتقاء، صفحہ ۷۶، ۱۹۸۳ء، اتر پردیش اردو اکادمی۔
[2] نصیر الدین ہاشمی، صفحہ ۴۹۳، دکن میں اردو ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء جنوری مارچ

دل بند مصطفیٰ کا تابوت لے چلے ہیں
فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں
سلطان دو جہاں سردار اولیا کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

اٹھارہویں صدی

اٹھارہویں صدی دکن میں مرثیہ کے عروج کی صدی ہے، اس دور میں ہر دکنی شاعر نے مرثیہ ضرور کہا ہے۔

اس صدی کے پہلے نصف میں مرزا گولکنڈہ، درگاہ قلی خان درگاہ، ہاشم برہان پوری، امامی، رضا گجراتی اور عزلت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اس صدی کے دوسرے نصف میں غلامی، ماتمی، تمنا، زرہ، اور قیس قابل ذکر ہیں۔ اس صدی میں زبان دھل منجھ گئی بلکہ اس پر اردوئے معلیٰ کا روغن چڑھ گیا تھا۔ ان شعراء کے علاوہ اس عہد میں روحی حیدر آبادی بھی اٹھارہویں صدی کا مرثیہ گو شاعر ہے۔

غلامی گجراتی، شاہ فضل علی اورنگ آبادی، سید غلام محمد گجراتی، حیدر حیدری، میر حیدر شاہ دکنی، کمتر شاہ دکنی، آگاہ مولوی محمد باقر، ایمان شیر محمد خاں حیدر آبادی، قیس محمد صدیق حیدر آبادی، جلیل عبدالجلیل، ضیاء دکنی، معزز خاں دکنی، محمد عظیم دکنی، اشرف الدولہ دکنی، اعجاز دکنی، نجفی ہوشدار دکنی، ندرت میر نجف علی خاں دکنی، مسکین دکنی، اکبری، اصغر، ابوتراب، افصح، الفی، تحقیقی، جلیل، حمیدیؔ، داس، سرور، سمیں، سلیمی، صابر، صوفی، صالح، صفی، طاہر، عین الدین، علی، عطا، عز، مصلح الدین موسیٰ، مسیحا، محسان، مکھن، مستقیم، غمگیں، فتح اللہ، گلزار، لطف،

نسیم یہ سب اٹھارہویں صدی کے مرثیہ گو ہیں۔ لیکن انیسویں صدی کے اوائل تک یہ لوگ موجود تھے۔

قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے بعد دکن پر مغلوں کی حکومت ہوگئی اورنگ زیب نے دکن کی فتح کے بعد اپنا صدر مقام اورنگاہ آباد کو بنایا۔ اور ساری ادبی رونق بھی اورنگ آباد و گولکنڈہ آگئی۔ ۱۶۸۷ء سے ۱۷۲۴ء تک دکن پر مغلوں کا تسلط رہا۔ اس عہد میں اورنگ آباد میں سید شاہ حسن زرقی، سید اشرف شاہ ندیم، حسینی ندیم، اور یتیم احمد وغیرہ مشہور ہوئے، یہ لوگ غزل اور قصیدہ کی شکل میں مرثیے کہتے رہے، لیکن یتیم احمد کے یہاں مربع کی شکل میں مرثیے ملتے ہیں، ان کا زمانہ کم وبیش سودا کا زمانہ ہے۔

آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد دکن میں مغلوں کا اثر ونفوذ ختم ہوگیا۔ اور یہاں مرثیے خوانی کی قدیم روایات کے ساتھ ساتھ نئی روایتیں بھی نشو ونما پانے لگیں۔ ۱۷۶۲ء سے ۱۸۰۳ء تک نظام علی خاں اور آصف جاہ کے زمانے میں ارسطو جاہ دیوان مقرر ہوئے، ان کی سرپرستی میں بہت سے مرثیہ نگار نمایاں ہوئے ان میں درگاہ قلی خاں درگاہ، ہمت علی خاں ہمت، کاظم علی خاں کاظم، اور عباس علی خاں احسان، کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کی شکل میں بھی مرثیے کہے ہیں لیکن اس عہد سے مسدس کی طرف رجحان بڑھنے لگا، درگاہ قلی کا زمانہ اور ہاشم علی کا زمانہ تقریباً ایک ہی دور تھا لیکن درگاہ قلی کا قیام دہلی میں تھا، انہیں دہلوی مرثیے نے اپنا گرزویدہ بنالیا تھا وہ دکنی مرثیہ کے انداز سے ہٹ کر دہلوی انداز میں مرثیے لکھنے لگے، ان کے یہاں تسلسل کا وہ دکنی مرثیہ گویوں کا انداز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر

پیاس سیں بے تاب جان بوتراب
آٹھ دن میں نہیں ملا اک قطرۂ آب

دیکھ عباسؑ علیؑ یہ اضطراب
مشک بھر کر لے چلے مثل سحاب
بے مروت ہائے بھورے کر عتاب

انیسویں صدی

اس صدی میں رضا نواب حسین دوست خاں مدراسی، ناجی سید اصغر حسین حیدر آبادی، رشید محمد شکر اللہ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، انیسویں صدی عیسوی میں دکنی مرثیہ گوئی کا چراغ گل ہوتا معلوم ہوتا ہے، مرثیہ گوئی کا مرکز اب ثقل گولکنڈہ اور بیجاپور سے اورنگ آباد منتقل ہوا اورنگ آباد سے گجرات اور برہان پور اور اب شمال میں دکن میں مرثیہ گوئی ''نقش و نگارہ طاق نسیاں'' ہونے لگی۔ اور اس دور میں دکن میں مرثیہ نے سنبھالا لیا لیکن اس زمانے میں مرثیہ گوئی شمالی ہند کی مرثیہ گوئی کا ضمیمہ کہی جا سکتی ہے اور بس۔

اشہر مرزا غلام سجاد حیدر آبادی، مسرور میر محمد حیدر آبادی، الم ڈاکٹر میر مہدی حسین حیدر آبادی، جعفر مرزا علی جعفر حیدر آبادی، مہدی نواب میر محمد مہدی حید آبادی، شاد مہاراجہ کشن پرشاد حیدر آبادی وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ اب مرثیہ کا رخ شمالی ہندوستان کی طرف ہو گیا تھا۔ غالباً قائم دہلوی پہلا مرثیہ گو شاعر ہے، لیکن قائم سے بھی قبل روشن علی سہارنپوری نے روضۃ الشہداء کے انداز کی ایک طویل نظم عاشور نامہ کے نام سے لکھی یہ غالباً ۱۱۰۰ھ کی تصنیف ہے، شاہ حاتم، آبرو، سعادت یک رنگ اور عاصمی اس دور کے قابل ذکر شاعر ہیں۔ میر محمد مہدی مسکین میر امامی، میر عاصمی، میر آل علی، درخشاں، حزیں، گدا، سکندر، صبر، گمان، قادر کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں اور دوسرے دور میں سودا، میر سکندر، وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

دہلی اور آگرہ کے بعد مرثیہ اودھ منتقل ہو گیا اور اس دور میں خلیق، ضمیر، دلگیر، فصیح کے مقابلے میں خلیق اور ضمیر کے نام زیادہ اہم ہیں۔

اس کے بعد کے دور میں انیس و دبیر کا دور کہا جاتا ہے، اور تیسرا نام میر عشق کا بھی آتا ہے۔

ان کے بعد نفیس، وحید، کامل، اوج، اور تعشق نمایاں ہیں۔

رشید، علی میاں کامل وغیرہ کے بعد آخر میں شاد عظیم آبادی، عارف لکھنوی، اور شمیم امروہوی وغیرہ کا دور ہوا۔ انیسویں صدی میں دکن میں مرثیہ نگاروں کے اہم نام نظر نہیں آتے، اب یہ رونق دہلی میں بڑھ رہی تھی، دلی میں اردو شاعری دکن سے آئی لیکن دلی والوں نے دکنی شعرا کی تقلید نہیں کی اور اپنی الگ راہ بنائی۔ دہلی میں محمد شاہ کے عہد سے شاعری اور مرثیہ گوئی باقاعدہ طور پر شروع ہوئی ہے۔ لیکن بعض محققین کے مطابق ان سے بھی پہلے بہت سے شعرا گذر چکے تھے۔ ان میں زیادہ تر مرثیہ گو ہیں ان کی زبان میں ہندی اور فارسی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کے کلام کا نمونہ دستیاب نہ ہو پانے کی وجہ سے ہم نمونہ کلام پیش نہیں کر سکتے اس لئے محمد شاہ کے دور سے باقاعدہ مرثیہ گوئی شروع ہوئی۔ یہی بات قابل قبول ہے اور مثبت بھی ہے۔

> ''دکن سے مرثیہ شمالی ہندوستان آیا شروع میں شعراء نے اس صنف پر توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا لیکن پنجابی شاعر خلیفہ محمد علی سکندر کی کامیابی دیکھ کر دوسرے شعراء نے بھی اس صنف پر توجہ دینی شروع کی''[1]

سکندر کا نام مرثیہ کے میدان میں بہت زیادہ ہوا۔ اور دہلی میں انہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ حالانکہ وہ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مرثیہ کے لئے مسدس ہی کا

---

[1] تذکرہ مرثیہ نگاران اردو، جلد دوم، صفحہ ۳۰، مرزا امیر علی بیگ جونپوری، فخر الدین علی احمد میموریل سوسائٹی، اتر پردیش، دانش محل، امین آباد پارک، لکھنؤ

انتخاب کیا اور آگے چل کر مرثیہ کے لئے مستقل شکل مخصوص ہوگئی اور سکندر کی شہرت سے متاثر شعراء کا رجحان مرثیہ کی طرف بڑھا، اور جہت لوگ مرثیہ کہنے لگے، لیکن اس عہد میں فارسی اور ہندی ملی جلی زبان استعمال کی گئی اور آگے چل کر محمد شاہی عہد کے شاعروں نے یہ ملی جلی زبان ترک کردی اور عام زبان یعنی عوامی زبان میں مرثیہ کہنا شروع کیا۔ اور واقعات کربلا سے متعلق روایات واقعات کو بھی نظم کرنے لگے۔

محمد شاہی عہد میں معروف و ممتاز مرثیہ نگار نظر آتے ہیں۔ اس عہد کے بعض نامی شاعروں نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ ان میں علی قلی ندیم شاہ، مبارک آبرو، مصطفیٰ خاں یک رنگ، شاہ حاتم، سراج الدین علی خاں آرزو، قابل ذکر ہیں۔ کاظم علی خاں نے تحریر کیا ہے:

''میر امانی، میر عاصمی، میر آل علی، درخشاں، مسکین، حزیں، یک رنگ، غمگین، گدا، صبر، گمان، قادر کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں'' [1]

خان آرزو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے اور اردو شاعری کی تحریک سے متاثر ہوکر کبھی کبھی اردو میں شعر کہہ لیتے تھے۔ خان آرزو کا مرثیہ جو کہ دستیاب ہوا ہے وہ مربع نہیں ہے بلکہ مسدس ہے بند دیکھئے:

تم کو خبر ہے آیا محرم اے مومناں
دیکھو قمر شفق میں ہوئے غم سے خونفشاں
اندوہ گیں زمین ہے غمناک آسماں
کیوں کر کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ہو رواں
یہ کیا ستم ہے مومنوں روؤ بہ شور شین
گھوڑوں پہ شامیاں ہیں علم پر سر حسینؑ

---

[1] اردو مرثیہ اور مرزا دبیر، کاظم علی خاں، صفحہ ۱۵

اسی طرح مسکین کے مرثیہ بہت رواں اور مسلسل واقعات کا بیان لئے ہوئے ہیں، مثلاً نمونہ دیکھئے:

کہ اے شاہ ٹک اپنے گھر کی خبر لے
سروں کی خبر لے چدر کی خبر لے
جلے گھر کی اجڑے نگر کی خبر لے
ذرا دیکھ کیا ہے مری بے وقاری

آبرو کے ہم عصر مصطفیٰ خاں یک رنگ تذکرہ نگاروں کے مطابق آرزو کے شاگرد تھے مگر مصحفی کہتے ہیں آبرو سے مشورہ سخن کرتے تھے مگر کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ ان کے تین شعر نکات الشعراء میں نقل کئے گئے ہیں:

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا
گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ
دھو ہاتھ زندگی ستی مہمان کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ
ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا

اور محب ممتاز مرثیہ گو ہیں انہوں نے مسدس کی طرف قدم اٹھایا نمونہ دیکھئے:

موت نے کی عرض سرور ذوالجناح تیار ہے
سر کٹانے اب چلو رن میں تمہاری بار ہے
تب کہا شہ نے سکینہ سوئی یا ہشیار ہے
لاؤ مل لے بے کس اب ہے جدائی کی گھڑی

ملنا ہے یہ آخری کر لے مجھ سے بین
کل روئے گی لاڈلی کر کے یا حسینؑ

محمد شاہی عہد کے نامی مرثیہ نگار اسد یار خاں انسان، فضل علی خاں فضلی، میر عبداللہ مسکین، حزیں، غمگین، جلیل، خواجہ برہان الدین آثمی، ہوشدار بہت معروف وممتاز ہیں۔ اسی عہد کے مرزا علی ندیم مرثیہ اور سلام کہنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اشرف علی خاں فغاں کو انہیں سے تلمذ حاصل تھا ان کے مرثیوں کو بہت شہرت ملی۔ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ نمونہ کلام ندیم

یا علیؑ آ نجف سے رن دیکھو — شہ کا پر خوں ہے سب بدن دیکھو
پیرہن شہ کے تن پہ جو تھا — اب ہوا ہے سو وہ کفن دیکھو
نئی نسبت میں شاہ قاسمؑ کا — سر جدا تن سے یا حسینؑ دیکھو

اس دور میں نظم کی ہر شکل میں مرثیہ کہا گیا یہاں تک کہ بحر طویل بھی نہ بچی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور مرثیہ کے پیکر کی تلاش کا تھا اسی لئے نظم کی ہر شکل کو آزمایا گیا اسی دور کے ایک اور معروف شاعر کا ذکر یہاں پر ہے ان کا نام ہے میر امانی خواجہ آثمی بیٹے تھے صرف مرثیہ گو تھے وہ مرثیہ بغیر لحن کے تحت اللفظ پڑھتے تھے غالباً میر امانی تحت اللفظ نوائی کے موجد تھے۔

مربع مرثیہ کا نمونہ

جفا کے دشت میں تشریف جوں ہی لائے حسینؑ
رکاب زیں سے زمیں پر اتر جو آئے حسینؑ
سلام کر کے پکاری وہیں قضائے حسینؑ
کرم کیا مرے گھر میں تم آج آئے حسینؑ

ان سب کے کلام میں مختلف بحریں استعمال کی گئی ہیں تاکہ جس کو بہتر اور موثر پایا

جائے اسے اس صنف کلام کے لئے چن لیا جائے، اس دور کے ختم ہوتے ہوتے مربع اور مسدس مرثیہ کی مرغوب شکلیں رہیں مگر زیادہ جھکاؤ مسدس ہی کی طرف رہا۔

اس عہد کے اہم مرثیہ نگار ظہور علی ظہور، فضلی کے بھائی کرم علی، محمد نعیم دہلوی شمس الدین فقیر دہلوی، اعلیٰ اعلیٰ، نذر علی خاں گماں دہلوی وغیرہ کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ دور مرثیے کے پیکر کی تلاش کا دور تھا اسی کے ساتھ ساتھ زبان کے اعتبار سے بھی بہت اہم دور تھا۔ یک رنگ، سودا، میر، حیدری کی زبان کے نمونوں سے پتہ چلتا ہے کہ زبان سے فارسی اثر کم ہو رہا تھا مرثیہ میں اس کا کم ہونا ضروری تھا، مرثیہ کے لئے ایسی زبان موزوں ہو سکتی تھی جو عام طور پر آسانی سے سمجھی جا سکے اور جسے سن اور سمجھ کر لوگوں کے دلوں پر سیدھا اثر ہو اس دور میں مرثیہ گویوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ سودا کے عہد تک مرثیہ، غزل اور قصیدہ کی ہیئت میں یا مربع کہا جاتا تھا۔ دہلی کے جو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں ان میں مسدس کی ایجاد سودا و سکندر سے ہوئی ہے۔ سودا نے دہلی میں ہی مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا لیکن فرخ آباد میں وہ اسی صنف سخن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اردو مرثیہ نگاری میں سودا سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بالکل واضح اور صاف راستے کا تعین کیا، اور مرثیہ کی ہیئت میں مختلف تجربات کئے ان کے ہاں منفرد اور مستزاد، منفردہ، مثلث، مستزاد، مربع، مربع مستزاد، مخمس ترکیب بند مخمس، ترجیع بند مسدس، مسدس ترکیب بند دہرہ بند مرثیہ دوازدہ مصرع معہ دہرہ وغیرہ کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں مرثیہ کے اجزائے ترکیبی بھی ملتے ہیں، اور موضوعات بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے سراپا تمہید رخصت وغیرہ کی ابتدا کی اور مرثیہ کو مسدس کی شکل میں مقبول بنایا اور ایک ہوشیار صناع کی مانند اسے طرح طرح کے سانچوں میں ڈھالا

غم دل پہ خلائق کے عوض منڈوے کے چھایا

سر شہ کا جگہ تیل کے نیزے پہ چڑھایا

دلہن کو بدل جوڑے کے رنڈسالہ پہنایا
ہے خلعت نوشہ کے لئے فکر کفن کا

انہوں نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن ہر شکل میں مرثیہ کہا یہ بات اور ہے کہ سودا کے مرثیے مقبول نہیں ہوئے اور انہوں نے کہا

جو مجھ سے کہتے ہیں مرثیہ سوا کچھ اور
وہ چاہتے ہیں زباں سے مری سنا کچھ اور

سودا کا معرکہ میر گھاسی سے خوب خوب چلا اور سودا کے ساتھ میر بھی مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ثابت کیا کہ اردو شاعری کی سب سے اہم صنف سخن مرثیہ ہے، میر نے مرثیوں میں گریہ خیز پہلو پیدا کئے ان کے یہاں مقصد شہادت کا احساس بہت ہے۔ انہوں نے مرثیہ کو وزن اور ادبیت عطا کی۔

میر نے مرثیوں میں اپنے عہد کے رسوم اور معاشرت کے عناصر شامل کئے

فلک تو نے عجب چو پڑ بچھائی
سمجھ میں چال تیری کچھ نہ آئی
امام دیں نے جاں بازی لگائی
موا لیکن نہ اپنے جی کو ہارا

اگر آپ ہو جائے سارا جہاں — نہ معلوم ہو کچھ زمیں کا نشاں
سمجھے بوند پانی نہ دیں اے جواں — مگر تو اطاعت کرے لا کلام
ہر چند شاعری میں نہیں ہے تری نظیر — اس فن کے پہلوانوں نے مانا تجھی کو میر
پر ان دنوں ہوا ہے بہت تو ضعیف و پیر — کہنے لگا جو مرثیہ اکثر بجا کیا

اس عہد میں سب سے زیادہ شہرت مرثیہ گو حیثیت سے سکندر کو ملی دیگر شعراء میں بے

نوا دہلوی، میر سوز، میر محمد تقی گھاس، اشرف علی خاں فغاں، وغیرہ کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔

نواب مہربان خاں رند، قیام الدین قائم، فضل علی ممتاز، مرزا احسن، شیخ شرف الدین شرف، کے مرثیوں کے نمونے ملتے ہیں۔ یہ لوگ سودا کے شاگردوں میں سے تھے۔ فضل علی ممتاز کا نمونہ کلام

جب دشت میں شبیر کا لشکر گیا مارا حر قتل ہوا قاسم مضطر گیا مارا
اور نہر پہ عباس دلاور گیا مارا اکبر گیا مارا علی اصغر گیا مارا
کیا دکھ شہ لولاک کے پیارے پہ پڑے تھے
دروازۂ خیمہ پہ کمر پکڑے کھڑے تھے

ان کی زبان سادہ وسلیس ہے۔

میر حسن، شیر علی افسوس، قیام الدین قائم، قلندر بخش جرأت اور حیدر بخش حیدری اس عہد کے قابل ذکر مرثیہ گو شاعر ہیں۔ جعفر علی حسرت کا نمونہ کلام

جب شب عاشور آئی سخت منزل گاہ میں
فال دیکھی شاہ نے اس دم کلام اللہ میں
کر تیمّم پہلے ثابت ہو خدا کی راہ میں
حسن نیت دل سے کر اللہ کی درگاہ میں
جوں ہی کھولا مصحف اللہ کو کر سرنگوں
نکلی اس دم آیت انا للہ راجعون

ڈاکٹر رشید موسوی کے مطابق یہاں حوالہ درج ہے دیکھئے

”شمالی ہند کے ابتدائی مرثیے بھی عموماً قصیدے یا مربع کی شکل میں لکھے گئے ہیں یہاں پہلے پہل مسدس کی شکل میں مرثیہ کس نے لکھا اس بارے میں

اختلاف رائے ہے'' ۔۱

یعنی اس وقت کے زیادہ تر شعراء قصیدے یا مربع کی شکل میں مرثیے لکھ رہے تھے، اور مرثیے کا پیکر تلاش رہے تھے۔ شیر علی افسوس کا نمونہ کلام پیش ہے

کس طرح آج روئے زمیں پر نہ ہو عزا
کیوں کر نہ ہوئے گریہ و زاری ہر ایک جا
سینہ زنی کی آئے کہاں تک نہ اب صدا
ہے کیا عجب جو دہر میں شیون ہو برملا
روزسیت ایں کہ حادثہ کوس بلا زدہ است
سن کو بلا بمعرکہٗ کربلا زدہ است

سید منتظر جعفری نے اسی عہد کے سلسلے میں کہا ہے

''لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کا باقاعدہ آغاز حیدری سے ہوتا ہے، مرثیوں کی ساخت کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو حیدری کے مرثیے دہلوی مرثیوں کے مقابلے میں زیادہ منظم اور مربوط نظر آتے ہیں'' ۔۲

جعفری صاحب نے حیدری کی تعریف بالکل صحیح کی ہے، اس سلسلے میں ان کی رائے کے اظہار کے بعد اب اسی طرح حیدر بخش حیدری کا نمونہ کلام بھی دیکھئے ان کا کلام بہت صاف اور ہموار ہے

۱۔ دکن میں مرثیہ اور عزاداری، ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء، صفحہ ۹۳، از: ڈاکٹر رشید موسوی، ۱۹۷۰ء ستمبر، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد-۲

۲۔ مراثی میر انیس میں مناظر قدرت، صفحہ ۲۷، سید منتظر جعفری ۱۹۸۸ء، ۳۹ مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ

واہ ری ان کی شجاعت واہ رے ان کے حواس
بے حواسی تھی پھری گویا نہ ان کے گردو پاس
چور تھے زخموں سے پر چہرے نہ تھے ان کے اداس
مثل گل ہر زخم پر کھلتے تھے یہ خالق شناس
سیکڑوں حربے لعینوں کے مگر کھاتے تھے یہ
اور اٹھائے باگیں گھوڑوں کی بڑھے جاتے تھے یہ

حیدری کے متعلق طبقات شعرائے ہند میں کریم الدین لکھتے ہیں

''حیدری کے بارے میں جو اندراجات بعض جگہ ملتے ہیں ان کی بنا پر انہیں اودھ کا قدیم ترین مرثیہ گو قرار دینا چاہئے۔ کریم الدین نے ان کا نام حیدر شاہ لکھا ہے اور قلم کے ساتھ ساتھ تلوار کا دھنی بھی بتایا ہے'' [1]

اس عہد میں اثر دہلوی میر قمر الدین، منت، ہدایت اللہ خاں ہدایت، شاہ قدرت اللہ قدرت، میر محمدی بیداد نے مرثیے کہے یہ سب میر درد کے شاگرد تھے۔

مرثیہ اس دور میں بھی تجربے سے گذر رہا تھا۔ حالانکہ سودا نے مرثیہ کے اجزاء کا تعین کر دیا تھا اور مرثیے کے مواد میں بہت سے تجربے کیے تھے۔ انہوں نے کسی مقرر راستے پر چلنے کے بجائے اس صنف کو ادبی حیثیت دینے کے لئے مختلف راستوں میں اس کے بڑھنے اور پھیلنے کے امکانات پر غور کیا تھا۔ اور اپنی ذہانت وجودت فکر سے نئے نئے پہلو نکالے تھے جن کو بعد کے شعراء اور بھی ترقی دے رہے تھے ان شعراء نے اپنے عہد کے مراسم کا ذکر مرثیوں میں بخوبی کیا اور معاشرت کے عناصر بھی شامل کیے اب دور ختم ہو رہا تھا۔ دتی کا دبستان دہلی

[1] طبقات شعرائے ہند، صفحہ ۱۳۰، کریم الدین، سن اشاعت ۱۹۸۳ء ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی

شاعری کا پانچواں دور متوسطین کا ہے۔ غالب، ذوق، مومن، ممنون، شاہ ظفر کے نام اس عہد میں آتے ہیں۔ غالب نے زیادہ تر فارسی میں مرثیے کہے ہیں اور صرف تین کہے ہیں۔ مرثیے کا نمونہ دیکھئے۔

یہ کہہ کے آیا گود میں سجاد کے وہ سر
منہ منہ پہ رکھ کے خوب بہا رویا وہ نوحہ گر
زینبؑ کو پھر دیا سر سلطان بحروبر
کہنے لگا کہ لو پھوپھی اماں ملے پدر
غصے جو مجھ کو دیکھا تو تشریف لائے ہیں
بابا حسینؑ آپ محبت سے آئے ہیں

مرثیے نے اردو شاعری کے دامن کو کئی لاکھ اشعار سے بھر دیا اور ان اشعار میں ہر طرح کے مضمون میں طبع آزمائی ملتی ہے ان اشعار نے اردو شاعری کا دامن وسیع کیا اور ان اشعار میں مستعمل الفاظ بھی منجھ کر نکھرے اور زبان کی خدمت اس طرح ہوئی دہلی میں مرثیہ نگاری کا آخری دور داغ کا زمانہ ہے۔ غدر کے بعد شعراء دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ اس عہد کے صرف دو مرثیہ نگار ہیں۔ ذوق کے شاگرد ظہیر الدین ظہیر دہلوی، اور غالب کے شاگرد یوسف علی خاں عزیز دہلوی۔ یہ دونوں خاصے مقبول ہوئے۔ ظہیر کا نمونہ کلام دیکھئے

گل گونہ شفق جو ہوا رونمائے صبح
نوشائے روزگار نے پہنی قبائے صبح

بیانیہ شاعری میں مثنویوں کے دوش بدوش مرثیے نے بھی بڑا اہم کام کیا ہے، مراثی نے مسدس کی شکل کو بیانیہ شاعری کے لئے مخصوص کر دیا اور اردو شاعری میں منظر نگاری کے باب میں مرثیوں نے جو کچھ کیا اسے کون نہیں جانتا اردو شاعری منظوم کردار نگاری کے سلسلے

میں مرثیے نے ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے اور یہ سارا عطیہ واقعہ کربلا کا ہے۔

دہلی کے زوال نے اردو مرثیے کو اودھ منتقل کر دیا۔ یہ اردو مرثیہ کا تیسرا دور تھا جس میں خلیق اور ضمیر کے نام بہت اہم ہیں۔ اور دلگیر و فصیح کے نام بھی اہم ہیں۔

لکھنؤ و فیض آباد میں عہد شجاع الدولہ سے مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔ ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا تو عزا اور مرثیہ گوئی کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا۔

اس عہد میں نذر علی خاں گمان، میر اکبر علی مقبول فیض آبادی، مرزا منکو بیگ، درخشاں فیض آبادی، میر محمد علی صبر فیض آبادی، مرزا حسن علی حسن فیض آبادی، شیخ حسن رضا نجات دہلوی، مرزا الحق وصل لکھنوی، لیکن حیدری، سکندر گدا، احسان، ناظم افسردہ، خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سکندر کا کلام ملاحظہ فرمائیے

شاہ پانی کے لئے گھر سے جو نکلے باہر
دیکھتے کیا ہیں کہ سب مارے پڑے ہیں بے سر
نہ بھتیجا ہے رہا اور نہ برادر سر پر
ہائے بن پانی موئے بن میں مسافر بے گھر

اسی طرح گدا کا بھی نمونہ کلام پیش ہے دیکھیے:

دیکھیں کیا یوں ہے لکھا اے ماہر وے مشرقین
مغفرت امت کی ہے موقوف بر قتل حسین

یہ لوگ سیدھے سادے انداز میں شہادت امام حسین علیہ السلام کا ذکر کرتے تھے لیکن یہ چوتھائی ختم ہونے سے پہلے ہی ضمیر، دلگیر، خلیق و فصیح کی مرثیہ گوئی شروع ہو چکی تھی، ضمیر نے مرثیہ کو پیکر عطا کیا، اور وہ عناصر شامل کیے جن پر آگے چل کر انیس نے مرثیہ کا تاج محل تعمیر کیا، شجاعت علی سندیلوی تحریر کرتے ہیں:

میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنہوں نے مرثیہ کو تحت اللفظ منبر پر بیٹھ کر پڑھا اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجہ میں پڑھے جاتے تھے،، مرثیہ گویوں کی توجہ بین کی طرف زیادہ تھی۔ [۱]

اس عہد کے متعلق منتظر جعفری نے لکھا ہے

''ان شعراء کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے وہ خلیق، فصیح، ضمیر اور دلگیر وغیرہ سے عبارت ہے یہ دور مرثیہ کی تاریخ میں دور تعمیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس دور میں ان شعرا نے اردو مرثیے کی باقاعدہ ہیئت متعین کی اور اس کے اجزائے ترکیبی مقرر کئے''۔ [۲]

خلیق میر انیس کے والد تھے، اور ضمیر مرزا دبیر کے استاد، میر خلیق کو مرثیہ گوئی اپنے والد میر حسن سے ورثہ میں ملی تھی وہ اہل زبان تھے، لیکن میر ضمیر خاندانی مرثیہ گو تھے انہوں نے اس میدان میں صرف اپنی ذاتی صلاحیت کے بل بوتے پر قدم رکھا تھا۔ یہ مصحفی کے شاگرد تھے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ

''سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ ضمیر، مرزا دبیر کے استاد ہیں۔ [۳]

اس بات کا ثبوت ہمیں عبدالسلام ندوی کی تحریر سے ملتا ہے، وہ لکھتے ہیں میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنہوں نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا۔ [۴]

---

[۱] ''تعارف مرثیہ'' صفحہ ۳۸، شجاعت علی سندیلوی، مطبوعہ ادارہ انیس اردو الہ آباد۔

[۲] مراثی میر انیس میں مناظر قدرت، صفحہ ۷۸، سید منتظر جعفری۔

[۳] موازنہ انیس و دبیر، مولانا شبلی نعمانی، صفحہ ۲۲، رام نرائن لال ۱۹۳۶ء۔

[۴] شعراء الہند، حصہ دوم، صفحہ ۱۳۲، عبدالسلام ندوی، ۱۹۵۴ء

نمونہ کلام ضمیر کا پیش ہے، دیکھئے۔

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبیؐ کے
سنہ بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے
اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نوی کے
دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

میر مستحسن خلیق نے مرثیوں میں زبان کی صفائی اور صحت ومحاورہ پر بہت توجہ دی ہے۔
نمونہ کلام یہ ہے

عزیزوں ہوتی ہے ہر اک کو الفت اولاد
نہیں کسی کو گوارا اذیت اولاد
پدر کا مان ہے آرام راحت اولاد
جگر میں کرتی ہے ناسور فرقت اولاد

یہاں حضرت مسلم اوران کے بیٹوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے یہاں رخصت اور بین میں جذبات واحساسات کے اتار چڑھاؤ نمایاں کر کے غم کی تصویر واضح کی ہے۔
مرزا جعفر علی فصیح، ناسخ کے شاگرد تھے بعد میں دلگیر کے شاگرد ہوئے نمونہ کلام دیکھئے

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زم زم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردا لٹک رہا ہے

جب کربلا میں صبح شہادت ہوئی عیاں
پھولی شفق تو سرخ ہوا روئے آسماں
عکس شفق سے خیمے نظر آئے خوں چکاں
اور سرخ پوش سب نظر آتے تھے نوجواں
کہتے تھے سر کٹانے میں اب کیا درنگ ہے
چہرے پہ غازیوں کے شہادت کا رنگ ہے

میر انیس کے داماد میر ضاحک، دادا میر حسن، والد میر خلیق، اور دو چچا میر خلیق، اور میر مخلوق سب شاعر تھے اس لئے شاعری انہیں، میراث میں ملی تھی، اور ان کی نشو ونما شاعری کی فضا میں ہوئی۔

اس دور میں مرثیہ بارہ بند سے بڑھ کر ۱۰ ار بند تک ہونے لگا، اردو مرثیہ کا چوتھا دور لکھنؤ میں انیس اور دبیر کا دور تھا، اس دور میں انیس اور دبیر دونوں فن مرثیہ گوئی میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور مرثیہ کی ترقی میں چار چاند لگ گئے۔

اس عہد میں منیر شکوہ آبادی، اسیر، بحر اور بلونت سنگھ راجہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انیس کے سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں

''میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے''۔[1]

---

[1] انیس یات، صفحہ ۱۰۶، سید مسعود حسن رضوی ادیب، بحوالہ مولانا شبلی نعمانی، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۱ء۔

اسی طرح آگے چل کر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب صاحب ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی قسمیں ہوسکتی ہیں انیس کے مرثیے ان سب پر حاوی ہیں۔[1]

اورانہوں نے خود اس بات پر فخر کیا ہے یعنی انہیں اپنی قادرالکلامی کا علم بخوبی تھا۔ نمونہ دیکھئے۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب و گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں
کانٹوں کو نزاکت میں گل تر سے ملادوں
گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ فرماتی ہیں

میر انیس کے کلام کو سمجھنے کے لئے صاحب دل ہونا بھی ضروری ہے، اور صاحب ذوق ہونا بھی سخن فہمی بھی شرط ہے، اور سخن شناسی بھی وہ خود فرما گئے ہیں

نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں

---

[1] انیس یات، صفحہ ۱۰۶، سید مسعود حسن رضوی ادیب،

چھپتی نہیں بوئے دوستان یک رنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں!

آخر کار اس سلسلے میں ہم علی جواد زیدی صاحب کے الفاظ پیش کریں گے۔ زیدی صاحب لکھتے ہیں:

''اگر اردو کو انیس کا فنی شعور نہ مل گیا ہوتا تو اس موڑ پر ہمارے ادب کے ارتقاء کی تاریخ یہ نہ ہوتی جو آج ہے کچھ اور ہوتی'' ۔[۲]

انیس کی مرثیہ نگاری کے لئے پوری ایک کتاب ہی لکھی جا سکتی ہے، یہاں اختصار کی ضرورت ہے اس لئے اب ہم مرزا دبیر کے کلام کا نمونہ پیش کریں گے۔

انیس کے معاصرین میں دبیر سب سے ممتاز ہیں۔ ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے، اور انیس کے انتقال کے چھ مہینے بعد ہی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ لیکن بچپن سے ہی لکھنؤ میں رہے، اور یہاں کی ادبی روایات اور علمی فضا سے فیض حاصل کیا۔

نمونہ کلام

بانو پچھلے پہر اصغر کے لئے روتی ہے

ذاکر حسین فاروقی صاحب لکھتے ہیں

''مرزا صاحب کی مضمون آفرینیوں صناعیوں اور ژرف نگاریوں نے ہمیں پہلی مرتبہ وہ سرمایہ شعر و ادب عطا کیا ہے جسے ہم سخن آفرینان فارس کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ تاریخ و ادب کے زاویے سے یہ

---

[۱] انیس شناسی، بیگم صالحہ عابد حسین، مرتبہ گوپی چند نارنگ، صفحہ ۶۱۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء

[۲] انیس شناسی، علی جواد زیدی، مرتبہ گوپی چند نارنگ، صفحہ ۱۰۹

ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ مرزا صاحب نے وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری کی اور اپنے کمال فن کے سہارے ہندوستان کے اسی علمی طبقے سے جو فارس سے حد درجہ مسحور و مرعوب تھا اردو کو ایک ترقی یافتہ زبان منوالیا'' [1]

ان کے کلام کا دوسرا انداز سادگی بیان ہے، جسے وہ رخصت، شہادت، بین اور واقعات کے بیان میں مدنظر رکھتے ہیں، نمونہ کلام دیکھئے

ع سیفی کا نمونہ مری شمشیر زباں ہے

ع سرتاج کائنات حسن اور حسین ہیں

ع یا رب مجھے مرقع خلد بریں دکھا

ع جب شامیوں میں صبح کی نوبت کا غل ہوا

یہ ان کے بہترین مرثیوں کے مطلع ہیں، جذباتی ترجمانی میں ان کا نمونہ کلام پیش ہے دیکھئے:

اکبر کی گزارش ہے کہ منگوایں سواری
ماں کہتی ہے لو کیوں نہ رضا دوں گی میں واری
پوری ہویں جو جو کہ مرادیں تھیں ہماری
گھر بھر گیا بچوں سے دولہن دیکھی تمہاری
کیا دیکھ کے دل خوش مرا ہوتا ہے بلا لوں
پہلو میں بہو گود میں پوتا ہے بلا لوں
پالا تھا اسی دن کے لئے تو کہ جواں ہو
آنکھوں کی نہ عینک ہو نہ پیری کی عصا ہو

---

[1] دبستان دبیر، صفحہ ۱۵۴، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، ۱۹۶۶ء عزیز الرحمٰن نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

ہم ڈھونڈھیں دولہن اور تمہیں شوق قضا ہو

ہاں کرتی ہوں واری نہ منے کرتی ہوں واری

نازک ہے مزاج آپ کا میں ڈرتی ہوں واری

ضمیر کے طرز نومی کو آپ نے آب و رنگ بخشا اور بلندیوں پر لے گئے، ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا نام میر عشق کا بھی آتا ہے، انہوں نے زبان کے معاملے میں جو خدمات انجام دیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حسین مرزا عشق، ناسخ کے شاگرد اور ضمیر کے داماد تھے ان کے والد سید محمد میرزا انس بھی ناسخ کے شاگرد تھے اور غزلیں کہتے تھے۔[۱]

عشق کے متعلق پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے تحریر کیا ہے اپنے مضمون میں کہ عشق نے بھی غزل ہی سے شاعری کی ابتدا کی اور کافی دنوں تک اسی کی مشق کرتے رہے پھر مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔[۲]

اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہمیں جناب ڈاکٹر جعفر رضا کی تحریر بہت مناسب معلوم ہوتی ہے وہ تحریر فرماتے ہیں

اس وقت اگر ان کی عمر ۲۴ رسال سمجھی جائے تو ان کی مرثیہ گوئی کے آغاز کا زمانہ ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء معین کیا جا سکتا ہے، چونکہ ان کا سال پیدائش ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء بتایا گیا ہے۔[۳]

انہوں نے زبان کے لئے بہت کچھ کیا اس کا ثبوت ہمیں سید مسعود حسن رضوی

۱۔ یادگار ضیغم، محمد عبداللہ خاں ضیغم، صفحہ ۲۴۰،

۲۔ نیا دور، لکھنؤ۔ اگست ۱۹۶۲ء، سید مسعود حسن رضوی

۳۔ میر عشق اور ان کے خاندان کی مرثیہ گوئی، صفحہ ۹۱

صاحب کی اس تحریر سے ملتا ہے، جس میں میر عشق نے رسالے کی تمہید میں یہ کہا ہے
''میرے نزدیک جو الفاظ مخل فصاحت یا غلط تھے یا اور لفظ ان سے بہتر موجود تھے ان کو ترک کیا اور بعض ترکیبیں جو اچھی معلوم نہ ہوئیں ان کو بہ نظر احتیاط اپنے کلام میں رہنے نہ دیا'' [۱]
نمونہ کلام پیش ہے دیکھئے

جب پیر زال چرخ نے اوڑھی ردائے صبح
پھیلے تمام خلق میں بال ہمائے صبح
فوج ضیا نے آگے بڑھایا نوائے صبح
یہ ابتدائے صبح تھی وہ انتہائے صبح
آغاز میں ہرا تھا گلستاں رسول کا
انجام میں تباہ ہوا گھر بتول کا

انہوں نے روایتی نظمیں کہیں اور اس راستے پر گامزن ہو کر اپنی انفرادیت کا راستہ نکالا۔ نمونہ دیکھئے

تھی کنارے پہ آ کے وہ صورت ماہی
کھلی جو آنکھ ہوئی زندگی سے آگاہی
بدن تو خوف سے تھا سرد رنگ تھا کاہی
اتر کے تختہ کشتی سے میں ہوا راہی

جودت اور تنوع کی تلاش میں عام بحروں سے ہٹ کر بھی دوسری بحروں میں مرثیے

[۱] سید مسعود حسن رضوی، میر عشق اور ان کا ایک رسالہ ''نیا دور'' لکھنؤ۔ اگست ۱۹۶۰ء

کہے۔نمونہ دیکھئے

شامیوں کا رنگ، تھا صبح کی مانند فق
تیغ تھی عباس کی بہر عدو قہر حق

انہوں نے زیادہ تر مثنوی بحروں میں مرثیے لکھے ہیں، ان کے چھوٹے بھائی مرزا تعشق بھی بہت اچھے مرثیہ نگار تھے اس کے ساتھ ساتھ غزل گوئی میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے، سوز و گداز ان کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔

انہوں نے مرثیہ کے چہرے میں ہجر و وصال کی مضامین بیان کئے ہیں، اور مکالموں میں نفسیات انسانی سے گہری واقفیت ظاہر ہوتی ہے، اور ان کے کمال فن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے بعد کے دور میں کچھ نئے ستارے افق مرثیہ پر نمودار ہوئے جن میں نفیس، وحید، کامل، اوج، اور تعشق نمایاں ہیں۔

نفیس نے انیس کی زبان استعمال کی اور ان سے فن حاصل کیا۔ نفیس انیس کے بیٹے تھے۔ ان کے بعد رشید خاندانی غزل گو تھے۔

وحید کے یہاں بیان کا زور جذبات کی شدت اور فن پر پوری قدرت کی مثالیں ملتی ہیں۔ نفیس، وحید، علی میاں کامل اپنے فن کے جوہر دکھا رہے تھے۔ آخری دور میں شاد عظیم آبادی، عارف لکھنوی اور شمیم امروہوی مرثیہ گویوں میں ابھرے، اور خوب مشق کی اور ریاض کیا۔ غالباً یہ بیسویں صدی سے قبل کے تمام شعراء کا مختصر ذکر ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی کا آغاز ہوا۔

بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی دنیا کی تاریخ میں ایک نئے موڑ کا آغاز ہے۔ سماج کے حالات اور بغاوت کا عکس، اس دور کی شاعری میں صاف طور پر واضح ہے، اردو ادب نے

جنگ آزادی میں بہت زبردست حصہ لیا تھا۔ اس عہد کے اہم شعراء جنہوں نے مرثیوں میں اپنی ادبی خدمتیں انجام دیں ان شعراء میں محترم عروج، مودب، قدیم بہت نمایاں رہے اور شاد عظیم آبادی بھی اسی عہد میں مرثیے کہہ رہے تھے اس کے علاوہ اپنی گھن گرج کے ساتھ جوش ملیح آبادی بھی مرثیوں میں جدیدیت کے ساتھ طبع آزمائی کر رہے تھے۔

ان کے علاوہ رفیع مرزا محمد طاہر لکھنوی، قدیم سید علی نواب لکھنوی، حسین سید صادق علی عرف چھنگا صاحب لکھنوی، مودب سید محمد عسکری مرزا لکھنوی، ذکی منے صاحب لکھنوی، سرفراز سید سرفراز علی خاں لکھنوی، طپاں میر ابرار حسین اکبر آبادی، شاعر آغا ظفر علی بیگ قزلباش دہلوی، ساحر راجہ محمد علی خان والی محمود آباد، ثابت سید افضل حسین لکھنوی، اور اسی صدی کی دوسری چوتھائی میں رضا لکھنوی زائر سیتاپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جوش شبیر حسن خاں ملیح آبادی، نسیم، محمد قائم رضا امروہوی، خیبر سید سرفراز حسین دہلوی، نانک، نانک چند لکھنوی، بدر بدرالدین عظیم آبادی، وحشی ڈاکٹر ننھی لال مظفر پوری، بحر محمد امیر احمد خاں راجہ محمود آباد وغیرہ نے مرثیوں میں طبع آزمائی کی اور ایک نئی روش اختیار کی۔

مرثیہ بیسویں صدی میں

اس عہد میں عروج، مودب اور قدیم زیادہ نمایاں ہیں۔ مرثیہ کہنا اب روایتی غزل گوئی بن چکا تھا۔ یعنی یہ محض تقلیدی دور تھا، زیادہ سے زیادہ وہ بہار اور ساقی نامہ لکھ دیتے یا سارا زور بین پر ہی صرف کر دیتے۔ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی دنیا کی تاریخ میں ایک نئے موڑ کا آغاز ہے یعنی پہلی جنگ عظیم کے بعد مرثیے کو نئے دھارے پر لے جا رہے تھے یہیں سے قدیم اور جدید مرثیے کی اصطلاح کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی کچھ لوگوں نے مرثیے کے ڈھانچے کو اور بڑی حد تک ان کے عنصروں کو ہی بدل ڈالا اب صرف کربلا کی خونریز داستان اور حق و باطل

کی نبرد آزمائی اور حق کی فتح کا ذکر ہے۔ جدید مرثیے میں مرزا اوج کی مرثیہ نگاری سے لکھنو کو برقرار رکھتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے 1918ء میں مرثیے کا انداز بدل دیا۔ اس بارے میں ہم جناب علی سردار جعفری صاحب کے مضمون سے کچھ سطریں پیش کریں گے۔ جعفری صاحب فرماتے ہیں

انیس کے اثرات جوش ملیح آبادی کے یہاں بہت واضح ہیں اور ''اقبال کے یہاں بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں، بیسویں صدی کی نظم کی زبان کو انیس انیسویں صدی میں مستند بنا چکے تھے'' [1]

دنیا میں سماجی عدل اور مساوی مواقع کی تحریک زور پکڑ رہی تھی، امارت اور سرمایہ داری کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں، جوش نے اسے موضوع بنایا اور کربلا کو استعارہ کے بطور استعمال کیا اس کے ثبوت کے طور پر ہم پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تحریر پیش کر رہے ہیں۔ نارنگ صاحب کہتے ہیں

یوں تو جوش ملیح آبادی نے مرثیے لکھے جنہیں ضمیر اختر نقوی نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ لیکن آزادی سے پہلے آوازہ حق کے علاوہ جوش کا صرف ایک اور مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' ملتا ہے، جو ۱۹۴۱ء کی تصنیف ہے۔ [2]

اب جوش کے دوش بدوش جدید مرثیہ کہا جانے لگا، جوش کے کلام کا نمونہ دیکھئے

عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

---

[1] انیس شناسی، صفحہ ۲۹، بحوالہ علی سردار جعفری، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

[2] سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۷

یا پھر یہ بند ملاحظہ فرمائیے

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو
یہ جو مچل رہی ہے دنیا پھٹ رہی ہے

یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لو
در پردہ یہ حسینؑ کے انفاس کی رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو

اس سلسلے میں جوش کے ایک سلام کا نمونہ دیکھیے

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو
اس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزر و مد
دشت بلا میں تھی جو بہتر کی آرزو

مرثیہ کے اندر ارتقائی آثار کی داغ بیل خود انیس کے مراثی میں ملے گی، ان کے بعد مرزا دبیر کے خلف الرشید مرزا اوج مرحوم نے مرثیے کے مضامین اور اسلوب میں انقلاب لانے کی کوشش کی۔ مرزا اوج مرثیے میں تغزل کے عناصر کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے خالص فکری مضامین نظم کیے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

سروش غیب ہے گویا زبان حمد خدا
ہے جبرئیل تکلم بیان حمد خدا

ہر ایک بول سے بالا ہے شان حمد خدا
ہے فرض نطق زباں آفریں کی حمد و ثنا
سخن کی جان ہے جان آفریں کی حمد و ثنا

ادھر عظیم آباد میں مرثیہ کا مرکز قائم ہوا۔ شاد عظیم آبادی کا معیار سخن اور معیار اخلاق دونوں ہی بلند تھے۔ شاد نے مناظر صبر واستقلال دکھانے میں جدت سے کام لیا ہے۔ نمونہ دیکھئے۔

خیمے میں میری لاش جو لائے امام دیں
ہٹ جائیو خدا کے لئے تم الگ کہیں
بچوں کا بھی قیام مناسب وہاں نہیں
نازک ہیں پھول سے بھی زیادہ یہ نازنیں
کیوں کر سہیں گے اس الم دل خراش کو
دیکھا نہیں کبھی کسی زخمی کی لاش کو

بہر حال اب جدید مرثیہ کی طرف رفتہ رفتہ لوگ متوجہ ہو گئے، پٹنہ کے جمیل مظہری، سید آل رضا زائر سیتاپوری، نسیم امروہوی وغیرہ نے اس تحریک میں حصہ لیا، جوش کے بعد سب سے اہم نام نجم آفندی کا ہے اس کے علاوہ جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے ایک مرثیہ جو جدید نظریہ کے تحت کہا، ان کے علاوہ لکھنؤ میں بابو صاحب فائق لڈن صاحب فائز، خبیر لکھنوی، مہذب لکھنوی، آشفتہ لکھنوی، میر مانوس، فرزند، حسن، جلیل، رفیع، ذاخر سلطان صاحب فرید قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام ہوا اور کراچی آ کر پہلے مرثیہ نگار آل رضا قرار پائے۔ اس عہد میں زیادہ تر مرثیہ نگار پاکستان کراچی چلے گئے لیکن لائق علی ہنر لکھنوی، شہید لکھنوی، گوہر

لکھنوی، جیسے مرثیہ نگاروں نے مرثیہ نگاری کو لکھنؤ میں روا رکھا، مہاراج کمار محمود آباد اور سید نواب افسر بھی قابل ذکر ہیں۔ احسن طباطبائی اور غلام امام نامی مرحوم قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں مہذب لکھنوی، مرزا محمد صادق جدید بارہ بنکوی، مضطر جونپوری، ڈاکٹر طاہر لکھنوی، خرد فیض آبادی، گہر لکھنوی، شہید صفی پوری، خنداں لکھنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان میں علی سردار جعفری، غیبی، وحید اختر دہلوی، عظیم امروہوی، رزم ردولوی، پیام اعظمی الہ آبادی، قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی، عارف کشتوائی گونڈہ، باقر امانت خاں باقر حیدرآباد دکن، مہدی نظمی دہلی، علی مہدی بلرامپوری، کالی داس رضا ممبئی، بدر عظیم آبادی پٹنہ، شمیم کرہانی، نتھونی لال وحشی مظفر پوری، یوگیندر پال، صابر شکوہ آبادی، حسان جونپوری کے چند مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔

ہندستانی مرثیہ نگار پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں جدید مرثیے کا دبستان نہیں بن سکا لیکن لکھنؤ میں چند برسوں سے بزم مرثیہ خوانی کا قیام عمل میں آیا، اس سے پورے ہند میں مرثیہ زندہ ہو گیا۔ ضمیر اختر کہتے ہیں کہ

"یہ حقیقت ہے کہ جوش سے پہلے کسی مرثیہ نگار نے براہ راست یہ بات نہیں کہی تھی لیکن یہ خطیبانہ انداز ہے پرانے مرثیہ نگاروں نے بالواسطہ اور شاعرانہ زبان میں مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ درحقیقت ہر عہد کی زبان اور تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں" [۱]

جوش کے مرثیوں میں خطیبانہ انداز ہے نمونہ کے طور پر دیکھئے۔

قوت باطل پہ جو انسان چھا سکتا نہیں
حشر میں وہ مصطفیٰ کو منھ دکھا سکتا نہیں

۱۔ اردو مرثیہ پاکستان میں، ضمیر اختر، ۱۹۸۲، صفحہ ۱۱۴، سید اینڈ سید ۲۱ اورنگ زیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی

فکر حق سودوزیاں کاشت نہیں کرسکتی
کربلا تاج کو براداشت نہیں کرسکتی
کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہ بانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

ان کے بعد سید آل رضا کا ذکر آتا ہے، انہوں نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۹ء میں کہا اب تک ۲۰ رمرثیے کہے ہیں۔ تقریباً انہوں نے مرثیوں میں مقصدیت کو فروغ دیا۔ نمونہ دیکھئے

ہے اس جگہ کا تقاضا بیان درد بھی ہو
جہاں نعرہ جرأت فغان درد بھی ہو
جہاں میں فخر کی باتیں زبان درد بھی ہو
جو ہے حدیث وفا داستان درد بھی ہو
بیان یوں تو مسدس میں کیا نہیں ہوتا
جہاں یہ درد نہ ہو مرثیہ نہیں ہوتا

اس سلسلے میں جناب ضمیر اختر صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے جس کا حوالہ یہاں پیش ہے دیکھئے

"جدید مرثیہ نگاروں میں سید آل رضا کا مرتبہ اور منصب مقام اور اہمیت سب سے الگ اور منفرد ہے۔[1]

اس سلسلے میں جمیل مظہری کا بھی ذکر آتا ہے، ان کے جس مرثیہ میں سیاسی عنصر سب سے زیادہ شامل ہے وہ ہے "پیمان وفا" یہ مرثیہ ۱۹۳۵ء کی یادگار ہے۔ جمیل مظہری کی مرثیہ

---

[1] اردو مرثیہ پاکستان میں، ضمیر اختر، صفحہ ۱۴۰،

نگاری کی ابتداء قومی مقاصد ہی کے تحت ہوئی محمد رضا کاظمی کی تحریر حوالے کے طور پر پیش ہے۔ دیکھئے

''تجزیہ کی مسلسل تہہ داری اور مسلسل نزاکتیں وہ ذریعہ بنی ہیں جس سے جمیل مظہری نے انسانی غم کو کائناتی المیہ سے مربوط کیا ہے، اور اس خوبی کے ساتھ کہ نہ تو ذاتی غم کا خلوص ضائع ہوا ہے اور نہ آفاقی غم کی جلالت میں کمی آئی ہے'' [۱]

ان کے کلام کو نمونے کے طور پر یہاں پیش کیا جارہا ہے، ملاحظہ فرمایئے

دیر تک کوکھ جلی ماں کو بھی رونے نہ دیا
زخم پژمردہ کو اشکوں سے بھگونے نہ دیا
دل کو بوجھ اپنی شکایات کا ڈھونے نہ دیا
جان تھی اپنی امانت اسے کھونے نہ دیا
چھین لی روح سے جذبات عزا کی پونجی
دے دیا صبر مگر لے لی وفا کی پونجی

ان کے بعد علی سردار جعفری کا ذکر آتا ہے، جعفری صاحب نے فرمایا ہے کہ میری شاعری کا آغاز مرثیوں سے ہوا ہے۔ اس سلسلے میں محمد رضا کاظمی تحریر کرتے ہیں

ان کا مرثیہ مطبوعہ سرفراز محرم نمبر ۱۳۹۶ھ ان کے بیان کے مطابق ان کی پہلی شعری کاوش ہے ترقی پسند تحریک میں شمولیت کے بعد انہوں نے مرثیہ گوئی ترک کی۔ [۲]

---

[۱] جدید اردو مرثیہ، محمد رضا کاظمی، مکتبہ ادب کراچی۔ ۱۹۸۱ء

[۲] جدید اردو مرثیہ، محمد رضا کاظمی، مکتبہ ادب کراچی، صفحہ ۱۹۴

نمونہ کلام دیکھئے

بھائی امام پاک کا اک نوجوان ہے
تیور میں جس کے حیدر صفدر کی شان ہے
قبضے میں تیغ دوش پہ ترچھی کمان ہے
رکھا ہوا زمین پہ اک آسمان ہے
عاشق ہے ابن فاتح بدر و حنین کا
دل میں خدا کا نام ہے لب پر حسینؑ کا

ان کے بعد نسیم امروہوی کا ذکر آتا ہے، نسیم امروہوی نے مرثیہ نگاری وراثت میں حاصل کی ہے وہ عالم دین ہیں اور شاعری ان کے لئے ذریعہ تبلیغ ہے۔ ان کے لئے جناب محمد رضا کاظمی کے خیالات درج ہیں

"جناب نسیم کی شاعری انقلابی مضامین اور حکیمانہ افکار سے عبارت ہے مگر انہوں نے مرثیہ نگاری کے ایک بنیادی عنصر کی طرف توجہ دلائی ہے، اور جدید مرثیہ کے سیلاب کو ایک واضح روح دینے میں کامیاب ہوئے ہیں" [1]

ان کا نمونہ کلام یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ دیکھئے

ایما الف کا ہے کہ امام امم کہو ایمان و اہل بیت و امیر و ارم کہو
رب کا بیان ہے کہ بقا کا بھرم کہو یا باعث برات و برأت بہم کہو
ت سے نبیؐ کی تیغ بھی تاب و توان بھی
تطہیر کی تمیز بھی ہیں ترجمان بھی

---

[1] جدید اردو مرثیہ، محمد رضا کاظمی، صفحہ ۲۳۱

نجم آفندی اردو شاعری کا ایک ستون ہیں ان کے شعری پس منظر میں عزائیہ شاعری کا ایک وسیع تجزیہ تھا۔ ان کا پہلا مرثیہ فتح مبین ۱۹۴۳ء اپنے آہنگ کے اعتبار سے ایک یک جزوی مرثیہ ہے ابتدائی مصرع دیکھئے ''جب لے لیا حسینؑ نے میدان کربلا'' نجم آفندی ہر صنف کی عزائیہ شاعری سے تدریجاً مرثیہ تک پہنچے ہیں اس لئے غزل سے مرثیہ تک کا سفر انہوں نے سہولت سے طے کیا۔

نمونہ کلام دیکھئے

یہ جنگ انتظام شریعت کی جنگ تھی
باطل کی قوتوں سے حقیقت کی جنگ تھی
سرمایہ دار و صاحب محنت کی جنگ تھی
یہ حکمت بشر سے مشیت کی جنگ تھی
یہ جنگ آخری تھی ہدایت کی راہ میں
مہدیؑ کا انتظار ہے اب رزم گاہ میں

مراثی نجم کی کیفیت ان کی کمیت پر حاوی رہی ایسی مثال بہت کم ملے گی کہ صرف دو مرثیے کہہ کر کوئی شاعر تاریخ مرثیہ پر اثر چھوڑ گیا ہو۔

نجم آفندی نے اخلاق اقدار کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ سائنس کے ارتقاء کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور فکری گہرائی بھی ان کے یہاں نمایاں ہے، ان کے بعد جناب زائر سیتاپوری کا ذکر آتا ہے، جدید مرثیہ کے بنیادی اسلوب اور تکنیک کی تعمیر میں ان کا بڑا حصہ ہے انہوں نے شاعری کا آغاز روایتی مرثیہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا مگر جدید مرثیہ کو نظریاتی طور پر قبول کیا اور تشریح مقاصد حسینی کو کلام کا محور بنایا۔ ان کا نمونہ کلام دیکھئے

اک اسوہ حسنہ ہے حسینؑ کی سیرت
ضمیر کی وہ بلندی وہ نفس کی رفعت
حد عروج سے آگے قدم کی ہر حرکت
جو ہوتی ظرف میں انساں کے کہیں وسعت
دلوں کو جلوہ گہ نیرین کردیتے
حسینؑ سارے جہاں کو حسینؑ کردیتے

ان کی مرثیہ گوئی زیادہ تفصیل کی حقدار ہے لیکن موزوں کے پیش نظر اختصار سے کام لیتے ہوئے اب ہم جناب ڈاکٹر صفدر حسین کا ذکر کریں گے ان کے مجموعہ مراثی ''لب فرات'' میں معتبر ناقدین نے ان کی مرثیہ نگاری کا محکمہ کیا ہے، اس کا اعادہ مشکل ہے۔ یہاں مختصراً عرض ہے مرحوم اس دور کے چند مبارز شعراء میں سے تھے۔ وہ مرثیہ کے بڑے حساس نقادوں میں تھے وہ انفرادیت کے قدر شناس تھے ان کے متعلق جناب ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی صاحب فرماتے ہیں

''انہوں نے تمثیلی انداز میں تاریخی شعور اور جدید قدروں کو شامل کرنے پر توجہ دی لیکن مرثیہ کی روایات سے انحراف نہیں کیا زبان و بیان پر ان کو جو قدرت حاصل ہے اس نے ان کے فن کو امتیازی حیثیت بخش دی ہے۔[1]

اب ان کا نمونہ کلام پیش ہے دیکھئے

وہی عباسؑ فسانہ ہے جلالت جس کی
آج بھی سینہ باطل میں ہے ہیبت جس کی

---

[1] افکار انیس، صفحہ ۱۰۰، ڈاکٹر محمود الحسن رضوی، احباب پبلشرز اقبال منزل، مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ-۱

نا امیدی میں اک امید تھی ہمت جس کی
خستہ حالوں کا بھروسا تھی شجاعت جس کی
یاس زینب کی سمجھتی تھی سہارا جس کو
ہر طمانچہ پہ سکینہ نے پکارا جس کو

آخر میں جناب حجۃ الاسلام علامہ طالب جوہری صاحب کا ذکر آتا ہے، وہ اپنی علمی حیثیت میں قوم کا سرمایہ بن چکے ہیں۔ طالب جوہری کے انفرادی مضامین جدید مرثیہ کے نمائندہ مضامین میں ڈھل جاتے ہیں۔ مقصد شہادت کا بیان مرثیہ کی روح عصر ہے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

تاریخ کائنات کے ہر زیر و بم کے سات
لرزاں و خونچکاں ہیں ہزاروں ہی حادثات
لیکن وہ حادثہ جو ہوا تھا لب فرات
اپنی جلو میں لے کے چلا سرمدی حیات
وہ حادثہ جو اک ابدی چیخ بن گیا
یعنی صریر خامۂ تاریخ بن گیا

ان سب کے مطالعہ کے بعد یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ جدید مرثیہ ابھی تک اپنی کوئی مخصوص راہ متعین نہیں کر سکا ہے بلکہ اس میں میر انیسؔ ہی کے فن کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

مرثیہ میں جدید رجحانات اور سیاسی سماجی اور معاشرتی مسائل کا حل

مرثیہ میں جدید رجحانات کب شامل ہوئے تو عام رائے یہ ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی بڑی لڑائی جیتنے والوں نے جیتی اور ہارنے والوں نے ہاری، مگر ایک حشر ساری کائنات میں برپا ہو گیا۔ محکوم اور دبی ہوئی قومیں جاگ پڑیں اور اپنی بساط بھر آزادی حاصل کرنے میں لگ گئیں ہندوستان بھی اس سے نہ بچ سکا۔ سامراجیت اسے دبا رہی تھی لیکن آزادی کی آگ اندر ہی اندر دلوں کو سلگا رہی تھی۔ ادب میں بھی اس کی لپٹیں نظر آتی ہیں۔ اردو ادب نے اس میں ایک واضح حصہ لیا اور کچھ مرثیہ کہنے والوں نے اپنے طرز کو ہی نہیں بلکہ مرثیے کے ڈھانچے اور بڑی حد تک ان کے عنصروں کو بدل ڈالا۔ اب نہ تلوار رہی اور نہ گھوڑا، بہار رہی اور نہ ساقی نامہ، بس کربلا کی خونی داستان حق و باطل کی دل ہلا دینے والی نبرد آزمائی اور آخر کار حق کی فتح۔

دنیا میں سماجی عدل اور مساوی مواقع کی تحریک زور پکڑ رہی تھی، امارت اور سرمایہ داری کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں، جدید مرثیہ میں مفکرانہ توضیحات کا رجحان کلام اقبال کا پروردہ ہے۔ اقبال اور محمد علی جوہر نے کربلا کی واقعہ نگاری سے قطع نظر کر کے شہادت حسینؑ کے اسباب و اثرات کی نشان دہی کی اور انہوں نے ان امکانات کو اس وقت روشن کیا جب انیس و دبیر کے کمالات کا بوجھ مرثیہ میں ترقی کی راہ کو مسدود کر چکا تھا۔ اقبال کے جن اشعار کی گونج جدید مرثیہ میں بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہیں:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتداء ہے اسماعیل

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است

اس طرح واقعات کربلا کو مثال بنا کر بیداری ذہن، جدو جہد، حق وصداقت، اور جوش ایمانی پیدا کرنے پر توجہ دی جانے لگی اور فلسفہ وسائنس کے عناصر شامل کر کے اسے فکری گہرائی اور زندگی کے مسائل کے اظہار سے قریب کیا گیا۔ فکرو نظر کی تبدیلیوں اور سیاسی وسماجی تغیرات نے نئی منزل کی طرف گامزن ضرور کر دیا۔ دور جدید کا انسانی ذہن محض اعتقادات وروایات کا پرستار نہیں رہ گیا بلکہ وہ امام حسینؑ کے ایثار اخوت ومساوات، ثبات واستقلال اور آزادی ضمیر وعمل کے پیغام سے عالم انسانیت کو روشناس کرا کے بنی نوع انسان کی فلاح کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح واقعات کی ترتیب وتنظیم کا تصور اور مرثیہ نگاری کا مخصوص انداز تو قائم نہ رہ سکا لیکن امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے پیچھے جو جذبہ موجزن تھا اس کی اشاعت ضرور ہونے لگی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تحریر دیکھئے

"انیسویں صدی میں برصغیر کے نشاۃ ثانیہ اور عہد جدید میں داخل ہونے کے بعد بالخصوص سیاسی المیہ ۱۸۵۷ء کے بعد عہد وسطیٰ کا ظاہرداری اور باطنیت کی آویزش کا روحانی ساختہ ایک نئے سیاسی سماجی ساختے کو راہ دیتا ہے۔ اب اس میں حق وباطل یا خیر وشر کے معنی بدل جاتے ہیں"۔[1]

---

[1] سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، گوپی چند نارنگ، ۱۹۸۶ء صفحہ ۲۷

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم جناب ڈاکٹر محمود الحسن صاحب رضوی کا حوالہ پیش کر رہے ہیں۔

''بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جب ہندوستان کی معاشرتی زندگی نئے موڑ پر پہنچی نئی تعلیم ذہنی و علمی تقاضے اور مغربی ادبی تصورات یہاں کی ادبی فضا پر اثر انداز ہونے لگے فلسفہ اور سائنس کے مطالعہ نے مذہبی اصلاح کی طرف توجہ کیا'' ۔[1]

جدید مرثیہ نے اس خیال کے تحت وسعت پائی ہے کہ پہلے مرثیہ گورلا کر اپنی آخرت سنوارتا تھا اب جگا کر پوری ملت کی دنیا و آخرت کو سنوارنا چاہتا ہے۔ اسلامی افکار میں دین سے دنیا کو متصل کر دینے کا رجحان شروع سے موجود ہے۔ راہ خدا میں سب کچھ قربان کر دینے کا فلسفہ جو کہ مرثیوں میں موجود ہے۔ ایک دیرپا معاشرے کا خاکہ بنانے نہیں دیتا لیکن اس جذبہ قربانی کے اتباع میں زندگی کے چند اصول سامنے ضرور آتے ہیں جن کی دنیا بھلے ہی مختصر ہو جائے گی مگر وجود کو معنویت ضرور نصیب ہوتی ہے۔ محمد رضا کاظمی لکھتے ہیں۔

''جدید مرثیہ میں اس شعور یا آگہی کی بنیاد سماجی اور سیاسی محرکات نے رکھی تھی وہی محرکات جنہوں نے نظم کی تعمیر کی۔ نظم نے مذہب اور فلسفہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے زمانے میں پرورش پائی۔ اس زمانے کا مرثیہ نگار مذہبی مقصدیت کو ایک تسلیم شدہ شے کی حیثیت سے قبول کرنے پر قانع نہیں۔ وہ ان کی وضاحت چاہتا ہے، یہ وضاحتیں ہمارے دور کی ایک خاصیت ہیں'' ۔[2]

اس طرح جدید مرثیے میں شعرا نے سیاسی، سماجی و معاشرتی مسائل کا اظہار کیا۔ یہ

---

[1] افکار انیس، ڈاکٹر سید محمود الحسن صاحب رضوی، دسمبر ۱۹۷۶ء، صفحہ ۹۳

[2] جدید اردو مرثیہ۔ محمد رضا کاظمی، صفحہ ۱۳، ۱۹۸۱ء

اظہار اس عہد کا تقاضا تھا اور جدید مرثیے نے اس تقاضے کو پورا کرنے میں بہت ہی نمایاں کردار انجام دیا۔

شعراء نے ان مرثیوں کے ذریعہ حق و باطل اور ظلم و انصاف کو واضح کیا۔ اور حسینؑ کے جہاد کی روشنی کو دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح سماج اور سیاست اور معاشرے سے متاثر ہو کر مرثیہ ایک نئی سمت پر چل نکلا، اور نئی راہیں تلاش کیں۔ جدید مرثیہ انہیں راہوں میں بھٹک رہا ہے۔ لیکن منزل بہت دور ہے اور سمتیں بہت سی ہیں۔

باب سوم

بیسویں صدی سے قبل اردو شاعری میں واقعات کربلا

﴿۱﴾

غزلوں میں واقعات کربلا کی علامتوں کا اظہار

﴿۲﴾

نظموں اور دیگر اصناف سخن میں واقعات کربلا کے اشارے

مرثیوں پر بھرپور نظر ڈالنے کے بعد اب ہم دیگر اصناف میں بیسویں صدی سے قبل جو شاعری کی گئی ہے اور جو شعراء اس عہد میں ہوئے ان کا ذکر کریں گے۔

اردو شاعری میں سب سے پہلا شاعر امیر خسرو کو کہا جاتا ہے، ان کے بعد شاہان بیجاپور و گولکنڈہ کے عہد میں شاعری خوب پروان چڑھی۔ آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتداء ہوئی ہے۔

دکنی ادب کی ابتدا میں جو مشہور صوفی بزرگ گذرے ہیں ان میں گنج الاسلام شیخ عیدالدین متوی ۸۹۵ھ۔ خواجہ سید گیسودراز شاہ میران جی، مولانا وجہی اور سید شاہ میر وغیرہ یہ لوگ شاہان بہمنی کے زمانے ۷۴۸ھ لغایت ۹۳۲ھ میں ہوئے ان کے بعد قطب شاہوں کا عہد ۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں۔

گولکنڈہ میں اس وقت غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، طالب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک کا زمانہ سلطان قلی قطب شاہ نے منقبت، حمد، نعت، قصائد، نوحے خوب کہے ہیں، اور موثر مراثی بھی لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے قبل ہم ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک کے دور (جو کہ قلی قطب شاہ کا زمانہ تھا) کا احاطہ کریں گے۔ ان کے دور میں واقعہ کربلا سے متاثر ہوکر بہت کچھ کہا گیا ہے ان میں سلام، مرثیے، نوحے وغیرہ بکثرت موجود ہیں۔ ان کے علاوہ قصائد، حمد، نعت میں بھی اس واقعہ کا جا بجا ذکر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں انتخاب محمد قلی قطب شاہ کے صفحہ ۲۰۷ پر یہ اشعار ملے

ہیں۔

نمونہ دیکھئے[1]

ظالم کیسا ہوا ہے آہ دنیا میں اونن اوپر
پتا ظلم و بلا سب فاطمہ خاطر ملایا ہے
یزید و شمر کے کاماں نہ کرسیں کوئی شیطان بھی
ہزاراں لعن ہے اس پر جن ایسا پوت جایا ہے

آہ ہمارے درد تھے دریا کوں سب جوش آوتا
ماتمیاں کے لہو بنداں تھے تگ سب بج جاوتا
مصطفیٰ کے باغ کے پھولاں کوین پانی سکائے
مصطفیٰ ہو مرتضیٰ ہور فاطمہ کا دل دکھائے
جیوں بنیاں میں مصطفیٰ ہیں تیوں اماماں میں حسینؑ
کفر کے تیئں بھان کر اسلام کہتے ہیں حسینؑ

پھولاں سکے سب دکھ ستی مکھ مونڈے بلبل جھکھ ستی
کویل حیسنا دکھ ستی بن بن پکاری وائے وائے
یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر
کافر کے کیسے قہر یو زخم کاری وائے وائے

---

[1] انتخاب قلی قطب شاہ، صفحہ ۲۰۷

علی عادل شاہ ثانی شاہی بیجاپور کا سلطان شعروشاعری میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔اس نے اردو شعروادب کی سرپرستی کی وہ زبان بہت صاف لکھتا تھا،اس کا کلام جو کہ کلیات شاہی کے صفحہ نمبر ۱۱۷ پر موجود ہے۔دیکھئے![1]

فاطمہ اور مرتضیٰ کا تھا جگر گوشہ سہی
اور مبارک تج بدن سو نور سارا یا حسینؑ

افسوس صد ہزار جو سرور حسینؑ تھا
ہوکر رہیا ہے سرخ بدن کربلا منے

ذات مبارک کے تیئں کیتے ہیں ناحق شہید
دیکھو ستم گار لوگ اس کو سمجھ خوب کام
انوں کی آل میں دیپک جوا تھا حسین سرور
اندھارا دین کرنے تیئں سواو دیپک بوجا ڈارے

کربلا کی بھیں جنتی رنگیں ہوئیں
لہو بھرے دلدل کے نالاں ہائے ہائے

دونے کا خم ڈالا ہوا جل بل سیہ بالا ہوا
لالے کا دل کالا ہوا تج غم نے رو رویا امام

---

[1] کلیات شاہی،صفحہ ۱۱۷

علی عادل شاہ شاہی کے بعد ابن نشاطی، غواصی، نصرتی، مولانا وجہی، رواجو حسین، ابوالحسین قطب شاہی، مرزا، ابراہیم عادل شاہ ثانی، رستمی، نصرتی، شاہ ملک امین سیوا، مومن، ہاشم، عاجز، وجدی، ولی دکھنی یہ تمام شعرا شروع کے دکنی ادب کے اہم شعراء ہیں۔

ان میں سے ہم یہاں پر فضلی کے کچھ اشعار پیش کریں گے، جو کہ ہم نے فضلی کی کربل کتھا کے صفحہ نمبر ۹۵ سے اخذ کئے ہیں۔[1]

گر نام اس زمیں کا یقیں کربلا ہوئے
یہاں پس نصیب ہمارے پو درد و بلا ہوئے

ہائے ماں جایا ہمارا ہم سے کل
بچھڑے گا کیوں کر یہ کلول جاوے ٹل
کاش پہلے آوے ہم سب کی اجل
یا نہ موئے دن رات رہے یہی دھیان ہے
صبح کو پھر ہم کہاں بھائی کہاں
اتنی ہی شب کا ہے بھائی مہماں
دن کے ہونے موں یہ بھائی مہرباں
بچھڑتا ہے ہوش سرگرداں ہے

غواصی نے جو وجہی کا ہم عصر اور ہم پلہ شاعر تھا گو عمر میں چھوٹا تھا، اپنے ایک مرثیے میں کہا ہے۔

---

[1] کلیات شاہی، صفحہ نمبر ۱۱۷

غم سوں پکڑ بیت الحزن یعقوب نے کھویا نین
شیریں کے بھانے کوہ کن اپ جیو گنوایا ہائے ہائے

کلیات غواصی جن کا ذکر یورپ میں دکھنی مخطوطات میں ملتا ہے، اور صفحہ نمبر ۷۸۹۸۷ پر جو کلام موجود ہے۔

اس کا یہاں پر بطور نمونہ ذکر ہے، دیکھئے [۱]

دیکھو یاراں معصوماں پر وقت کیا آ پڑیا
پردیس جائے طفلاں اوپر کیا مشکل آ کھڑا

لے کے سرجیوں کوفی میانے ملحدا نے جس وقت
پڑے جبل سب عزیزاں ہور پکارا یا حسینؑ

بلا کیسی کربلا میں پڑی شاہاں تج اوپر
مج بلا لان تیرے نیکیاں ہور اندھارا یا حسینؑ

نصرتی شاہی کا مصاحب تھا، اور اس کے دربار کا شاعر تھا جسے شاہی نے ملک الشعراء بنایا، اس کا کلام یورپ میں دکنی مخطوطات کے صفحہ ۷۷/۹۷ پر ہے اور دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی کے صفحہ ۲۶۴ پر ملتا ہے۔ یہاں پر کچھ اشعار نمونہ کے بطور دیکھئے [۲]

---

[۱] بحوالہ دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، صفحہ ۷۹

[۲] بحوالہ دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، صفحہ ۷۹

کریں تیغ سو پیش دستی ہمیں
اوتاریں اونن سرتے مستی ہمیں

زباں لہو کی پیاسی کھرک کے اپار
نکل آئی جوں میاں کے لب تے بہار
کماناں کی رت جب کشاکش ہوئی
ہوا بہر کے تیراں سو ترکش ہوئی
کریں قیم تن کوں تیرے کماں
کئے کوفتہ سر کوں گرز گراں

یہاں جنگ کا منظر پیش ہے حضرت عباسؑ جنگ کرنے جاتے ہیں، تو شاعر نے اپنے لفظوں میں وہ منظر پیش کیا ہے اور آخر میں سر پر گرز لگنے کا ذکر کیا ہے، شہادت کا منظر بیان کیا ہے۔

''نصرتی کے بعد، ہم ولی دکنی کے کلیات سے قصائد اور منقبت کے کچھ شعر یہاں پر تحریر کر رہے ہیں۔ ولی دکنی کے یہاں شہیدوں بالخصوص امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کا ذکر کس طرح کیا گیا ہے۔ ولی دکنی کا ذکر جب آئے گا تو اردو شاعری میں جا بجا انہیں اردو کے پہلے شاعر کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس کا بھی ذکر کرنا ہوگا ان کا نام سید محمد فیاض تھا ویلدران کا وطن تھا۔ انہوں نے روضۃ الشہداء کی تصنیف کی اور ایک مناجات لکھی۔ یہاں پر کلیات ولی دکنی کے صفحہ ۳۰۷ پر موجود کلام دیکھئے۔[1]

---

[1] دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، صفحہ ۷۷/۷۹

قبلہ اہل صفا شمشیر ہے
ہادی مشکل کشا شمشیر ہے
زندہ جاوید شہدا کیوں نہ ہوں
موجہ آب بقا شمشیر ہے

اس کے بعد دیکھئے قصائد اور منقبت کے اشعار میں کس طرح انہوں نے امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی شہادت کا ذکر کیا ہے

بعد ان کے ہیں دو امام جہان
نور چشم پیمبر مرسل
ہر دو سلطان کشور کونین
ہر دو مقبول شاہ روز ازل
ایک کا تن ہوا ہے اطلس سبز

اس کے بعد ان کے سلام کے اشعار دیئے جا رہے ہیں اور ان میں زبان اور بیان کی وہ خوبصورتی پائی جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے اردو کو کتنا صاف کیا اور بیان میں کتنی سادگی اور برجستگی دکھائی ہے۔ دیکھئے

غم حسین سے جس دل میں پیچ و تاب نہیں
وہ دل نہیں اگر اتنا بھی اضطراب نہیں
ہوا ہے اور نہ ہوگا کوئی شہید ایسا
جہاں میں آیا کہیں ایسا انقلاب نہیں

جوان بیٹوں کو قربان کر دیا رن میں
یہ صبر و شکر کا ان کے کوئی جواب نہیں
کٹا دیا ہے سر اعلائے کلمۃ الحق میں
حسینؑ ابن علیؑ کا کوئی جواب نہیں
خدا کے شیر کے وہ شیر تھے شجاعت میں
تھا جن کا معرکہ میں کوئی بھی جواب نہیں[۱]

اسی دور کے ایک اور شاعر اشرف افتخاری کے سلام کے کچھ شعر دیکھئے جو بحوالہ دکن میں اردو' مکاشفات میں ہیں، صفحہ نمبر ۳۵ پر اس سلام کے شعر آپ دیکھ سکتے ہیں

جانب کربلا جاکر وہاں کچھ دیر قیام
جہاں آسودہ ہیں مظلوم وہ شہدائے عظام
ہیں جہاں سید شہدا وہ اماموں کے امام
ان کو پہنچانا بصد عجز وادب میرا پیام
شہدائے کربلا سے میرا سلام کہنا[۲]

اس کے علاوہ اس دور کے اہم شاعر مرزا بیجاپوری، اور سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں عشقی، ہاشمی، شاہ قلی خاں شاہی، کاظم اور نوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر ان لوگوں نے زیادہ مرثیے ہی کہے ہیں جن کا ذکر ہم اپنے دوسرے باب میں کر چکے ہیں، اس لئے ہم یہاں پر وہی کلام پیش کریں گے جو دوسرے اصناف میں کہا گیا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی

---

[۱] کلیات ولی دکنی، صفحہ ۳۰۷

[۲] دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، صفحہ ۳۵

دکن میں شاعری کے عروج کی صدی تھی اس زمانے کے ایک شاعر بالک جی ترمیک نایک ذرہ کا کلیات حیدرآباد کے سرکاری کتب خانے میں ہے جسے دیکھنے کے بعد کوئی اسے غیر مسلم تو کیا غیر شیعہ بھی نہیں مان سکتا۔ یہ شعر دیکھئے۔

خدا کو صورت انساں میں دیکھا
علیؑ کو مظہر قرآں میں دیکھا

اس صدی کے پہلے نصف میں مرزا گولکنڈہ، درگاہ قلی خاں درگاہ، ہاشم علی برہان پوری، امامی، رضا، گجراتی، اور عزلت خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان کے علاوہ لچھمی نرائن شفیق، میر بہاالدین عروج، یہ سب اورنگ آباد کے شعراء ہیں، اب شاعری کا عروج اورنگ آباد میں ہو رہا تھا۔ یہاں سید عبدالولی عزلت کا نمونہ کلام دیکھئے۔

قتل عزلت سے نہ منکر ہو کہ گل کے مانند
لب پہ ہنستا ہے ترے خون نمایاں ترا

عزلت کے بعد لالہ لچھمی نرائن شفیق کا بھی نمونہ کلام دیکھئے

قتل پر کس کے چلا ہے یہ ستم گار کہ بس
آستینوں کو چڑھا کھینچ کے تلوار کہ بس

یہاں امام حسینؑ کے قتل کے لئے شمر نے جس طرح آستین چڑھا کر اور پشت پر سوار ہو کر گردن قطع کی اس کا بخوبی بیان کیا گیا ہے۔

داور، ولی کے ہم عصر تھے اور سراج میر غلام علی آزاد بلگرامی عبدالوہاب افتخار دولت

آبادی، ظفر بیگ ظفر، محمد فقیہ دردمند، مرزا محمد باقر شہید، مرزا رسا موسوی خاں جرأت اورنگ آبادی، عارف الدین خاں عاجز، موسوی خاں فطرت وغیرہ ان کے عہد کے ممتاز شعراء تھے ان حضرات کے یہاں کہیں نہ کہیں واقعہ کربلا سے متاثر کلام ضرور ملتا ہے، نمونہ کلام دیا جارہا ہے، شاعر ہیں نوازش علی خاں شیدؔا

دیکھے عباسؑ سرور کے علمدار
موئے بھائی پھرے نسارے ہیں یکبار
کسی کا سر نہیں ہے تن کے اوپر
کسی کے ہاتھ کٹ گئے ہیں سراسر
کسی کا تن ہے سب زخموں سے چور
پڑا نزدیک کوئی ہے کوئی دور

ان کے بعد جن شعراء نے شاعری میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے تو یا تو لاشعوری طور پر کیا ہے یا شعوری طور پر وہ استعارے استعمال کئے ہیں جو صاف طور پر واقعہ کربلا کے استعارے ہیں۔ ان شعروں کے نمونے بھی ہم پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن پہلے ہی واضح کردیا ہے۔ یہاں صرف اشارے ہیں یا استعارے ہیں کہیں نام لے کر نہیں کہا گیا ہے اصل میں یہ شعر غزل کے ہیں۔ یہاں غزل میں کربلا کے استعارے دیکھئے۔ شاعر میں محمد سیف اللہ انور اور دکن میں اردو کے صفحہ ۱۲۴ پر ان کا کلام موجود ہے۔ دیکھئے۔

مگر گنج شہیداں کا باغباں تھا اس بیاباں میں
جو لخت دل سوا کچھ اوگتا نہیں اس خیاباں میں[1]

---

[1] دکن میں اردو، صفحہ ۱۲۴

ان کے علاوہ لالہ موہن لال مہتاب کا بھی نمونہ کلام دیکھئے

تشنہ لب ہوں شراب کی سوگند
جل گیا جی کباب کی سوگند

یہاں جو تشنہ لبی، بیاباں، شمشیر، شہید، تیغ، تیر، شجاعت، جوہر، قتل، غصہ، سرخ، پوش، وغیرہ آرہے ہیں، یہ سب واقعہ کربلا کے استعارے ہیں، سراج اورنگ آبادی کے ایک شعر کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے

درشن دکھا کے آتش غم کو مری بجھا
میں تشنہ لب ہوں تشنۂ دیدار کی قسم

سراج

یہ اشعار بھی ''دکن میں اردو'' کے صفحہ ۳۷۱-۳۷۹، ۳۸۳-۳۸۸ پر موجود ہیں۔

آب تیغ نگہ کے پیاسے کوں
کم نگاہی کی مار مت پٹکا

مرزا داورا

یا پھر عاشق علی برہان پوری کے یہ اشعار جو تذکرہ محبوب الزمن کے صفحہ ۸۴۳ پر دیئے گئے ہیں۔ بحوالہ ''دکن میں اردو'' دیکھئے شاعر کس انداز میں کہتا ہے

جس وقت جان نکلی مجھ پاس کوئی نہ آیا
شمشیر تیری ایک دم بیٹھی تھی میرے سر پر

عاشق کا یہ شعر کافی واضح ہے اور یہاں اشارہ نہیں بلکہ صاف کہا گیا ہے

۱۔ دکن میں اردو، صفحہ ۳۷۱، ۳۷۹، ۳۸۳، ۳۸۸

ہیں شہید کربلا سب سرخ پوش
مصطفیٰ کی آل کا کیا رنگ ہے

اس کے علاوہ تذکرہ شعراء دکن گلزار آصفیہ میں مہر علی مہر کا یہ شعر درج ہے، بحوالہ "دکن میں اردو" صفحہ ۳۸۳ دیکھیے۔

آبرو پائی شجاعت نے عطائے فخر سے
موج نقس بوریائے جوہر شمشیر ہے
مہر علی مہر

رکھتا ہے آج قتل کا دل میں خیال تو
غصے کی برتری ہم نے یہ نظریں پچھانیاں

۱۱۷۷ء میں سراج اورنگ آبادی کا انتقال ہوا، ان کے علاوہ دیگر شعرا میں بآر، محرم، ایما، داغ، رنگین، مہدی، عزیز، صارم، مہر، پناہ، رضا، عراقی، مہتاب، شرافت، شہید، ضیا، کاظم، مبتلا، نجم، ہمدم، درد، حشمت، حاجی، قادر، فخر، فتوت، قدر، وغیرہ کا نام اس دور کے شعراء میں ہے لیکن جن جن کے کلام میں ہمیں جھلکیاں ملی ہیں ہم نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ محمود، صبامی، احمد، اعظیم، اس عہد کے شعرا ہیں یہاں ایک شعر مرزا عطا ضیاء کا دیکھیے

آزمانا تیغ ابرو کا اگر مرکوز ہے
فکر اتنی کیا ہے بسم اللہ ظالم ہم تو ہیں

یا افسر اورنگ آبادی کا یہ شعر بھی استعاروں پر مبنی ہے دیکھیے

قاتل لہو سے غسل تو دے کر لپیٹو
ہم بسملوں کی نعش گلابی کفن کے بیچ

ابو طالب خاں آشفتہ کا یہ شعر بھی اسی زمرے میں آتا ہے، جہاں جھلک دکھائی دے گی لیکن واضح شکل نہیں ملتی ہے

آشفتہ

کرنا ہے اگر قتل تو پھر دیر کی کیا وجہ
حاضر ہوں ترے روبرو جلاد کھڑا ہوں

محمد کرم بخش سالم کا ایک ایک شعر بھی یہاں دیکھئے

دیکھئے آتا ہے قاتل کس طرف خنجر بکف
ایک میں ہوں سو تو آپی بے رہا ہوں سر بکف

خواجہ محمد منعم خاں قدر کا ایک شعر بھی دیکھئے

نہ چھپ سکی مرے مرنے کی بات اے قاتل
کہ بوے قتل جہاں میں شتاب پھوٹے ہے

انیسویں صدی عیسوی میں دکن میں شاعری کا چراغ ماند پڑنے لگا گولکنڈہ اور بیجاپور سے اب اورنگ آباد کی طرف شاعری کا سفر گامزن تھا اورنگ آباد سے گجرات اور برہان پور ہوتے ہوئے اب شمال کی طرف یہ روشنی بڑھ رہی تھی، غلام رسول بیگ شوق کا یہ شعر دیکھئے

قدموں کے پاس شوق کو رکھنا امام دیں
مجھ کو چھڑا بلا سے بلا کربلا مجھے

محمد احمد اللہ واصل کہتے ہیں کہ

مدح شہ دیں سے یہ ملی نعمت عظمیٰ
باتوں میں ہے تاثیر زباں میں ہے اثر آج

جنہیں انیسویں صدی عیسوی میں دکن میں شاعری کا چراغ ماند پڑنے لگا، گولکنڈہ اور بیجاپور سے اب اورنگ آباد کی طرف شاعری کا سفر گامزن تھا اورنگ آباد سے گجرات اور برہانپور ہوتے ہوئے اب شمال کی طرف یہ روشنی بڑھ رہی تھی۔ غلام رسول بیگ شوق کا یہ شعر دیکھئے

قدموں کے پاس شوق کو رکھنا امام دیں
مجھ کو چھڑا بلا سے بلا کربلا مجھے

محمد احمد اللہ واصل کہتے ہیں

مدح شہ دیں سے یہ ملی نعمت عظمیٰ
باتوں میں ہے تاثیر زباں میں ہے اثر آج

جنہیں عشق سرور دیں ملا انہیں ہر بلا میں مزا ملا
کوئی دل کے زخم سے شاد ہے کوئی اپنے زخم جگر سے خوش

میر اسد علی خاں آصفی کا شعر بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں ہے دیکھئے

گھر سے جب بہر سفر حضرت شبیر چلے
سر کٹانے کے لئے مالک تقدیر چلے

عزیز قتل ہوئے اس جناب سے پہلے
ستارے ڈوب گئے آفتاب سے پہلے

تراب علی خاں سعید نے حضرت سکینہ کے لئے اپنے جذبات کا اظہار اپنے ان اشعار میں کیا ہے یہ شعر بطور نمونہ پیش ہے

شہ کے سینے پر سکینہ مدتوں سوتی رہی
ایک دن آیا کہ سب خواب پریشاں ہوگیا

یہاں پر سعید نے عابد بیمار کے لئے اظہار غم ودرد اس طرح کیا ہے

ناتوانی عابد مضطر کی اور منزل کڑی
کس قیامت کی تھی حسرت دیدۂ زنجیر میں

اور امام حسین علیہ السلام کے لئے انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے

ایک پیاسے کی لڑائی نے یہ ثابت کردیا
کس شجاعت کا اثر تھا فاطمہؑ کے شیر میں

اسی طرح میر محمد علی سرور نے اپنے اشعار میں حضرت عباسؑ کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے

کہاں علیؑ کی سب اولاد اور کہاں عباسؑ
ضرور چاند وہ سب ہیں مگر یہ ماہ منیر

ان کے شعر کے بعد ہم علامہ علی حیدر طباطبائی کی ایک نظم کے شعر یہاں دے رہے ہیں۔علی حیدر صاحب کے یہ اشعار صفحہ ۶۸۳ ''دکن میں اردو'' پر دیکھے جاسکتے ہیں ۔[1]

وہ داغ روز روشن ہے گجر شام غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا عالم ہے

مرزا علی جعفر نے جنگ کا ایک منظر اس طرح نظم کیا ہے کہ آنکھوں کو نظر آجاتا ہے، دیکھیے

بجلی گری کہ تیغ چلی فوج شام پر
نازل خدا کا قہر ہوا خاص و عام پر
قرباں تھی برق ابن علیؑ کے حسام پر
سکہ تھا جس کا قلب حزیماں و سام پر
بے کار حرب ہوگئے حرب اس کو کہتے ہیں
تھے مدح خواں حریف بھی ضرب اس کو کہتے ہیں

---

[1] دکن میں اردو، صفحہ ۳۸۳، نصیر الدین ہاشمی

اب شاعری کا سفر شمال کی طرف تھا اس دور کے شعراء، کے بعد ولی دکنی، سراج الدین خاں آرزو، مرزا شمس الدین جان جاناں مظہر، میر امانی امانی، اشرف علی خاں فغاں، میر عبدالحی تاباں، مرزا محمد سودا، میر محمد تقی میر، شیخ غلام علی راسخ، انشاء اللہ خاں انشاء، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، بہادر شاہ ظفر، شیخ میر بخش سرور، شیخ امام بخش ناسخ، محمد ابراہیم ذوق، خواجہ حیدر علی آتش، مومن خاں مومن، اعظم الہ آبادی، غافل لکھنوی، تعشق لکھنوی، منشی امیر مینائی، داغ دہلوی، شاد عظیم آبادی۔ یہ سب انیسویں صدی کے وہ شعراء ہیں جنکے کلام میں خاص طور پر غزل میں برملا اور کہیں کہیں استعارے کی شکل میں واقعہ کربلا کو استعمال کیا گیا ہے۔

دراصل عالمگیر کے دور میں دہلی میں اردو شعر گوئی نے رواج پایا محمد شاہ کے دور میں امید، رداد، علی قلی خاں ندیم، گلشن، مرتضیٰ قلی خاں فراق، فقیر، بیدل، آرزو، وغیرہ نے خوب طبع آزمائی کی۔ آبرو، حاتم، ناجی، مضمون، مرزا مظہر جان جاناں کا ذکر بھی بطور خاص ہے۔ ان کے بعد شاہ عالم کے دور میں مظہر، سودا، میر، قائم وغیرہ نے اردو شاعری میں کہیں کہیں واضح اور کہیں اشارے میں کربلا کو استعمال کیا ہے، نمونہ کے لئے سب سے قبل ہم مرزا محمد رفیع سودا کا کلام پیش کررہے ہیں۔

ان کے دیوان سے یہ نمونہ کلام لیا گیا ہے۔

دیکھ خفا جس کو ذرا کہتے تھے رسول
لال کو میرے فاطمہ نے کیوں کیا ملول

سو جفاکشوں کے تیر ظلم سے کربل میں بھال
وہ جبیں لوہو سے ہے تر ہائے سرور ہائے ہائے

گلا کٹا لوہو چوے چھبے زخر میں بھال
کہ جس کا ناتی یوں مرے نانا کا کیا حال

مرے خون ناحق کی دے گی گواہی
شہادت کو بس ہے مری بے گناہی!ا

سودا کے کلام کے بعد ہم خدائے سخن میر تقی میر کے کلام کو پیش کررہے ہیں۔
(۱۷۲۲ء)۲

تیرا کوچہ ہے ستم گار وہ کافر جاگہ
کہ جہاں مارے گئے کتنے مسلمان یک جا

کیوں کہ پڑتے ہیں تیرے پاؤں نسیم سحری
اس کے کوچے میں ہے صد گنج شہیداں یک جا

اپنے جی ہی میں نہ آئی کہ پئیں آب حیات
ورنہ ہم میر اسی چشمے پہ بے جان ہوئے

کیا معاش اس غم کدے میں ہم نے دس کی بہم
اٹھ کے جس کے ہاں گئے دل کا لئے ماتم گئے

ا دیوان سودا، مرزا محمد رفیع سودا، صفحہ ۴۶، ۴۷

۲ کلیات میر، اخذ، میر تقی میر

پیٹ لینا سر لئے دل کے شروع عشق تھا
سینا کوبی متصل ہے اب یہ ماتم اور ہے

مطلق اثر نہ دیکھا مدت کی آہ و زاری
اب نالہ و فغاں سے بے زاری ہوگئی ہے

منھ دھو ہزار پانی سے سو بار پڑھ درود
تب نام لے تو اس چمنستان کے پھول کا

حاصل ہے میر دوستی . اہل بیت اگر
تو غم ہے کیا نجات کے اپنی حصول کا

روتے کڑھتے خاک میں ملتے جیتے رہے ہم دنیا میں
دن اپنی عمر کے گویا عشرہ تھا یہ محرم کا

سینہ زنی ہے غم زدگی ہے سر دھنا ہے رونا ہے
دل جو ہمارا خون ہوا ہے اس سے بلا ماتم ہے اب

چھاتی کٹتی سنگ ہی سے دل کے جانے میں نہیں
نعل سینوں پر جڑے جاتے ہیں اس ماتم کے بیچ

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہوا تو سلام کریں

دست کش نالہ پیش رو گریہ
آہ چلتی ہے یاں علم لے کر

زیر شمشیر ستم میرے تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں جھکایا نہ گیا

خوں میں لوٹوں کہ میں لوہو میں نہاؤں اے میر
یار ہے اس کو مری پروا کیا ہے

میر کے کلام میں جا بجا واقعہ کربلا کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، کہیں واضح شکل میں تو کہیں پر اشارے میں اور استعارے میں میر تک آتے آتے غزل میں بخوبی ان استعاروں کا استعمال ہونے لگا۔ میر کے بعد ہم غالب (۱۷۹۸ء) کے کلام کا جائزہ لیں گے۔ غالب کے یہاں بھی بہت سے ایسے اشعار ہیں جو کربلا کی خوشبو سے مہک رہے ہیں اور کربلا کے رنگوں میں کہیں سرخی بکھیر رہے ہیں کہیں سیاہی اور کہیں سبزی پیش کر رہے ہیں۔ غالب کے اشعار نمونے کے طور پر یہاں پیش کئے جائیں گے۔ جو کہ دیوان غالب سے چنے گئے ہیں۔ ''دیوان غالب''

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
حالانکہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی[1]

غالب کے بعد ہم کلام مومن خاں مومن پیدائش ۱۸۰۰ء کے کلام کا جائزہ لیں گے۔ یہ اشعار ہم نے انتخاب مومن سے صفحہ نمبر ۳۰ سے لئے ہیں یہاں شاعر نے امام کی شہادت کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہا ہے

سجدے پہ سر قلم ہو دعا پر زباں کٹے
گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

بار گردن تو نہیں تیغ ستم گار آخر
جاں نثارو سر مشتاق جھکاتے کیوں ہو[1]

ان اشعار کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کربلا میں ''سجدہ حسینؑ'' کے منظر کو قلم

---

[1] کلام مومن خاں مومن، انتخاب مومن، صفحہ نمبر ۳۰

بند کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ ستمگر کی تیغ کا ذکر بھی اسی پس منظر میں ہے۔ ان اشعار میں ہم اس واقعہ کو محسوس کر سکتے ہیں کہ کربلا یہاں جلوہ افروز ہے

غالب کہتے ہیں

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب کے اشعار کے بعد یہاں ذوق کے کچھ شعر بھی ہیں یہ شعر دیکھئے

لکھوں جو میں کوئی مضمون ظلم چرخ بریں
تو کربلا کی زمیں ہو مری غزل کی زمیں

بہر حال دہلی کے حالات بدلے زمانے کے رنگ بدل گئے، اور وقت کی کروٹ نے دہلی کی تمام رونقیں لکھنؤ کے دربار و بازار میں پہنچا دیں۔ شعراء کا رخ بھی لکھنؤ کی سمت ہو گیا۔ اب شاعری لکھنؤ میں پھل پھول رہی تھی اب سراج الدین خاں آرزو، میر تقی میر، سودا، خواجہ میر درد، وغیرہ کے بعد جرأت، انشاء، مصحفی، رنگین، مرزا سلیمان شکوہ، شاہ حاتم، قتیل، میر حسین، مرزا مظہر جان جاناں، جعفر علی خاں حسرت، بقا وغیرہ کے بعد ناسخ و آتش کا زمانہ ہے۔ انس و دبیر، غالب و مومن کے بعد رشک، سحر، منیر، جلال، برق، واجد علی شاہ اختر لکھنوی، امیر کا زمانہ ہے، ان لوگوں میں جن شعراء کا کلام مل سکا ہے، یعنی جو ہمارے موضوع کربلا سے

متاثر کلام ہمیں ملا ہے وہ یہاں پر تحریر کیا جا رہا ہے۔ ناسخ کا یہ شعر یہاں دیا گیا ہے جس سے صاف طور پر کربلا جلوہ گر ہے دیکھئے۔

بلند ہیں علم آہ و شعور ماتم ہے
غم فراق سے گھر میں مرے محرم ہے
ناسخ[1]

اسی طرح رشک کا بھی ایک شعر یہاں پیش ہے

ایک ہم تھے آتش گل پر جو روئے مدتوں
ایک وہ بھی تھے جو جلتا آشیاں دیکھا کئے

اور جب مصحفی نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا تو بے ساختہ کہہ اٹھے

ہندستان نمونہ دشت بلا ہے کیا
جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

اور مرزا جعفر علی حسرت دہلوی فرماتے ہیں کہ

لاکھوں ہی بے کس اس میں تڑپے ہیں خاک وخوں میں
کوچہ ہے ترا ظالم یا دشت کربلا ہے

منشی امیر مینائی نے ایک شعر میں اس طرح اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے یہاں پر دیکھئے ع

ترا گھر ہے کہ ظالم کربلا ہے

---

[1] اردو غزل اور کربلا، یہ شعر، صفحہ ۲۳، پر ہے، سید ضمیر اختر نقوی

بہادر شاہ ظفر نے اس مضمون کو اس طرح کہا ہے

ترسا نہ آب تیغ سے ظالم تو کر شہید
کوچہ نہیں ہے تیرا کم از کربلا مجھے

اور یہاں مولانا حسرت موہانی کا ایک شعر دیکھئے

ہوگیا راہ عشق میں جو شہید
وہ فنا ہوکے بھی فنا نہ ہوا

اور خواجہ میر درد نے اس اظہار کو کیسے ادا کیا ہے ایک شعر میں دیکھئے

فضا میں کیوں تلاطم ہے ہوائیں کیوں پریشاں ہیں
اسیران بلا کس کو قفس میں یاد کرتے ہیں

اب آتش کے اشعار کا جائزہ لیجئے تو انہوں نے قید زنداں اور زنجیر کو کربلا کے ہی استعاروں کی شکل میں برملا استعمال کیا ہے۔ پیدائش خواجہ حیدر علی آتش ۱۷۶۸ء۔ آتش کہتے ہیں

ساری رونق ہے یہ دیوانوں کے دم سے آتش
طوق و زنجیر سے ہوتے نہیں زنداں آباد

پریشاں عاشقوں کی خاک کے ذرے تو ہیں دیکھیں
جگہ کس کس کو دے دیوار قصر یار روزن میں

صورت برگ خزاں جھڑتے ہیں ہر گام گناہ
جب اٹھاتے ہیں تری راہ میں زوار قدم

موت کے آتے ہی ہم کو خود بخود نیند آگئی
کیا اسی کی یاد میں کرتے ہیں شب بیداریاں

ترے شہیدوں کے آگے نہ رنگ پکڑے گا
ہزار رنگ سے ہو لالہ گلستاں سرخ

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

لالہ و گل ہیں زمیں پر تو فلک پر ہے شفق
رنگ کیا کیا ہوئے خون شہدا سے پیدا

دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو
یہ مشت خاک ہوئے کربلا کی خاک سے پیدا

آتش اہل کربلا سے چل کے اب کہتا ہوں میں
اے خوشا طالع تمہارے ساکنان کوئے دوست

آتش غم حسینؑ میں رو نہیں رہا ہے کیا
سطریں کی سطریں نامہ عصیاں سے دور ہوں

اک سال میں دس دن بھی جسے غم نہیں ہوتا
وہ شہر ہے جس میں کہ محرم نہیں ہوتا

اسی ضمن میں ہم کچھ اشعار یہاں پر حسرت موہانی کے تحریر کر رہے ہیں۔ تاریخ پیدائش ۱۸۷۵ء

کافی ہیں میرے بعد پشیمانیاں تری
میں کشتہ وفا ہوں مرا خوں بہا ہے کیا

کیا نہیں شوق شہادت کو یہ کافی اعزاز
کہ مرا سر ہے ترے نوک سناں کی رونق

تم پر مٹے تو زندہ جاوید ہوگئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

ہو گیا راہ عشق میں جو شہید
وہ فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوا

کافی ہیں میرے بعد پشیمانیاں تری
میں کشتہ وفا ہوں مرا خوں بہا ہے کیا

لذت عشق کب ملی جب تک
سر تہہ خنجر جفا نہ ہوا

مصحفی کے چند اشعار بھی یہاں یکجا کیئے گیے ہیں

مصحفی دشت بلا کا سفر آساں کیا ہے
سیکڑوں بصر و شیراز میں مرجاتے ہیں

مصحفی شاعری رہی ہے کہاں
اب تو مجلس کے روضہ خواں ہیں ہم

تمہارے ساتھ میاں مصحفی ہیں جوق کے جوق
مگر تم آئے ہو مجلس سے مرثیہ پڑھ کر

کچھ میں شاعر نہیں اے مصحفی ہوں مرثیہ خواں
سوز پڑھ پڑھ کے مجبوں کو رلا جاتا ہوں

اور اب ہم داغ دہلوی کے چند اشعار بھی بطور نمونہ یہاں پیش کر رہے ہیں

شریک روح بھی میری ہے میرے ماتم میں
شمول اہل عزا اور کون ہے میں ہوں

کریں تم سے ہم بے رخی توبہ توبہ
یہ کوفی کریں گے یہ شامی کریں گے

دشمن کے آگے سر نہ جھکے گا کسی طرح
یہ آسماں زمیں سے ملایا نہ جائے گا

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے یہ کام کس کا تھا

یہاں غالب کے چند اشعار جو کہ ضمیر اختر نقوی کی اردو غزل اور کربلا کے صفحہ ۸۰ پر دیئے گئے ہیں دیکھئے

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

گلشن دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم
شبنم اس باغ میں جب آئے تو گریاں آئے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

رونے سے اے ندیم ملامت کر نہ مجھے
آخر کبھی تو عقدہ دل وا کرے کوئی

معلوم ہوا حال شہیدان گزشتہ
تیغ ستم آئینہ تصویر نما ہے

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کئے ہوئے

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے[1]

بظاہر یہ عشقیہ شاعری کے اشعار ہیں، لیکن ان اشعار کی امیجری پر تاریخ کی پرچھائیں پڑتی صاف نظر آتی ہے۔ ان سب اشعار میں نالہ، گریہ، غزل کی شاعری کے عام الفاظ ہیں، لیکن ان میں جب شہید، کشتہ، ظلم، قید، ستم، زنجیر پا، شام غریباں، کوفہ و شام، بے پردگی، شانوں کا قلم ہونا، سر کٹنا، سجدۂ خالق، تہ تیغ، تہ شمشیر، تہ خنجر، معصوم وغیرہ کا ذکر آتا ہے تو ذہن کو صاف طور پر کربلا کے استعارے نظر آجاتے ہیں۔ یا پھر جب تشنگی کا ذکر ہوتا ہے تو پیاس و صحرا کا نام آتا ہے، غزل کے اس قسم کے اشعار میں اس تاریخی حوالے کا خاکہ جابجا نظر آجاتا ہے۔

اس سلسلے میں مولانا فضل الحسن حسرت کا ذکر بھی آتا ہے، ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۲ء تک ان کی شاعری کا دور ہے، ان کے کلام سے بھی چند نمونے جمع کیے ہیں جو کہ یہاں پر پیش کیے جائیں گے۔[2]

تھے حق پہ وہ بے شک کہ نہ ہوتے تو نہ ہوتا
دنیا میں بپا ماتم شبیر ابھی تک

---

1. اردو غزل اور کربلا، سید ضمیر اختر نقوی، صفحہ ۵۰، نے ۹۰ تک
2. انتخاب سید فضل الحسن حسرت موہانی، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام، صفحہ ۹۰

ہم سر جھکا چکے تھے علم ہو چکی تھی تیغ
پھر کیا کیا خیال کہ قاتل ٹھہر گیا

اوران کے سلام کے کچھ اشعار بھی دیئے جارہے ہیں

امام برحق اہل رضا سلام علیک
شہید معرکہ کربلا سلام علیک
ثبوت یہ ہے کہ نور شہادت کبریٰ
تری جبیں سے نمایاں ہوا سلام علیک
عبث ہے اور کہیں راہ صبر و حق کی تلاش
تری مثال ہے جب رہنما سلام علیک

ترے سرفروشوں میں ہے کون ایسا
جسے دل سے شوق شہادت نہیں ہے

تم پر مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

نہ کیا بار غم کسی نے قبول
غیر انسان کا تھا ظلوم و جہول
بر روح پر فتوح حسینؑ
نور چشم علیؑ و جان بتولؑ

نوجوان خلد کے سردار
گلبن دوحہ رسولؐ کے پھول
جملہ ارباب صبر و فقر و فنا
جن سے سیکھے ہیں عاشقی کے اصول
جن کے روضے پہ رحمت حق کا
روز ہوتا ہے کربلا میں نزول

کیا نہیں شوق شہادت کو یہ کافی اعزاز
کہ مرا سر ہے ترے نوک سناں کی رونق

ہم بھی گرویدۂ شہادت ہیں
آپ کو ہے جو امتحان عزیز

غضب کا سامنا ہے عاشقوں کو
دیار حق میں افواج بلا کا

قاتل ترے دامن پہ مرے خون کے دھبے
کچھ اور بھی خنجر سے چھٹانے میں لگے ہیں

غم نہ ہو ممکن تو چار آنسو ندامت کے سہی
کچھ تو آخر حرمت خون شہیداں کیجئے

بہر حال ان شعراء کے کلام کے نمونے دیکھنے کے بعد اب ہم یہ بات ثابت کر چکے ہیں دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ آنے والے شعراء میں جو لوگ واقعات کربلا سے متاثر ہو کر شعر کہہ رہے تھے وہ اپنے حالات اور کربلا میں کہیں نہ کہیں مماثلت ضرور محسوس کر رہے تھے اس دور میں منت، حسرت، میر، مصحفی، انشا، جرأت وغیرہ کا کلام ہم نے پیش کیا ہے، یہ اس دور کے اہم شعراء ہیں چونکہ ڈاکٹر سید سکندر آغاز نے ''مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی'' (حیات اور ادبی کارنامے) تحقیقی مقالے میں صفحہ نمبر ۳۰ پر تحریر کیا ہے کہ

> ''میر قمر الدین منت (متوفی ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء) جعفر علی حسرت (متوفی ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۴ء) انشاء اللہ خاں انشاء (متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء) قلندر بخش جرأت (متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) آسمان شاعری کے وہ تابندہ ستارے ہیں جن کی ضوفشانی سے تاریخ ادب جگمگاتی رہے گی۔[1]

یہ انیسویں صدی کے تمام مشاہیر ہیں ان کے کلام میں واقعہ کربلا کی بازگشت سنی جا سکتی ہے اور اس عظیم سانحے کی گونج اب تک سنائی دے رہی ہے، اس وقت ادب میں کربلا کا جس طرح سے استعمال کیا گیا بعد کے آنے والے شعراء نے انہیں کی روشنی میں اپنا آگے کا سفر طے کیا ہے اور منزل کا تعین کیا۔ اس طرح سے ایک سفر طے کرتی ہوئی یہ روایت آج بھی گامزن ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب ہم نظموں کا مطالعہ بھی کر لیں کہ کہاں سے آزاد نظموں کا سلسلہ شروع ہوا مگر سلسلہ نہ کہہ کر ہم یوں کہیں کہ آج کل کی اور ترقی پسند شاعری کا رجحان شاعری میں کہاں اور کس طرح سے آیا اسے دیکھنے کے لئے چند شعراء کی نظمیں دیکھنی پڑیں گی ان میں سے 'دکن میں اردو' کے صفحہ نمبر ۶۸۳ پر میر عثمان علی خاں کی ایک نظم ہے دیکھئے یہ دکن کے شاعر تھے

---

[1] مرزا محمد اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے، صفحہ ۳۰، مرتبہ سید سکندر آغاز

یہ کرنا عرض اے بادِ صبا پیمبرؐ سے
کہ غم میں آپ کے دریا رواں ہے دیدۂ تر سے
کہو اشک و فغاں سے ذکر ہوتا ہے شہیدوں کا
گرجنا ہو جسے گرجے برسنا ہو جسے برسے
خدا کی شان اک قطرہ نہ پہنچا حلق تک شہ کے
مگر ہے تیغ کا پانی کہ اونچا ہوگیا سر سے
جو دل کے سخت ہیں وہ بھی غم سرور میں گریاں ہیں
عجب تاثیر ہے پانی نکل آتا ہے پتھر سے[1]

اسی طرح دکن کے ایک اور شاعر محکم کے یہاں بھی نظم میں یہی مضمون باندھا گیا ہے۔ دیکھئے

دہائی تم کو دیتی ہوں نبی کی
بجھا دو تشنگی اصغر علی کی
مصیبت مجھ بہو پر پڑی ہے
مرے اصغر کو اب ہچکی لگی ہے

بلا کیسی کربلا میں پڑی شاہان تج اوپر
مج بلا لان تیرے نیکیاں ہو راندھا را حسینؑ
سن خبر یوں مصطفیٰ اسوں جگت تھا را ملول
تو حلکلوں ہوا غم بودھر یار را حسینؑ

---

[1] دکن میں اردو، صفحہ ۶۸۳، نصیر الدین ہاشمی

اور یہ اشعار ـــــ ولی دکنی کی نظم یا سلام سے لئے گئے ہیں، صفحہ ۳۰۴، ''دکن میں اردو''

اے ہادی بینار تو کیوں جا بسا یا کربلا
اے واقف اسرار تو کیوں جا بسا یا کربلا
اے نور چشم مصطفیٰ فرزند نوشاہ مرتضیٰ
اے دلبر خیرالنساء تو کیوں جا بسایا کربلا
تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے
تجھ پر ولی قربان ہے تو کیوں جا بسایا کربلا

اور یہ قادرالکلام کا نمونہ دیکھئے

بحوالہ ''دکن میں اردو'' صفحہ ۲۵۱ پر

روایت ہے یو حضرت عباس سوں
لکھے ہے کتابوں میں اخلاص سوں

ان کے بعد میر محمد علی مسرور کے کلام کا نمونہ دیکھئے

دکھایا حضرت عباس نے جمال پدر
علیؑ نے پائی ہے آج اپنی تیسری تصویر

اور یہاں پر کمال خاں رستمی کے نظم کی طرز کے اشعار بھی پیش کئے جا رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ سلام کے شعر ہوں مگر نظم کا ہی انداز ہے دیکھئے

ہر ایک طرف کشتے سوں کشتے لگے
نہیں کوئی لڑتے تھے اس میں سکے

سر نیزہ سیتاں سوخ کشتاخ ہو
ہوئے بھوت سینے میں سوراخ ہو
ہوا مرد ماں تھے دریا سارا سیاہ
جو کشتی کوں جاتے نہیں اپڑی راہ
تن مرد ماں تیوں جاگا سارا بھریا
لہوگی جانو دتی تھی سب دریا

ان کے بعد نوازش علی خاں شیدؔا صفحہ ۳۸۸ پر ان کا کلام موجود ہے جو نظم کے انداز میں ہے، دیکھئے

دیکھئے عباسؑ سرور کے علم دار
موے بھائی سارے پرے ہیں یک بار
کسی کا سر نہیں ہے تن کے اوپر
کسی کے ہاتھ کٹ گئے ہیں سراسر
کسی کا تن ہے سب زخموں سے چور
پڑا نزدیک کوئی ہے کوئی دور

اور یہ احمد اللہ واصل کا کلام بھی دیکھئے جو کہ صفحہ نمبر ۵۶۶ پر ہیں

مدح شہ دیں سے ملی یہ نعمت عظمیٰ
باتوں میں ہے تاثیر زباں میں ہے اثر آج

ان کے بعد میر اسد علی خاں آصفی کا کلام بھی دیکھئے یہاں وہ مدینے سے جب امام حسین علیہ السلام شہادت کے سفر پر نکلے تھے اسی گھڑی کا منظر انہوں نے یوں قلم بند کیا ہے

گھر سے جب بہر سفر حضرت شبیر چلے
سر کٹانے کے لئے مالک تقدیر چلے
عزیز قتل ہوئے اس جناب سے پہلے
ستارے ڈوب گئے آفتاب سے پہلے

اور یہ ہے نوازش علی شیدؔا کا کلام ہے شاعر نے امام حسین علیہ السلام پر ظلم اور پانی بند کرنے کی بے داد کا ذکر کرتے ہوئے مدحیہ انداز میں نظم کہی ہے۔ کلام دیکھئے

عمر دیکھا کہ پانی سے چلے ہیں
بہادر ان کے آگے سے ڈھلے ہیں
اگر پیویں گے یہ پانی وہ پیاسے
کریں گے جاں سے ہم کو وہ ترا سے
سو مروانے کو اک سرور کے تیئں
وہ بھیجا چار ہزار سوار دے ڈھیں

ان کے کلام کے بعد اب مرزا علی تقی ایجاد کا بھی کلام دیکھئے

اے شہسوار دوش نبی کیا کروں بیاں
اس روضہ مبارک عرش آستاں کا
قربان ہے اس مکاں و مکیں پر سخن کا حال
اس جائے پر دل اہل معانی کا ہے فدا

اور یہ واجد علی شاہ اختر کے کلام کا نمونہ دیکھئے

دشت و کوہ نور و نار و شمس و ماہ و خاص و عام
خشک و تر سرخ و سفید ان سب کا مالک ہے امام
شہر یار ملک ہمت قاطع بازوئے کفر
تاجدار شہر غربت راز دار خاص و عام
سبط احمدؐ روح زہرا پارۂ جان علیؑ
اے حسنؑ کے بھائی نور دیدۂ خیرالانام

اس کے بعد انیس و دبیر کے مرثیوں کی چمک میں اس وقت کی شاعری ماند پڑنے لگی۔ دراصل ان سے پہلے یہ سلسلہ خلیق اور ضمیر اور میر حسن سے چلا تھا، لیکن ان کے دور میں تو بس مرثیوں کا ہی سکہ چلنے لگا اور انیس نے شاعری کو وہ رنگ عطا کئے کہ جن کی مثال ملنا مشکل ہے، بہرحال ان سب کے بعد رشک، سحر، منیر، جلال، برق، واجد علی شاہ اختر، میر وغیرہ کا دور بعد بعد کا دور ہے، اور یہاں سے پھر انقلابات اور اتھل پتھل بھی شروع ہوگئی ہے اب ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، برق، بحر، مہر، نادر، آباد، طاہر وغیرہ بعد کے شعراء ہوئے ہیں اور آتش کے شاگردوں میں رند، صبا، خلیل، نسیم نواب مرزا شوق، آغا جو شرف وغیرہ ہیں، ان سب کے بعد واجد علی شاہ اختر کا دور آتا ہے، اس عہد میں اسیر، برق، امانت، قلق، بحر، سحر، ذکی، درخشاں، قبول، شفیق، بے خود، ہنر، عطا، ہلال، سرور وغیرہ مشہور شعراء تھے، ان کے علاوہ غالب کے شاگردوں میں نیر، درخشاں، مجروح، سالک، خواجہ الطاف حسین حالی، ذکی کاکوروی، عزیز، مشتاق، جو ہر قابل ذکر شعراء رہے ہیں، ان میں سے جن جن شعراء کا نمونہ کلام دستیاب ہوا ہے وہ یہاں پر بھی دیا جارہا ہے۔ دیکھئے۔[1]

---

[1] دیوان شوق

مرزا شوقؔ

آئی نوچندی اتنے میں ناگاہ
اس بہانے سے آئی وہ درگاہ

جائے عبرت سرائے فانی ہے
مورد مرگ نوجوانی ہے

جھوٹے کی جان پر ستم ٹوٹے
شاہ عباس کا علم ٹوٹے

اسیرؔ

فراق یار میں روتا ہوں میں یوں باندھ کر مضموں
شبیہیں تعزیوں کی جیسے بنتی ہیں محرم میں

ماہرو بھی بے غرض ملتے نہیں ہیں اے اسیر
ذرا انہیں بھی چاہئے ماہ محرم کی طرح

وہ خاکسار ہیں کہ پس مرگ بھی اسیر
ذرے ہماری قبر میں خاک شفا کے ہیں

دل چاک چاک ابروئے خم دار نے کیا
کعبہ کو کربلا تری تلوار نے کیا

جنت میں قصر لعل و زمرد ملے اسیر
اس وجہ سے کہ عشق حسینؑ و حسن رہا

اسیر اب بدلے غزلوں کے ہے لازم مرثیہ کہنا
ہوا سامان ماتم دن قریب آئے محرم کے

رشکؔ

مانگتا ہوں یہ دعا اے رشک ہر تعقیب میں
روضہ شبیرؑ میں پاؤں جماعت کی نماز

اے رشک کربلا و نجف کی لگی ہے لو
مطلب نہ لکھنؤ سے نہ کچھ کانپور سے

مہ صیام و محرم میں خاک سوئے رشک
غم حسینؑ جدا داغ بوتراب جدا

دفن چہلم کو ہوا ہے لاشہ شاہ شہید
رشک رکھتا ہے غم سبط نبی چالیس دن

ہیں رشک کے دو شفیع محشر
اک سرخ ہے اک مہ مبیں سبز

رشکؔ کے ان اشعار میں محرم کا جا بجا ذکر ہے ان کے بعد کے شعراء میں شاد عظیم آبادی، پیدائش ۱۸۴۶ء کا ذکر آتا ہے، ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش ہے

ہماری قدر تھی لازم خوش اعتقادوں کو
ہزار خاک تھے پھر خاک کربلا تھے ہم

تشنہ شوق اگر آتے ہیں مقتل کی طرف
آب شمشیر سے بجھ جائے گی پیاس آنے دو

یہیں گر اپنے شہیدوں کو تو جگہ دیتا
یہی گلی تری صحرائے نینوا ہوتی

ان کے بعد ریاض خیرآبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، مرزا یاس، یگانہ وغیرہ کا دور ہے، لیکن یہ شعراء بیسویں صدی کے ہیں، اس لئے ہم ان پر تفصیل سے ذکر آگے چل کر کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے دو اہم شخصیتوں کا ذکر بے حد اہم ہے ان میں ایک کا نام خواجہ الطاف حسین حالی کا ہے۔

حالی نے اپنی شاعری کے تیسرے دور ۱۸۹۳ء سے ۱۹۱۴ء تک جو کچھ کہا ہے اس کلام میں قوم اور ملک کی بدحالی اور تباہی کا بیان ہے۔ حالی کا دردمند دل حادثات اور انقلابات سے بے حد متاثر ہوا اور ان جذبات کے اظہار میں ان کی شاعری میں کہیں بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ کربلا سے وابستہ اشعار ملتے ہیں۔ جیسے یہ شعر:

پردہ ہو لاکھ کینہ شمر و یزید کا چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا

یہاں پر صاف لفظوں میں انہوں نے حق کے شہیدوں کو ظلم کے لشکر پر فاتح دکھاتے ہوئے حق و باطل کے فرق کا ذکر کیا ہے

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

گو صبح بھی تھی روز مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش[۱]

مولانا محمد علی جوہر دوسرے اہم شاعر ہیں انہوں نے قتل حسینؑ کی عظمت اور اہمیت پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے
اب ادعائے پیروئی پنجتن کہاں

کربلا میں خیر و شر کے دو لشکر آمنے سامنے تھے۔ دشت کربلا کیسا پر خطر تھا، جوہر کہتے ہیں

۱۔ انتخاب غزلیات حالی، مرتبہ شجاعت علی سندیلوی

کہتے ہیں لوگ ہے رہ ظلمات پُر خطر
کچھ دشت کربلا سے سوا ہو تو جانئے

حق کی پیروی محمد علی جوہر اس انداز سے کرتے ہیں

جب تک کہ دل سے محو نہ ہو کربلا کی یاد
ہم سے نہ ہوسکے گی اطاعت یزید کی

بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی
ہوجائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا

اوران اشعار میں مولانا نے اپنے عہد کی بے چینی کو کربلا سے شامل حال کر کے کہا ہے

کربلا ہے بہانہ کوثر
جایئے صدقہ اس بہانے کے

سینچا تھا اس کو اپنے لہو سے حسینؑ نے
اب چاہے اس چمن کو خزاں دے بہار دے

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پہ شوخی خون شہید دیکھ

ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس درجہ ستا دیکھ

ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا
راز فتح سبط پیمبرؐ کھلے

ماتم شبیر سے آمد مہدئ تلک
قوم ابھی سوگوار دیکھیے کب تک رہے

ہم عیش دو روزہ کے بھی منکر نہیں لیکن
ایمائے شہ کرب و بلا اور ہی کچھ ہے

خود خضر کو شبیرؑ کی اس تشنہ لبی سے
معلوم ہوا آب بقا اور ہی کچھ ہے

باب چہارم

بیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی کشمکش

(الف)

آزادی کی جدوجہد،

جلیاں والا باغ کا واقعہ

خلافت تحریک

مسلم لیگ کا قیام اور مطالبہ پاکستان

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات

گاندھی جی کی ہندوستان چھوڑو تحریک

ملک کی آزادی اور پاکستان کا قیام

تقسیم ملک کے نتائج

(ب)

ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریات

ترقی پسند شاعری میں عوام اور سماجی کشمکش کا مطالعہ

دراصل یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دور میں کسی بھی ملک کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات کا اثر وہاں کے ادب پر سب سے زیادہ پڑتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بیسویں صدی کی ابتدا میں آزادی کی جنگ اور جدوجہد کے بھرپور اثرات یہاں کے ادب پر بھی پڑ رہے تھے۔ اس وقت کے ادیب وشاعر شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے عہد سے متاثر ادب کا ارتقاء کر رہے تھے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے انسان میں عدم تحفظ اور معاشرے سے بغاوت کا جذبہ شدت اختیار کر رہا تھا۔ دراصل جب دو جماعتوں کے درمیان جن میں ایک حاکم اور دوسرا محکوم ہو مخالفت نفرت کی حد تک بڑھ جاتی ہے، تو ایسے ہی حالات رونما ہوتے ہیں۔

اس وقت ایک ایسی سیاسی تنظیم کی عوام کو ضرورت تھی جو عوام کی نمائندگی کرے اور ان کے مسائل سرکار تک پہنچائے، اور انہیں آزاد کرانے کے لئے کوشش کرے۔ اس لئے کانگریس کا قیام عمل میں آیا اس سلسلے میں ''دور آفریدی'' نے ''آزادی کی تینتیس سالہ تاریخ'' میں لکھا ہے:

> ''غدر اٹھارہ سو ستاون عیسوی کے ستائیس سال بعد اٹھائیسویں سال میں اٹھارہ سو پچاسی کو انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ مسٹر اے او ہوم نے اس کی تشکیل کی۔ ۱۸۸۵ء میں اس کا پہلا اجلاس ممبئی میں ہوا۔ ملکی مفلسی کا سدباب، آمدنی وخرچ کے درمیان توازن، قانون ساز کونسلوں کی اصلاحیں، اور اندرونی خودمختاری کانگریس کی ابتدائی زندگی کا نصب العین

تھے۔ سریندر ناتھ بنرجی، گوپال کرشن گوکھلے، سر فیروز شاہ مہتہ، لوکمانیہ بال گنگادھر تلک، اس وقت کے کانگریس کے ابتدائی بڑے لیڈرس ہوئے۔ا

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، اسکا پہلا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا، ہندوستان میں مسلم طبقے کی تہذیب وتمدن کی بہبود وفروغ اور سیاسی تحفظ اس کے بنیادی مقاصد تھے۔ سر آغا خاں، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک کے ہاتھوں اس پارٹی کی تاسیس ہوئی اسی دوران اور تین پارٹیاں سامنے آئیں۔ ۱۹۰۶ء میں ہندو مہاسبھا کا قیام ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء کی بنیاد پڑی اور ۱۹۱۹ء میں ہی علی برادران نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی تشکیل کی۔ جناب قاضی محمد عدیل عباس صاحب فرماتے ہیں

"امور خلافت کے سلسلے میں جذبات کا بے پناہ ابال اور ادھر حکومت کی یہ احمقانہ کارروائیاں وحشت و بربریت اور طوق غلامی کو مضبوط کرنے کی سازشیں ایک طرف مسلمانوں سے وعدوں کی خلاف ورزی دوسری طرف ہندوستان سے وعدوں کی خلاف ورزی ملک اب بھرپور جدوجہد آزادی کے لئے تیار تھا اور گاندھی جی کی پیش قدمی جرأت ومردانگی رنگ لارہی تھی"۔۲

۱۷راکتوبر ۱۹۱۹ء کو سارے ملک میں یوم خلافت منایا گیا۔ ۲۳رنومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں ہندو مسلم کانفرنس ہوئی، جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے کی، اور انہیں مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہوگیا۔ جون ۱۹۲۰ء کو الٰہ آباد میں دوسری خلافت کانفرنس ہوئی جس میں سر تیج بہادر، موتی لال اور اینی بیسنٹ شریک ہوئے۔ گاندھی جی نے ترکی کے مسئلے پر مسلمانوں کا ساتھ دینے اور حکومت سے Non Coperation کرنے کا فیصلہ کیا یہ تحریک بہت مقبول عام

ا آزادی کی تینتیس سالہ تاریخ، دور آفریدی، صفحہ ۲۷

۲ تحریک خلافت، صفحہ ۸۶، قاضی محمد عدیل عباسی، ترقی اردو، یونیورسٹی نئی دہلی، ۱۹۷۸ء

تھی سب کی زبان پر سوراج اور خلافت لفظ چڑھا تھا بعد میں یہ تحریک دو حصوں میں بٹ گئی ایک قومی تحریک اور دوسری خلافت تحریک۔

جیسے جیسے حالات بدل رہے تھے ادب اور ادیبوں وشاعروں کے نظریات بدل رہے تھے، اور ادب میں انقلاب کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ بہر حال اسی سلسلے میں آگے کے سیاسی حالات یوں ہوئے کہ ۱۹۰۸ء میں کانگریس پارٹی، حکومت وقت سے اختلاف کی ابتداء ہوئی۔ اس وقت اس کی رفتار بہت محدود ومحتاط صورت میں تھی۔ رفتہ رفتہ خفیہ سرگرمیاں اور سیاسی بے چینی بڑھتی گئی۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ، اور کانگریس نے نوآبادیاتی طرز کی اندرونی خودمختاری کا مطالبہ شروع کیا۔ اس وقت ہوم رول، تحریک کی بنیاد پڑی۔ مظاہرے ہوئے، ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل Rowlatt Bill کے پاس ہونے سے ہندوستان بھر میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ پنجاب کے شہروں میں احتجاجا ہنگامے ہونے لگے، جلیاں والا باغ (امرتسر) میں ایک جلسے پر جنرل ڈائر کی قیادت میں گولیوں کی بوچھار ہوئی، بیسنکڑوں بے گناہ افراد قتل ہوئے زخمی ہوئے اور گرفتاریاں ہوئیں، اس واقعہ کی گونج پورے ہندوستان میں ہوئی ردعمل کے طور پر پورے ملک میں جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی اور سرکار کی تمام تر کوشش کے باوجود عوام بغاوت کا علم لے کر نکل پڑے اور انگریزوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اب زیادہ دنوں تک ہندوستان کو غلام نہیں رکھا جا سکتا جلیاں والا باغ کے واقعہ کے سلسلے میں جناب تاراچند نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے

> ”مقتول اور زخمی لوگوں کی تعداد کبھی نہیں معلوم ہو سکے گی، سرکاری بیان کے مطابق مرنے والے ۳۷۹ تھے یا ایک ہزار تھے؛ بات خارج از بحث ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب انگلینڈ میں حکومت سیاسی، اصلاحات کے ذریعے ہندوستانوں کو خودمختار حکومت کے لئے تربیت دینے کے ارادے کا اعلان کر رہی تھی تو ہندوستان میں اس کے کارکن نمائندے ہندوستانیوں کو دراصل

غلامی، بزدلی، ریاکاری، اور چاپلوسی کی خصوصیات کی نشوونما کے لئے خوف و ہراس کا سبق دے رہے تھے'' ۱؎

اصل میں عوام کے احتجاج کو بری طرح کچل دینے کا کام برطانیہ حکومت نے جنرل ڈائر کو سونپا تھا اور اس نے پوری طرح اپنا کام کیا، لیکن ظلم کرنے سے حق وصداقت کے شیدائی کبھی جھکتے نہیں۔ یہ بات کربلا کے میدان سے لیکر رہتی دنیا تک ایک مثال بن گئی اور دیکھا گیا کہ ہمیشہ ظلم کا ہی سر جھکا دیا گیا ہے لیکن حق ہمیشہ سربلند رہا ہے اور یہی بات آزادی کے ان متوالوں کیلئے شمع راہ بن گئی۔ بہر حال اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں لوک مانیہ بال گنگا دھرم تلک کے انتقال کے بعد مہاتما گاندھی (ولادت ۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء وفات ۰ر جنوری ۱۹۴۸ء) کو ملک وقوم کے بزرگ کی حیثیت سے لیڈر شپ ملی۔ مہاتما گاندھی نے اس موقع پر نہایت پر امن طریقے پر عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کیا۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کی اس تحریک میں بیس ہزار افراد گرفتار ہوئے۔ حکومت کی طرف سے اس کے غم و غصے میں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہر (ولادت رام پور ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء، وفات ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء) اور مولانا شوکت علی پر مقدمے چلے۔ دونوں بھائیوں کو دو دو سال کی قید ہوئی۔ اور ۱۹۲۲ء میں مہاتما گاندھی کو چھ سال کی سزا ہوئی، البتہ دو سال بعد رہا کر دیا گیا اس وقت کانگریس پارٹی میں دو گروپ ہو چکے تھے، ان میں ایک گروپ ہندوستانی کونسلوں سے اتفاق کا تصور رکھتا تھا۔ دوسرا اختلافی تھا۔ معتدل حصے کے چترنجن داس لیڈر تھے۔ دوسرے حصے کے جس نے سوراج پارٹی کی تشکیل کر لی تھی، سی آر داس تھے۔ جون ۱۹۲۵ء میں سی آر داس کے انتقال کے بعد پنڈت موتی لال نہرو کو سوراج پارٹی کی سیاست وقیادت حاصل ہوئی، اس وقت کانگریس کی وحدتی طاقت کمزور ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مہاتما گاندھی اور ابوالکلام آزاد (ولادت مکہ معظمہ ۱۸۸۸ء وفات دہلی ۲۲/ ۱۹۵۸ء) نے اپنی

۱؎ تاریخ تحریک آزادی ہند۔ از: تاراچند، صفحہ ۶۹۳

کوششوں سے دونوں گروپ میں صلح کروادی۔ ـــــــ ۱۹۲۵ء میں انگریزوں کی پھوٹ ڈالنے کی پالیسی کارگر ہوئی ملک بھر میں فرقہ وارانہ خیالات پھیلنے لگے۔ اس موقع پر ہندو مسلم اتحاد کی برقراری کے لئے مہاتما گاندھی نے اکیس دن کا برت رکھا۔

۱۹۲۹ء میں برٹش گورنمنٹ کی ایماء پر سرجان سائمن کی نگرانی میں سائمن کمیشن عمل میں آیا۔ اس نے ہندوستان کے قومی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیا اس کی روشنی میں حکومت برطانیہ کو ہندوستان کے لئے ایک راہ عمل اختیار کرنا تھی۔ لیکن اس وقت تقریباً تمام ہندوستانی پارٹیوں نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ البتہ اس موقع پر متفقہ صورت میں ایک آل انڈیا پارٹیز کانفرنس ہوئی۔ پنڈت موتی لال نہرو کو اس کانفرنس کے تاثرات پر مبنی ایک رپورٹ تیار کرنے کا اختیار دیا گیا۔ یہ بعد میں ''نہرو رپورٹ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ البتہ مسلم لیگ نے اس رپورٹ سے اتفاق نہیں کیا۔ اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی۔ اس کے بعد سائمن کمیشن نے برٹش حکومت کو اپنی رپورٹ پیش کردی۔ حکومت برطانیہ نے اس روشنی میں مزید و مکرر صورت میں ہندوستانی قومی اور سیاسی رجحانات کو سمجھنے کے لئے لندن میں تین بار گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا۔

۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا یا تو مجھے ہندوستان کی مکمل آزدی کا پروانہ دیا جائے یا پھر آپ اپنے ملک میں مجھے دو گز زمین دفن ہونے کو دیں۔ میں غلام ملک میں دفن ہونا نہیں چاہتا۔ آخر کار ایسا ہی ہوا اور مولانا محمد علی جوہر کا ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں انتقال ہوا، وہ بیت المقدس یروشلم میں دفن ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس ہوئی مہاتما گاندھی نے اس میں شرکت کی۔ اور ہندوستانی ملکی و قومی تصورات کی عکاسی کی۔ ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس ہوئی۔ اس میں محمد علی جناح نے شرکت کی اور پارٹیوں کے نظریات پیش کئے۔ ادھر ایک بار پھر ۱۹۳۰ء میں

کانگرس کی قیادت میں ترک موالات کی تحریک چلی اس میں ساٹھ ہزار افراد کو جیل جانا پڑا۔ اسی طرح ۱۹۳۲ء-۱۹۳۳ء میں سول نافرمانی میں ایک لاکھ بیس ہزار ہندوستانی گئے۔ آخر کار ۱۹۲۴ء میں ہندوستانی لیڈروں اور ملک وقوم کے رجحانات کو اپنے طور پر سمجھ کر برٹش حکومت نے آل انڈیا فیڈریشن اور صوبائی داخلی وخود مختاری کا اعلان کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کے لئے نیا آئین تیار ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں انتخابات ہوئے، انڈین نیشنل کانگریس کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ بہار، مدراس، سی پی، یوپی، ممبئ اور اڑیسہ میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ پنجاب سندھ صوبہ سرحد بنگال اور آسام مسلم لیگ کو ملے اس طرح چھ صوبوں میں کانگریس گورنمنٹ کا قیام اور پانچ صوبوں میں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوئی۔ اس سے پہلے ۱۹۳۴ء میں مرکزی قانون ساز مجلس کا انتخاب ہوا۔ لیکن یہ دونوں حکومتیں صرف دکھاوے کی تھیں۔ ان میں بڑی تعداد گورنمنٹ کے نامزد کئے ہوئے ممبروں کی تھی۔ چھ چھ مہینے گذر جاتے تھے اور اجلاس نہیں ہوتا تھا۔ پہلے مرکزی اور صوبائی انتخابات کے بعد گیارہ سال تک دوسرے انتخابات کی نوبت نہ آئی۔

ادھر دوسری عالمی جنگ (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء تا ۲رستمبر ۱۹۴۵ء) کی ابتداء میں برٹش گورنمنٹ نے ۳رستمبر ۱۹۳۹ء کو ہندوستان کے جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور ہندوستانی لیڈروں و مرکزی اسمبلی کے نمائندوں سے مشورہ تک نہیں کیا۔ اس پر کانگریس کے لیڈر بھر گئے۔ عدم تعاون کا اعلان ہوا۔ اور اس پر عمل بھی کیا۔ اکتوبر نومبر ۱۹۳۹ء میں احتجاجاً کانگریس وزارتوں نے استعفیٰ بھی دے دیا بعد میں مشیروں پر مستعمل صوبائی حکومتوں نے کام کیا۔ ۱۸ردسمبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں مکمل آزادی کی تجویز پاس ہوئی۔ ڈاکٹر پٹا بھی سیتارامیہ نے اپنی کتاب میں اس تجویز کو اس طرح پیش کیا ہے:

''ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حکومت عوام کو اپنے حقوق سے محروم رکھے

اور ان پر ظلم کرے تو عوام کو حق ہے کہ وہ اس حکومت کو بدل دیں یا سرے سے ختم کر دیں۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے اندر نہ صرف لوگوں کو آزادی سے محروم رکھا ہوا ہے بلکہ اپنی بنیاد عوام کی لوٹ کھسوٹ پر بھی رکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح اس نے ہندوستان کو اقتصادی، سیاسی، تمدنی اور روحانی لحاظ سے تباہ کر دیا ہے اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کو برطانیہ سے قطع تعلق کر کے پورن سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا چاہئے۔ ہم ایک دفعہ پھر ہندوستان کی آزادی کا حلف لیتے ہیں اور سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا عزم کرتے ہیں کہ جب تک پورن سوراج حاصل نہ ہو جائے ہم عدم تشدد کے طریقے پر آزادی کی جنگ جاری رکھیں گے"۔[۱]

۱۵-۱۶ر دسمبر میں ایک بار پھر سول نافرمانی کی تحریک عمل میں آئی۔ یہ تحریک اس وقت آزادی کے حصول کے لئے تھی۔ سبھاش چندر بوس، سردار ولبھ بھائی پٹیل، اور مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو (ولادت الہ آباد ۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء وفات دہلی ۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء) کو اس وقت گرفتار کیا گیا۔ تقریباً پانچ ہزار دیگر افراد بھی گرفتار ہوئے۔ بعد میں انہیں کچھ عرصے کے بعد رہا کیا گیا۔

ادھر مسلم لیگ کے اجلاس مدراس منعقدہ ۱۹۴۱ء میں محمد علی جناح نے قیام پاکستان کے تصور کا شدت سے اظہار کیا۔ مسلم علاقوں پر مبنی ایک الگ ریاست کی مانگ کی۔ اس کے ساتھ ہی عارضی حکومت میں شامل ہونے کی شرط رکھی کہ جب تک حکومت پاکستان کے تصور کو قبول نہ کرے اور ہمارا حق تسلیم نہ کرے گی۔ ہم عارضی حکومت میں شامل نہیں ہوں گے۔

۱۔ ڈاکٹر پٹابھی ستیارامیہ، صفحہ ۲۷۹/۲۸۰ تاریخ کانگریس، مطبوعہ پبلشرز انڈین بک کمپنی لمیٹیڈ چرچ کشمیری گیٹ، دہلی

۱۹۴۲ء کو مہاتما گاندھی کی قیادت میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک کا آغاز ہوا۔ ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو ممبئی اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان چھوڑو تجویز پیش کی اور پڑھ کر سنائی جو منظور ہوئی۔ حکومت نے اس موقع پر کانگریس پارٹی کی تحریکوں کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اجلاس کے پنڈال پر پولیس نے قبضہ کرلیا۔ لاٹھی چارج ہوا۔ آنسو گیس کا استعمال ہوا۔ گولیاں چلائی گئیں۔ ۹/اگست ۱۹۴۲ء کو مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر لیڈروں اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ صوبہ سرحد کے سوا ملک بھر میں کانگریس شاخوں کے دفاتر کو سرکاری طور پر مقفل کردیا گیا۔ متعدد صوبوں میں کانگریس سے متفق پارٹیاں بھی غیر قانونی قرار دے دی گئیں۔ اس وقت خصوصیت سے سوشلسٹ پارٹی مورد الزام ہوئی۔ ہندوستان بھر کے اخبارات پر کانگریس سے متعلق خبروں کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی۔ جلسوں اور جلوسوں پر بھی قید لگ گئی۔ اس موقع پر ممبئی سمیت ہندوستان بھر کے عوام برگشتہ ہوگئے۔ عوام اور حکومت کے درمیان براہ راست تصادم ہوا۔ سرکاری دفاتر میں رخنہ اندازی اور بدنظمیاں ہوئیں۔ ہڑتالیں ہوئیں، کتنی جگہ ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی گئیں جگہ جگہ ٹیلی گراف کے تار کاٹ ڈالے گئے۔ ہندوستان کی بیشتر یونیورسیٹیاں بند کردی گئیں۔ لڑکے قومی تحریک کے جذبے سے سرشار ہوکر سڑکوں پر نکل آئے۔ اس ۱۹۴۲ء کے دیر تک رہنے والے ہنگاموں میں کتنے لوگوں کی جانیں گئیں۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ سو اٹھتیس بار گولی چلی، نوسو چالیس افراد مارے گئے۔ ایک ہزار چھ سوتیس آدمی زخمی ہوگئے۔ اور ساٹھ ہزار دوسو انتیس گرفتار ہوئے۔ البتہ یہ سرکاری اظہار تھا اس سے متعلق اعداد و شمار نہایت زیادہ ہی ہوں گے۔ اگست ۱۹۴۲ء سے مہاتما گاندھی کی رہائی (بہ وجہ بیماری ۶/مئی ۱۹۴۴ء تک حکومت اور کانگریس پارٹی کے درمیان مسلسل گفتگو ہوئی۔ کانگریس اپنی تجاویز پر قائم رہی حکومت اپنے فیصلے پر اور پالیسی تبدیل نہ کرسکی نتیجہ یہ ہوا یہ عرصہ انتہائی انتشار میں گذرا اور فکری تصادم چلتا

رہا۔ اسی طرح محمد علی جناح جو ۱۹۴۱ء سے پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے، اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس طرح برٹش حکومت ایک طرف کانگریس کے عدم تعاون، ترک موالات اور سول نافرمانی سے دوچار تھی اس پر قابو کرنے کی کوشش میں لگی تھی۔ دوسری طرف مکمل آزادی کی مانگ کا بوجھ حکومت پر پڑ رہا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ اس کے لئے تیار نہ تھی چونکہ ملک گیر پیمانے پر کانگریس کی تحریکیں تھیں اور ان میں شدت کا مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اکثر اوقات تشدد اور توڑ پھوڑ کے واقعات بھی رونما ہو رہے تھے۔ خون خرابہ، گولیاں چلنا، یعنی ایک مسلسل غیر یقینی فضا تھی اور یہ کبھی ختم نہ ہونے والی صورت اختیار کر گئی تھی۔ حکومت کانگریس اور لیگ پر مبنی ایک دوسرے سے مختلف النوع تصوریت تھی اور اس کی بنیاد پر ملک بھر میں ایک شدید سہ رخی جنگ جاری تھی۔

۱۵ار سے ۱۸ار جون ۱۹۴۵ء تک ہندوستانی لیڈرس رہا کر دیئے گئے۔ ۱۹۴۶ء کی ابتدا میں نئی مرکزی قانون ساز مجلس انتخابی صورت میں سامنے آئی۔ البتہ صوبوں کے لئے امیدواروں کی نامزدگی جاری تھی۔ عوام اور لیڈرس نئی حکومت کے قیام کے مسئلوں میں مصروف تھے۔ گزشتہ سالوں کے مقابلے ۱۹۴۶ء قدرے پرسکون تھا لیکن سیاسی پارٹیاں آزادی اور قیام پاکستان کے موقف پر قائم تھیں۔ حکومت اور پارٹیوں کے درمیان بات چیت جاری تھی۔ آخر کار برٹش سرکار نے ہندوستانی معاملات کو سمجھنے کے خیال سے ایک بار پھر قدم اٹھایا، ایک کیبنٹ مشن ہندوستان کے دورے پر بھیجا یہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان آیا اور تین ماہ بعد واپس ہوا۔ اس نے اپنے قیام کے دوران ہندوستانی عوام کے رجحان اور ایماء کو سمجھا اور قومی و سیاسی حالات کا جائزہ لیا کانگریس اور لیگ کے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ اس دوران میں کچھ کھنچاؤ کا ماحول پیدا ہوا۔ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کو ۱۴ر ممبروں پر مشتمل عبوری گورنمنٹ کے متعلق اعلان کیا

گیا .... کانگریس ورکنگ کمیٹی ۱۸؍جون کو عارضی طور پر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ عبوری گورنمنٹ کی اسکیم کو تسلیم کرلیا جائے .... ۲۳؍جون کانگریس ورکنگ کمیٹی نے نمائندہ اسمبلی میں شرکت کا فیصلہ کر دیا ..... کانگریس نے ۱۶؍جون کے بیان کو منظور کرلیا تھا۔ مگر عارضی گورنمنٹ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس مشن کو (اس وقت) ایک غیر متوقع اور پیچیدہ صورت حال کا سامنا ہوا۔ چنانچہ ۲۹؍جون کو مشن لندن روانہ ہوگیا۔ مشن کی روانگی سے پہلے مسٹر جناح نے ایک اور مطالبہ کیا کہ نمائندہ اسمبلی ملتوی کر دی جائے۔ کیوں کہ نمائندہ اسمبلی اور عارضی گورنمنٹ دونوں اکٹھی قائم نہ ہونا چاہئیں .... (پھر) مسلم لیگ نے جولائی (۱۹۴۶ء) کے آخر میں نمائندہ اسمبلی اور عارضی گورنمنٹ دونوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور ۱۶؍اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کا فیصلہ کیا۔ ۶؍اگست کو وائسرائے نے صدر کانگریس کو مرکز میں عارضی گورنمنٹ قائم کرنے میں مدد دینے کی دعوت دی۔ کانگریس نے یہ دعوت قبول کرلی۔ ۱۶؍اگست کی شام کو ۴؍بجے وائسرائے نے اس سلسلے میں بیان جاری کیا .... ۲؍ستمبر کو نئی گورنمنٹ نے چارج لے لیا۔[1]

اس ہماہمی اور ہر وقت بدلتے ہوئے ماحول میں مسلم لیگ کے علیحدہ ہونے کے بعد ملک بھر میں مسلم لیگ اور اس سے متاثر عوام حرکت میں آگئی۔ تقریباً تمام ہندوستان میں ایک بے چینی کی فضا قائم ہوگئی۔ توڑ پھوڑ کا عمل ہوا۔ مسلم لیگ اور قیام پاکستان کا جذبہ اور مطالبہ شدت کے ساتھ عود کر آیا۔ آخر کار ایسے حالات سے تنگ آکر اور پسپا ہو کر جن کا سلسلہ لامتناہی

---

[1] تاریخ کانگریس، ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ، صفحہ ۷۴۵، ۷۴۶

تھا اور غیر مختتم تھا اور حکومت کے لئے سوہان روح تھا بادشاہ برطانیہ کی طرف سے آزادی کے لئے اعلان کیا گیا اس کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں اس طرح بیان کیا ہے

یکم فروری ۱۹۴۷ء کو ہز مجسٹی کی حکومت نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانوی ہند میں حکومت کا اختیار ہندوستانیوں کو منتقل کردے گی۔ ہز مجسٹی کی حکومت کو امید تھی کہ ملک کی بڑی پارٹیاں کیبنٹ مشن کے ۱۶رمئی ۱۹۴۶ء کے پلین کے مطابق عمل کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گی، اور ہندوستان کے لئے ایک دستور مرتب ہو جائے گا۔ جو سب کے لئے قابل قبول ہوگا۔[۱]

پھر ۳رجون ۱۹۴۷ء کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد کرنے کا اعلان کیا۔ اور قیام پاکستان کا بھی آزادی کے لئے ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ رکھی گئی اس موقع پر آل انڈیا ریڈیو سے پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانی عوام کے لئے پیغامی تقریر کی۔ بعد کو محمد علی جناح نے اظہار خیال ۱۸رجولائی ۱۹۴۷ء کو مرکزی اسمبلی میں قیام پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کا بل پاس ہوا۔ ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اس طرح انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت میں ہندوستان کو آزادی ملی۔ یہ تو تھے بیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی حالات اب، ہم ہندوستان کے معاشی اور سماجی حالات کا بھی جائزہ لیں گے کہ سماج اور معاشیات نے انسان کے ذہن اور دل کو کس طرح متاثر کیا تھا اور انہیں حالات پر ادیبوں اور شعراء نے اپنے قلم کی جادو بیانی اور زور قلم کو کس کس طرح پیش کیا جو کہ ایک لہر کی شکل اختیار

---

[۱] ہماری آزادی، صفحہ ۲۸۶، ترجمہ: مترجم پروفیسر محمد مجیب، مطبوعہ ۱۹۶۱ء ممبئی۔

کرتا چلا گیا۔ اور ایک شعری رجحان بن گیا۔ اور بعد میں تحریک کی شکل میں ڈھل گیا۔ سب سے قبل ہم ان حالات کا جائزہ لیں گے۔ جو سماج اور معاشیات پر اثرانداز ہورہے تھے۔ دراصل دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کی طاقت کا غرور ختم ہوگیا۔ شرم ناک ہار ہوئی، بہترین جہاز ڈوب گئے تھے۔ دولت پانی کی طرح بہانے سے جڑیں کھوکھلی ہوگئیں تھیں۔ دوسرے ملکوں پر منحصر ہونا پڑا۔ امریکہ کا محتاج بن گیا، اس لئے طاقت کے زور پر اب ہندوستان پر حکومت کرنا اس کے لئے بہت مشکل تھا دوسری طرف دنیا کا ذہین اور باشعور طبقہ ہندوستان کی آزادی کے لئے مطالبہ کر رہا تھا اپنی بری طرح بگڑی ساکھ کو بچانے کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے لیکن آزاد بھی اس صورت میں کیا کہ دوحصوں میں ملک کی تقسیم کر دی اور ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے کمزور بنا دیا بٹوارہ بھی آسانی سے نہیں ہوگیا تھا بلکہ ایسی تباہی مچی جو ناقابل بیان ہے۔ کم از کم ۶۰۰۰۰۰ لوگ قتل ہوئے ایک کروڑ چالیس لاکھ گھر برباد ہوئے۔ بہرحال ان نتائج کے بعد اب ہم سماجی اور معاشی ماحول کو دیکھیں گے تو دراصل بیسویں صدی میں فرقہ وارانہ تعلقات ہندوستان میں بدتر شکل اختیار کر چکے تھے۔ امراء کا حکمراں طبقہ فنا ہوگیا تھا۔ چھوٹی بڑی چند ریاستیں جو تھیں وہ بھی حکومت کی تابع تھیں۔ گاؤں کے لوگ سیاسی بے حسی کا شکار تھے، ان کے ذہن مفلوج ہو چکے تھے۔ افلاس اور بیماری کا شکار یہ لوگ ظلم کا شکار بھی تھے اور متوسط طبقہ حکومت کا پروردہ تھا ہندوستانی عوام کو برطانیہ بری طرح لوٹ کھسوٹ اور ظلم وستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں اتنی مختلف زبانیں، مذہب، اور رنگ ونسل کا فرق اس قدر تھا جس کی وجہ سے عوام ایک خیال نہیں تھے۔ غریبی بھکمری قحط سالی سے عوام بلبلا رہے تھے۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا لیکن ہندوستان کے سماجی ماحول میں جہاں فرد سخت سماجی پابندیوں میں قید تھا یہ ضروری تھا کہ فرد کا آزادانہ طرز عمل اور خودروی پر زور دیا جاتا اور اس کام کے لئے سب سے زیادہ اخلاقی فرض ہوتا ہے۔ ادیبوں

اور شاعروں کا اس لئے ہندوستان کی تمام زبانوں کے شاعر اور مفکر جو مختلف فرقوں کے تھے وہ سب اپنے اپنے انداز سے ہندوستان میں اس اسپرٹ کے آئینہ دار بن گئے اور اپنے اپنے انداز سے ان مسائل کو ابھارا گیا اور سامنے لایا گیا اور ان مسائل کی منظر کشی اور ان کے حل اپنے خیال کے اعتبار سے پیش کئے گئے۔ خصوصاً شاعروں کے یہاں انقلاب اور مسائل کی شاعری کی گونج پورے شباب پر تھی۔ دراصل یہ رجحان انقلاب روس ۱۹۱۸ء میں جو لہر اشتراکیت کی اٹھی تھی وہاں سے وہ پوری دنیا میں پھیل گئی تمام ادیب و دانشور طبقہ متاثر ہوا خواہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی لئے ہندوستان میں بھی ادباء پر اس واقعہ کے اثرات پڑے اور پریم چند، حسرت موہانی، قاضی نذیر الاسلام، اور اقبال جیسے دانشوروں کی تحریروں میں اس انقلاب کے دھندلے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ باضابطہ طور پر اشتراکی نقطہ نظر کی تبلیغ کا کام ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' قائم ہو جانے کے بعد شروع ہوا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس سلسلے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے

> ''ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے اردو ادب کے راج میں سیاسی اور سماجی شعور کا داخلہ شروع تھا۔ حالی، آزاد، اور اقبال کے ذہنوں میں ان تحریکات کی گونج ملتی ہے۔ ہندوستان میں صنعتی انقلاب کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات سخن جنم لے چکے تھے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ اگر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں نہ بھی پڑتی جب بھی اردو شاعری موجودہ موضوعات سخن سے دو چار ہو جاتی'' [۱]

ابتداء میں مختلف عقائد اور سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اور دانشور ترقی پسند ادب کی سرپرستی کر رہے تھے ان میں رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذیر الاسلام، پریم چند،

---

[۱] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی۔

سروجنی نائڈو، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار وغیرہ کے نام اس ضمن میں لئے جا سکتے ہیں۔ ایسے مختلف الخیال اور مختلف عقائد کے افراد نے اس تحریک کو کس لئے قبول کیا اس کا جواب شہزاد منظر نے یوں دیا ہے

''ابتدا میں ترقی پسند تحریک کا مقصد ادب کے ذریعے سوشلزم کا پرچار نہیں تھا اس کا بنیادی مقصد قومی آزادی کا حصول، عقلیت پرستی اور معاشرے میں موجود توہمات کو دور کرنے کے لئے لکھنا لکھانا تھا۔ اس بات کا ثبوت ترقی پسند تحریک کا پہلا منشور ہے۔ جس میں سوشلزم کا کہیں ذکر نہیں ہے'' [۱]

لندن میں ۱۹۳۵ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی تو کون کہہ سکتا تھا کہ چند سرپھرے نوجوانوں کا یہ اقدام برصغیر کی سب سے بڑی ادبی تحریک کی شکل اختیار کرے گا۔ ۱۹۸۳ء میں فیض احمد فیض کی موجودگی اور سرپرستی میں انجمن کا احیاء عمل میں آیا۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۴ء تک انجمن نے جلسے کئے شامیں منائیں۔ ۱۵/جولائی ۱۹۸۴ء کا دن لندن کانفرنس کے حوالے سے ایک یادگار دن تھا۔ اس شام سجاد ظہیر کی یاد میں شام منائی گئی تھی جس میں سید شبیہ الحسن صاحب (پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی اردو)، ڈاکٹر محمد حسن (جواہر لال نہرو یونیورسٹی)، ڈاکٹر ایوب مرزا (پاکستان)، پروفیسر قمر رئیس (دہلی یونیورسٹی) شریک ہوئے۔ ۲۷/جولائی ۱۹۸۴ء کو اجلاس ہوا۔ ۱۹۸۴ء برصغیر اور دوسرے ممالک کے ادیبوں پر مشتمل ایک مجلس مشاورت تشکیل دی گئی۔ ۱۲/ستمبر ۸۴ء کو پہلی بار عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ نومبر ۸۴ء میں علی سردار جعفری لندن گئے تو انہیں انجمن کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا۔ ۲۷/نومبر ۸۴ء کو تمام اہل قلم کو خطوط لکھے گئے۔ فروری ۸۵ء میں لندن اور برطانیہ کی تمام قابل ذکر ادبی تنظیموں اور شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ ۲۷/فروری ۸۵ء کو کمیٹی کے اجلاس میں طے ہوا

۱۔ ترقی پسند ادب کے پچاس سال، صفحہ ۳۶۱، شہزاد منظر

کہ اپنا نمائندہ ہندوستان بھیجا جائے۔

ہندوستان میں پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ ۱۹۶۰ء اس کے اختتام کا سال کہا جاسکتا ہے۔[1]

چند برسوں کے بعد اب تحریک کی مکمل باگ ڈور کمیونسٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور دوسرا منشور پیش کردیا گیا۔ جس میں واضح طور پر ترقی پسند کی نئی تعریف بیان کی گئی جس پر تمام ادیبوں کا پورا اترنا ناممکن ہوگیا۔

غیر اشتراکی ادیبوں کے فن پاروں پر غیر منطقی اور سیاسی نوعیت کے اعتراضات کیئے گئے جن سے بددل ہوکر بہت سے لوگ بہ یک وقت اس تحریک سے کنارہ کش ہوگئے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کی نظریاتی شدت میں زبردست اضافہ ہوگیا اس دور میں ترقی پسند ادیبوں نے ادب کی فنی اور جمالیاتی قدروں کو فراموش کرکے ادب کو پروپیگنڈہ کی سطح تک پہنچادیا اور نعرے بازی کو انقلاب پسندی قرار دیا جب کہ ترقی پسند ادب کے پیش رو یا پہلے دستے کے ادیب نعرے بازی کی حد تک پروپیگنڈہ کرنے کے قائل نہ تھے اور اپنی تحریروں میں اس بات کی طرف توجہ بھی دلا چکے تھے، مثلاً مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں

> ''مقصد کی ننگی نمائش کا نام فن ہے ادب نہیں ہے۔ بدویت کے دور سے لے کر اب تک اگر انسانی ثقافت کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ اور صالح ذہن اس کو مانتے آئے ہیں مارکس انگلز اور لینن بھی ادب کو ڈھنڈورا نہیں سمجھتے ہیں اور انگلز تو جس کو میں کئی اعتبار سے مارکس کے مقابلے میں بہت زیادہ بالغ اور رچی ہوئی شخصیت مانتا ہوں، ادب کو پروپیگنڈہ سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو لیکن پروپیگنڈے کو ادب نہیں سمجھتا اس

---

[1] عاشور کاظمی: ترقی پسند ادب کے پچاس سال، صفحہ ۱۴

نے ایک موقع پر صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ جتنا ہی زیادہ مصنف کا مقصد چھپا ہوا ہوگا اتنا ہی زیادہ فنی تخلیق کے حق میں بہتر ہوگا'' [۱]

بعد کے ترقی پسندوں کا مسئلہ یہ تھا کہ فنی محاسن کا خیال رکھ کر وہ اپنی بات عوام تک بہ آسانی پہنچانا کار دشوار تصور کرتے تھے۔

سردار جعفری نے فیض کی مشہور نظم ''صبح آزادی'' پر اعتراضات کیے ہیں چونکہ اس نظم کا پیرایہ اظہار استعاراتی تھا۔ نظم کا پہلا شعر تھا

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

علی سردار جعفری کا اعتراض تھا کہ یہ بات تو مسلم لیگی لیڈر اور ڈاکٹر ساور کر بھی کہہ سکتے ہیں۔ جعفری کے نزدیک یہ اسلوب شاعری کے سماجی مقصد سے انکار اور ہیئت پرستی کا نتیجہ تھا۔

ترقی پسندوں نے راست بیانی پر اس لئے اتنا زور دیا ہے کہ وہ ادب کے ذریعہ سیاسی اور سماجی انقلاب کے خواہاں تھے اسی لئے وہ اپنے ادیبوں سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ان کا اسلوب ایسا ہو کہ جس کا اثر عوام پر براہ راست اور فوری ہو۔

ترقی پسند ادب کا نقطہ آغاز ۱۹۳۵ء ہے اور اس کا سال اختتام ۱۹۶۰ء کو قرار دیا جا سکتا ہے چونکہ اس سال ایک نئے مکتبہ فکر کی ابتدا ہوئی جسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی مجموعی عمر ۲۵ سال ہے۔

اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ پانچویں دہائی میں نظریاتی تنگ نظری کا دور شروع ہوا اور چھٹی دہائی میں انجمن کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ مختصر لفظوں میں کہا جائے تو اس نے ادب کے پرانے ڈھانچے کو توڑ کر زندگی اور ادب کے

---

[۱] شہزاد منظر، صفحہ ۳۶۱، ترقی پسند ادب کے پچاس سال

بارے میں نئے خیالات اور تصورات پیش کئے۔ ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں علی سردار جعفری صاحب نے فرمایا ہے کہ

''ترقی پسند تحریک بیسوی صدی کے انسان کے بیدار ضمیر کی صدائے بازگشت ہے اس تحریک سے متعلق فنکاروں کی بہترین تخلیقات میں فن کار کے دل کا حسن اور روح کی صداقت شامل اور جلوہ گر ہے، حسن وصداقت کیا ہے؟ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی نے مارچ ۱۹۶۶ء میں نظریاتی اور تہذیبی مسائل پر ایک تجویز منظور کی تھی جس میں یہ عبارت ہے

What is the creator?

Whether consider musicpoetry the novel drama cinema archietecture painting or sculpturer he is not a mere arranger. In every work of art there is a part which is not reducible to a set of givern data and this part is the creative artist himself (Marcist on the litretaure on anthology. Edited by David craigdong books page 527) 1ے

بہر حال ترقی پسند تحریک کیا ہے اور اس کا موضوع مقصد اور اس کا نظریہ کیا ہے، یہ سب باتیں اوپر تحریر ہو چکی ہیں۔ تخلیقی عمل کے ذریعے جو سماجی تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ بڑی خاموشی کے ساتھ بالواسطہ طور پر ہوتی ہے، ترقی پسند تحریک نے اپنے عہد کے ماحول کو تبدیل

1ے ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، علی سردار جعفری، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی، صفحہ ۱۹

کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ اور ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ اور جبر کے خلاف بھی آواز اٹھائی، اور کھل کر اعتراضات کیئے سماج کے کمزور طبقے کی حمایت کی مظلوموں کا ساتھ دیا یہ بنیادی اصول تھا تحریک کا جس کا انہوں نے بھر پور مظاہرہ کیا۔ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں پڑی تھی ترقی پسند شاعری نے ایک نیا انداز سخن اور موضوع کی تلاش کا کام پورا کیا۔ اس میں سماجی نابرابری اور طبقاتی کشمکش انگریزوں کی غلامی کا احساس جاگیردارانہ نظام سے نفرت و بغاوت ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا ان خیالات نے شاعروں کے کلام میں شرارے بھر دیئے تھے۔ جوش ملیح آبادی شاعر انقلاب کہلائے انہوں نے اپنی شعلہ بیانی سے اپنے عہد میں چند نو جوانوں کو بہت متاثر کیا اور ترقی پسند شاعری میں تین رجحان غالب رہے۔ پہلا رجحان بلند آہنگ لہجہ میں سیاسی اور نظریاتی شاعری کا دوسرا نیم فکری اور نیم رومانی شاعری تیسرا قوم پرست شاعروں کا ملا جلا لہجہ، پہلا رجحان: اس بارے میں ڈاکٹر ابن کنول کہتے ہیں

> ''شاید جوش کے اثر سے مجاز نے اس کا آغاز کیا جو بعد میں سردار جعفری مخدوم کیفی نیاز حیدر ظہیر کاشمیری اور جاں نثار اختر کے یہاں نمایاں ہوا'' [۱]

سب سے پہلے جوش کی شاعری کو دیکھئے

قوم کو جذبہ بے دار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

غریبی اور بدحالی انسان کو کس حد تک بزدل بنا دیتی ہے، اور مجبور کر دیتی ہے یہ ان کے انداز میں دیکھئے

---

[۱] ترقی پسند ادب کے پچاس سال، صفحہ ۴۷۶، قمر رئیس عاشور کاظمی

پیٹ بڑا بدکار رے بابا

پیٹ بڑا بدکار

ناداں بیٹھے کشتی میں اور دانا غوطے کھائے   کتا سوئے گدے پر اور ٹہلے چوکی دار

پیٹ بڑا بدکار

جوش نے انگریزوں کے خلاف غلامی کے خلاف اپنی نظموں میں بار بار للکارا ہے وہ قومی شاعر سمجھے جاتے تھے۔ دیکھئے ان کا انداز

اللہ اللہ بزم ہستی میں مری گلباریاں

ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو ریزہ ریزہ استخواں

الامان و الحذر میری کڑک میرا جلال

خون سفاکی گرج طوفان بربادی قتال

یا اپنی نظم بغاوت میں کس طرح انسان کے ذہن کو بے دار کر رہے ہیں

برچھیاں بھالے کمانیں تیر تلواریں کٹار

برچھی پرچم اور علم گھوڑے پیادے شہسوار

اس زمانے سے جو ذات پات بھید بھاؤ نسل مذہب کا فرق آج تک لوگوں کے دلوں میں چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے کھل کر اس کے خلاف کہنے کی جرأت کی ہے اور لوگوں کو ملنساری یک جہتی ہم آہنگی کا درس بہت ہی خوبی کے ساتھ دیتے ہیں

ہر بات میں تیغ خوں چکاں ہے یارب

ہر پاؤں میں زنجیر گراں ہے یارب

مذہب کی برادری سے دل تنگ ہوں میں
انساں کی برادری کہاں ہے یارب

اس وقت کے حالات کے مطابق انہوں نے لوگوں کی توجہ اس طرف دلائی ہے کہ یکجہتی سے ہی اپنی منزل مل سکے گی۔ بہت تفصیل میں جانے کے لئے وقت نہیں ہے، یہاں مختصراً اپنی بات کہنی ہے اس لئے اب فیض احمد فیض کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے کلام میں انقلاب کی جو آنچ ان کے ذہن و دل کو پگھلانے پر آمادہ ہے اس کا تجزیہ کرکے دیکھا جائے۔ فیض احمد فیض ۱۹۴۸ء میں جنرل اکبر خاں کے ساتھ راولپنڈی سازش کے لئے جیل میں کئی سال رہے، بعد میں الزام ثابت نہ ہونے پر رہائی مل گئی اس کی جھلک ان کے کلام میں دیکھئے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

ان کی پہلی نظم جو بے حد مقبول عام ہوئی ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' اس میں غم جاناں کے علاوہ غم دنیا بھی پنہاں ہے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی وصل کی راحت کے سوا

سماجی ناانصافی نابرابری انسانیت کے مصائب اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے خلاف نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں جوش و خروش گھن گرج نہیں ہے، لیکن لہجے میں بڑی کاٹ ہے اور سلیقے سے اپنی بات کہہ دیتے ہیں

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، قوالی، صبح آزادی، تمہارے حسن کا نام، دو عشق، زنداں کے علاوہ غزلوں میں بھی سیاسی نقوش نمایاں ہیں

تم آئے ہو نہ شب انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

وہیں لگے ہیں جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دست عدو کے گذند کیا کرتے

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس
مدح زلف و لب و رخصار کروں یا نہ کروں

انہوں نے ایک نئی طرز فکر کو رواج دیا ان کی غزلوں میں رمزیت کے ساتھ ایمائیت بھی موجود ہے۔ اسی سلسلے میں مجاز لکھنوی کا ذکر بھی آئے گا۔ حالات بدلنے کا ذکر جنگ سے قبل کی تیاریاں ہنگامے خطرات وغیرہ کا ذکر اس طرح کیا کرتے ہیں:

پھر بدلنے لگا تیور نئے یہ چرخ کہن
پھر ابھرنے لگا دینا میں ہر ایک سو رہزن
پھر شباب آگیا عیاری و مکاری کا
بوالہواس کرنے لگے جنگ کے پھر سارے جتن

مجاز نے یہاں پر حکومت کی لالچ میں جنگ کرنے والے سامراجی ذہنیت کے مالکوں

اور زمیں دار، جاگیردار جو عوام کو لوٹتے ہیں اور موقع کا فائدہ اٹھاتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے، کس طرح یہ لوگ چالاکی وعیاری سے غریبوں کو تباہ کرتے ہیں، اس کے علاوہ جنگ کا حوصلہ دیتے ہوئے دبے ہوئے کچلے ہوئے طبقے کو حوصلہ دیتے ہیں

پھر مومن جاں باز کو دے شعلہ نگاہی
افواج میں دشمن کی مچادیں یہ تباہی
تاریخ کے اوراق یہ دیتے ہیں گواہی
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

ان کے بعد اس سلسلے کی کڑی آگے بڑھاتے ہوئے ترقی پسندوں میں ایک اہم نام جو اب تک افق ادب پر تابندہ و پائندہ ہیں ان کا ذکر آتا ہے، ان کی شاعری روح عصر کی آواز ہے۔ علی سردار جعفری ۱۹۱۳ء بلرام پور میں پیدا ہوئے ناانصافی غربت لوٹ کھسوٹ جس طرح ایک انسان دوسرے انسان سے روا رکھتا ہے، اس کے خلاف وہ اپنے تاثرات پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اپنی شاعری کو نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی نہیں بنا سکوں گا میں اسے بیک وقت ستار کا نغمہ اور تلوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں ان کی نظم پتھر کی دیوار کا یہ بند دیکھئے

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظام زرداری
جشن عام جمہوری
اقتدار مزدوری

ان کی ایک نظم یلغار کا یہ بھی بند بطور نمونہ ان کے کلام کی اور فکر و تخیل کی آئینہ داری کرتا ہے۔

وہ لائیں اپنے سیہ ارادے ہم اپنے دل کی امنگ لائیں
ہم اپنے لوح و قلم نکالیں وہ اپنے تیغ و تفنگ لائیں
ہم اپنے بربط کے تار چھیڑیں وہ شورش رعد جنگ لائیں
ہم اپنے زخموں کے گل کھلائیں وہ خون ناحق کا رنگ لائیں
لہو میں بہہ جائیں گے وہ سب جو لہو کا بیوپار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ان کی شاعری اس دور کی بے چینیوں اور امنگوں کی آئینہ دار ہے، اور ان کے کلام میں جا بجا روح عصر جلوہ گر ہے ان کے بعد جو دوسرا نام ترقی پسندوں میں ...... بہت نمایاں ہے وہ ہیں کیفی اعظمی، انہوں نے معاشرے کی کشمکش غریبوں کی بے کسی اور ظالم سرمایہ داروں کے ظلم کا صاف طور پر اپنے کلام میں اظہار کیا ہے۔ اور بغاوت کا درس دیا ہے۔ یہاں پر ان کی نظم کا ایک بند تحریر ہے جس میں انہوں نے بنی نوع انسان کی طرف سے لینن کا شکریہ ادا کیا ہے، جس نے مزدوروں کو اوپر اٹھانے کا جذبہ دلوں میں پیدا کیا اور پس ماندہ طبقات کی ترقی کے لئے جدوجہد کی

آسماں اور بھی اور اونچا اٹھا جاتا ہے
تم نے سو سال میں انساں کو کیا کتنا بلند
پشت پر باندھ دیا تھا جنہیں جلادوں نے
پھینکتے ہیں وہی ہاتھ آج ستاروں پہ کمند

انہوں نے انسان کو بربادی اور تباہی کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو کس طرح روکنے کا اشارہ کیا ہے، اور اس انتشار کی آہٹ محسوس کی ہے جو وقت کی کروٹ سے نمایاں اور نمودار ہونے والا ہے

کبھی جمود کبھی صرف انتشار سا ہے
جہاں کو اپنی تباہی کا انتظار سا ہے
سجا سنوار کے جس پر ہزار ناز کیے
اسی پہ خالق کونین شرم سا ہے

ان کی شاعری نے موضوع اور فکری تہہ داری کی وجہ سے خواص اور عوام دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے یہاں جذباتیت اور غنائیت کے سبب دل کے ساز پر زندگی کا نغمہ سناتے ہیں

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

ایسے مظالم جن کی ذمہ داری کوئی قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا لیکن چونکہ وہ جرم ہوا ہے اور کسی نہ کسی سے سرزد ہوا ہے تو مجرم کوئی ضرور ہے لیکن کوئی مجرم نہیں ہے اس کا انہوں نے اسی انداز سے غزل میں ذکر کیا ہے یا پھر مزدور یا پس ماندہ طبقے کے ایک فرد کی زندگی کی عکاسی دیکھئے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی

ان کے کلام میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بھرپور آواز بلند کی گئی ہے، انہوں نے خواص کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس نظام کے خلاف رائے

عامہ ہموار کر کے انہیں حق تلفی، ناانصافی، نابرابری کے خلاف برسر پیکار ہونے کے لئے تیار کریں، ان کی نظم چراغاں جو ۲۶ جنوری پر کہی گئی تھی دیکھئے

اک دیا نام کا خوشحالی کے اس کے جلتے ہی یہ معلوم ہوا

کتنی بدحالی ہے

پیٹ خالی ہے مرا

جیب مری خالی ہے

اک دیا نام کا یکجہتی کے

روشنی اس کی جہاں تک پہنچی قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا

ماں کے آنچل میں ہیں جتنے پیوند سب کو اک ساتھ ادھڑتے دیکھا

انہیں ملک وقوم کی بدحالی اور بدتر حالات کا افسوس کس قدر ہے انہوں نے حق تلفی اور ناانصافی دور کر کے اتفاق اور اتحاد پر زور دیا ہے جس کے بعد قوم کو کوئی مٹا سکتا ہے نہ قید کر سکتا ہے اور نہ غلام بنا سکتا ہے۔

فضا میں سرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات

ہوا کی زد پہ چراغ عمل جلائے ہوئے

اور اپنی بات اس طرح بھی کہتے ہیں کہ

میں کبھی گھاؤ سینے کے گنتا نہیں

جاں رہے نہ رہے کوئی چنتا نہیں

خون کتنا بہا دیکھ لوں گا کبھی

پہلے فرعون کو غرق دریا کروں

یہاں انہوں نے فرعون کو سرمایہ داری، حق تلفی، ناانصافی، ظلم وزیادتی اور جبر واستحصال کی علامت قرار دیا ہے۔ اور اسے مٹا دینے کی بات کہی ہے، ان کا کہنا ہے وقت گھاؤ دیکھنے کا نہیں بلکہ جنگ کرنے کا ہے تا کہ سرمایہ داری کی موت ہو جائے۔ اس کڑی میں ایک کڑی کے بطور ساحر لدھیانوی کا نام آئے گا۔ انہوں نے عوام اور سماج کے مسائل کو بڑی خوبی اور مہارت سے ابھارا ہے وہ فلمی شاعر تھے لیکن ادب کا دامن انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا، اور خصوصی توجہ انہوں نے عورتوں پر ہو رہے مظالموں اور پس ماندہ طبقے پر کی ہے دیکھئے

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے دل پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

یہاں جاگیرداروں پر طنز ہے کہ ان کے مظالم جو وہ عورتوں پر کرتے ہیں جس کے سبب نہ جانے کتنی ان کی ناجائز اولادیں کھیتوں میں ہی پل رہی ہیں، لیکن کوئی زبان پر نہیں لاسکتا کہ ان کے باپ کون ہیں، یہ سماج کا ننگا ناچ کڑوا سچ ہے جسے ساحر نے کس سلیقے سے پیش کیا ہے جاگیرداروں کی عیاشی کی ایسی مثال دی ہے کہ ایک تاریخ کی مکمل تصویر اتار دی ہے انسان کی پستی اور کسان کی غربت کا ذکر کس انداز میں کیا ہے دیکھئے

ہائے وہ گرم دل آویز ابلتے سینے
جن سے ہم سطوت آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

اب وہ اپنے اجداد کی غیر قوم اور سرکار سے وفاداری پر طنز کرتے ہوئے ساحت

ناپاک کا ذکر کرتے ہیں

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعت ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

یہ ان کی نظم جاگیر کا ایک بند تھا جس میں انہوں نے مردہ ذہنوں کو جھنجھوڑنے کی سعی ناکام کی ہے اور یہاں مزدور کے ہمدرد اور نسوانیت کے ہمدرد شاعر نے تاج سے مزدور کے خون کی بو محسوس کرتے ہوئے تاج کو بادشاہ اور دولت کا اشتہار بتاتے ہوئے کہا ہے

تاج تیرے لئے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادی رنگین سے عقیدت ہی سہی
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو
بزم شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوت شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

اس طرح ان کا دل قوم کی تذلیل پر آنسو بہا رہا ہے جب غیر ملکی سپاہی مذاق بناتے ہیں غریبوں کا تو وہ کہہ اٹھتے ہیں

اسی ہوٹل کے قریب
بھوکے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف

منتظر بیٹھے ہیں اس ساعت نایاب کے جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیش کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکہ کوئی سگریٹ کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کا مزا لینے کو
پالتو کتوں کے احساس پہ ہنس دینے کو

اسی طرح قحط بنگال سے مرتے ہوئے انسان دیکھ کر وہ سماج کی کشمکش اور عوام کی تباہی کا ذکر یوں کرتے ہیں

جہان کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانوں
نظام نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیش کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے

اسی طرح وہ ملوں میں کام کرنے والے مزدور کی آواز سناتے ہیں

زمیں کی قوت تخلیق کے خداوندو
ملوں کے منتظمو سلطنت کے فرزندو
پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظام زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

ساحر کی پوری شاعری تمام عصری مسائل پر زیادہ تر مبنی ہے، اسی طرح وہ عورتوں پر ہو نے والے ظلموں کا بھی ذکر اسی انداز سے کرتے ہیں اور صاف کہتے ہیں

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

بہر حال سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے انقلاب کے لئے بڑی حد تک کوشش کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا ہے

خون ناحق کی تو خنجر ہی گواہی دے گا
اور جتنے بھی تھے سب ہوگئے قاتل کی طرف

یا وہ اس طرح اپنے عہد سے شکایت کرتے ہیں کہ

ہم لوگ تو اپنے آنسوؤں سے
تہذیب کی فصل سینچتے ہیں

اپنے اپنے انداز سے تمام ترقی پسند شعراء نے سماج میں جو خرابیاں تھیں ان کا ذکر کیا

ہے، اور عوام جو بے حسی کا یا بزدلی کا شکار تھے ان کے سوئے ہوئے ذہنوں کو اپنی آتش بیانی سے جگانے کی بھر پور کوشش کی ہے اور سماج اور عوام میں جو کشمکش چل رہی تھی اس کا ذکر بھی جگہ جگہ بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ ویسے تو کافی شعراء ہیں لیکن صفحات کی کمی کے باعث یہیں پر ختم کیا جا رہا ہے۔

باب پنجم

اردو شاعری میں واقعات کربلا (۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۶ء تک)

غزل میں واقعات کربلا کے اشارے اور علامتوں کا اظہار

دیگر اصناف میں واقعہ کربلا

گذشتہ ابواب میں جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے اس دور کے بعد اردو کے شعری سرمایہ میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی۔ معاشرتی حالات کے زیر اثر نئے موضوعات شامل کئے گئے۔ جن کے بارے میں ناقدین اور محققین نے اپنے مضامین کے ذریعہ نہایت تفصیلی مواد فراہم کر دیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اس بارے میں اپنی رائے یوں دیتے ہیں

''جس نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اور فلسفیانہ افکار کی تاریخ پڑھی ہے اسے یقین ہو جائے گا کہ انسان اپنی ضرورت یا ضرورت کے احساس کے ماتحت مادی تغیر پیدا کرتا ہے، لیکن اس مادی تغیر کے ذریعہ اس کا شعور بدلتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ضمیر میں انقلاب آجائے، اور دنیا کا نقشہ بدل جائے ذریعہ پیداوار میں تغیر انسان کے عمل کی راہیں بدلتا اور اس کے غور وفکر کے طریقے متعین کرتا ہے۔ انسانی شعور عام معاشی معاشرتی تغیرات کی رو میں بدلتا اور نئی راہوں پر گامزن ہوتا ہے، ادب کا کام بھی یہی رہ جاتا ہے کہ وہ انسانی شعور کو وسیع تر کرے۔[1]

چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدائی منزلوں سے ادب میں قومی اور سیاسی شعور کا احساس زیادہ شدت سے پیدا ہونے لگا۔ دراصل اس سے پہلے کے دور میں جو کہ غدر کے بعد کا عرصہ ہے تو غدر کے بعد نہ صرف ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ علمی وادبی دنیا میں بہت عظیم انقلاب پیدا ہوا۔ انگریزی ادب سے واقف ہوتے ہی اس کے اصناف شاعری

---

[1] ترقی پسند ادب، از پروفیسر احتشام حسین

سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ جس کے نتیجہ میں شاعری میں بعض نئے موضوعات کو شامل کرنے پر توجہ دی جانے لگی۔ اردو میں جن لوگوں نے یہ راستہ متعین کیا انہوں نے خود با قاعدہ کبھی انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن صحبت اور ماحول نے ایسا جادو کیا کہ انہوں نے وہ رہنمائی کی کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ ایک وسیع میدان سامنے دیکھ کر پامال راستہ اور فرسودہ خیالات سے گھبرا کر اردو کی دنیا نے نئی منزل کی طرف قدم بڑھایا۔

نثر کی اصلاح تو فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوگئی تھی البتہ نظم کی ترقی کے لئے شاید زمانہ آزاد و حالی کا منتظر تھا۔ اس دور کو سید اعجاز حسین نے تاریخ ادب اردو میں دور جدید کا نام دیا ہے جس میں مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی اسماعیل میرٹھی، منشی درگا سہائے سرور، سورج نرائن مہر، نوبت رائے نظر، سید اکبر حسین الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، سید علی حیدر نظم طباطبائی وغیرہ اپنے کلام سے روشنی پھیلاتے نظر آتے ہیں، غالباً دور جدید نے ہی اس دور کی بنا ڈالی جس کا عہد حاضر بھی ممنون ہے اس کے لئے ڈاکٹر سید اعجاز حسین تاریخ ادب اردو، صفحہ ۱۷۰ پر تحریر فرماتے ہیں کہ

> ''حالی اور آزاد نے شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ یہیں سے اس دور کی بنا پڑی جس کا عہد حاضر بھی ممنون ہے، شاعری میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اردو کا شاعر حسن کی رسمی دنیا سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوا، یعنی مبالغہ سے گریز اور محبت کی تنگ دنیا سے نکل کر کورانہ جذبات نگاری کو ترک کرنے لگا۔ کار آمد موضوع پر مختلف شکلوں میں نظمیں نمایاں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ سیاسی مضامین بھی اردو شاعری کے احاطہ میں آگئے۔ اور عہد حاضر میں تو اس کثرت کے ساتھ معاشی و سیاسی پہلو پر نظمیں آنے لگیں ہیں کہ دوسری چیزیں پس پشت رہ گئیں ہیں حقیقت نگاری اس دور کی

سب سے نمایاں خصوصیت ہے" ۔[۱]

اس حوالے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دور جدید کا بھرپور اثر دور حاضر پر پڑا ہے اور وہ شعراء جو اس دور سے وابستہ ہیں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ان افکار سے متاثر نظر آتے ہیں، ان شعراء میں مرزا ہادی عزیز لکھنوی، پنڈت برج نارائن چکبست، ڈاکٹر سر محمد اقبال، سید فضل الحسن حسرت موہانی، شوکت علی خاں، فانی بدایونی، علی نقی، صفی لکھنوی، مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی، آرزو لکھنوی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، مرزا واجد حسین یاس، یگانہ چنگیزی، وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب شعراء کی تمام تر رعنائیوں کا احاطہ کرتے ہوئے اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم مرزا ہادی عزیز لکھنوی کی شاعری اور ان کی شخصیت کے متعلق کچھ ضروری باتوں کا مطالعہ کریں گے۔ عزیز کا شمار اردو کے ان شعراء میں ہوتا ہے، جنہوں نے دور جدید میں غزل کو نئی جہت عطا کی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب فرماتے ہیں

> عزیز لکھنوی قدیم رنگ تغزل کے آخری یادگار تھے شاعری میں نئے رجحانات سے متاثر نہیں ہوئے۔ اپنے ہم عصر ثاقب کی طرح غالب و میر کی شاعرانہ عظمت کے مداح و معترف ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ تاہم ان کا اپنا خاص رنگ ہے۔ جس میں غالب کے خیال کی گہرائی میر کا سوز و گداز اور ان کی سادہ زبان ایک نئے سانچے میں ڈھالی گئی ہے۔[۲]

ان سب باتوں کے باوجود ان کے یہاں واقعہ کربلا کی گونج ملتی ہے اور ان کے اشعار میں واضح یا غیر واضح طور پر اس تاریخی حوالے کا عکس جا بجا ملتا ہے، اور یہاں پر ہم ان کی

۱۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین، تاریخ ادب اردو، صفحہ ۱۷۰

۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، صفحہ ۳۵۷، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ شعر بھی دیکھیں گے جہاں واقعہ کربلا پوری آب و تاب سے موجود ہے ان کے قصائد میں زوردار رنگ ہے قصیدے کا رنگ تقریباً سودا اور ذوق سے ملتا جلتا ہے، ان کے خیال میں درد وغم و سوز و گداز غزل کے خاص عناصر ہیں۔ ان کے اشعار میں لفظوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، طرز ادا کی ندرت اور خیال آفرینی کا ہر قدم پر انہیں خیال رہتا ہے، ان کے یہاں اتنا سوز ہے کہ عام طور سے غزلیں واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی سرمایہ دار ہوگئی ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے ان کے یہاں عام طور پر غزل میں مرنا، رونا اور ماتم کا عنصر بہت زیادہ ملتا ہے، جس پر اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی لفظ ان کے مفہوم کو ادا نہیں کر پاتے اور کلام میں نقص پیدا ہو جاتا ہے لیکن ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے، اردو میں عزیز نے اکثر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، انہوں نے قصیدے میں ایک خاص امتیازی حیثیت پیدا کر لی ہے، جو ہر طرح قابل داد ہے۔ شکوہ الفاظ، تسلسل، معنویت، تخیل ان کے یہاں خاص طور سے دکھائی دیتے ہیں، وہ نظمیں بھی خوب کہتے ہیں، لیکن ان کے یہاں واقعہ کربلا سے متاثر اشعار بھی شعوری طور پر کہے ہوئے ملتے ہیں۔ شعر پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا دل اسی واقعہ سے متاثر ہو کر کلام کر رہا ہے

تیر سہ شعبہ ہے مشہور تیر انداز ہے
سامنے یہ کون کمسن عاشق جاں باز ہے

یہاں صاف لفظوں میں جناب علی اصغر کی شہادت کا سانحہ موجود ہے، اور یہاں پر جناب علی اصغر کو عاشق جانباز کہہ کر عظمت واقعہ کربلا کا احساس دلایا گیا ہے۔ نیچے اس شعر میں امام حسینؑ کا علی اصغر کو ہاتھوں پر شہادت کے بعد واپس لانا دکھایا گیا ہے۔

جب لاؤں گا ہاتھوں پہ دل کشتہ کی میت
کیا شور سر عرصہ محشر نہ اٹھے گا

اور اسی قبیل کا یہ شعر

لگی ہے آگ کسی بے گنہ کی بستی میں
کہ گھٹ رہا ہے دھواں تنگنائے ہستی میں

یہ تمام اشعار بظاہر غزل کے موضوعات کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن درحقیقت واقعہ کربلا کے کسی نہ کسی گوشہ کا احساس دلاتے ہیں۔

عزیزلکھنوی کی شاعری میں واقعہ کربلا کا عکس جگہ جگہ موجود نظر آتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا ذہن اپنے عصر میں کتنا مجروح تھا وہ اپنے عہد میں گھٹن محسوس کرتے ہیں اور یہ گھٹن انہیں کربلا کے جلتے ہوئے خیموں کے اٹھتے ہوئے دھویں کی یاد دلاتی ہے اور شاعر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے

گھٹ رہا ہے دھواں تنگنائے ہستی میں

عزیز کے ہی ہمعصر شاعر تھے، چکبست اور ان کے یہاں بھی عصری آگہی مکمل طور پر نظر آتی ہے۔ چکبست نے آتش، غالب اور انیس کا بہت مطالعہ کیا تھا اسی لئے مسدس میں انیس کا اور غزل میں آتش کا انداز بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔ فلسفیانہ خیالات کم ہیں لیکن جہاں ہیں وہاں وہ غالب کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں، وہ بے حد ذہین اور سخن ور شاعر تھے قومی تحریکیں اور اصلاحوں اور سانحوں کی متعدد شاندار نظموں کو ایک نئی کیفیت عطا کی ہے، ان کا مقصد خاص سوئے ہوئے ذہنوں کو بیدار کرنا تھا۔ انہیں مغرب کی اندھی تقلید سے گریز تھا۔ اپنی تہذیب و تمدن کا دامن چھوڑے بغیر وہ ترمیم کے ساتھ میدان ترقی میں قدم رکھنا چاہتے تھے جہاں کہیں وہ ناصحانہ انداز اختیار کرلیتے ہیں، کلام میں بجائے بے اثری کے ایک وارفتگی اور سرمستی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جب کربلا کو وہ اپنا شعری اظہار دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

چمکتا ہے شہیدوں کا لہو پردے میں قدرت کے
شفق کا حسن کیا ہے شوخی رنگ حنا کیا ہے

یہاں پر چکبست نے قدرت کے حسین نظاروں کو شہید وفا کے خون کی سرخی سے تعبیر کیا ہے۔

چکبست کا خیال ہے کہ جس طرح حضرت عابدؑ کو اسیر کیا اور مظالم کیے گئے لیکن وہ حق پر قائم رہے ان کی پیروی میں حق پر قائم رہنے والا کبھی باطل سے سمجھوتہ نہیں کرسکتا چاہے اسے قید ستم میں ڈالا جائے یا زبان بندی کا حکم دیا جائے۔

چکبست نے اپنے عہد کے سیاسی وقومی حالات کی شاندار عکاسی اپنے شاعرانہ پیرائے میں کی۔

انہوں نے اپنے عصر کی محرومیوں، کوتاہیوں اور اداسیوں کو پیش کرنے کے بعد اس کے بارے میں اپنی رائے اپنے مستحکم ارادے بھی ظاہر کیے ہیں اور حوصلہ مندی کا سبق بھی دیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

بغاوت کا یہ لہجہ اپنے اندر ایک طوفان کا شور چھپائے ہوئے ہے، اور حضرت عابدؑ اور حرم کی گرفتاری و بے بسی کا منظر پیش کرتے ہوئے یہ اظہار کہ حق کو کبھی دبایا نہیں جاسکتا اور دبانے سے یہ تمام تر شدتوں کے ساتھ ابھرتا ہے

انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

نیا بسمل ہوں میں واقف نہیں رسم شہادت سے
بتا دے تو ہی اے ظالم تڑپنے کی ادا کیا ہے

شفق ہے آسماں پر لالہ و گل باغ و صحرا میں
دکھاتا ہے شہیدوں کا لہو رنگینیاں اپنی

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

جذبہ شوق کی تاثیر دکھا دیتے ہیں
ہم وہ پیاسے ہیں کہ دریا کو بلا لیتے ہیں

تھکے ماندے مسافر ظلمت شام غریباں میں
بہار جلوۂ صبح وطن کو یاد کرتے ہیں

ان تمام اشعار میں واقعات کربلا کے استعارے موجود ہیں بھلے وہ قدرت کے مناظر کی صورت میں شاعر کو نظر آئیں یا قید وستم اور ظلم کی شکل میں کہیں پر وہ ایسے پیاسے کا ذکر کرتے ہیں جو خود دریا کو بلا لیتا ہے۔ اور کہیں پر شام غریباں کے اندھیرے ان کو اپنے عہد کی تاریکیوں میں نظر آتے ہیں، چکبست نے واقعہ کربلا کے حوالے خوب استعمال کیے ہیں۔ ان کے بعد اس سلسلے میں سب سے اہم اور معتبر نام اقبال کا ہے، دراصل ایک طرح سے دیکھا جائے تو واقعہ

کربلا کو شعری اظہار کی شکل دینے میں واضح طور پر کمال اقبال کا ہے۔ اقبال کی قومی شاعری کی ابتدا انجمن ''حیات اسلام'' سے ہوتی ہے،۔ جہاں دوستوں کے اصرار پر ان کو مختلف نظموں کے پڑھنے کا موقع ملا۔ ''نالہ یتیم''، ''فریاد امت''، ''شکوہ'' وغیرہ اسی انجمن کی یادگار رہیں۔ اقبال کے دردمند دل نے اپنی شاعری کو ایک ایسی دوا بنا کر مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی بیماریوں کے لئے پیش کیا جو انہیں بہت دنوں تک راس آئے۔ ان کے کلام میں ہمت افزائی اور خودداری موجود ہے۔ ان کا پیغام عمل کچھ کرنے کیلئے اکساتا ہے، حوصلہ بڑھاتا ہے، چند اشعار یہاں فارسی کے ہیں۔ (رموز بے خودی)

درنداۓ زندگی سوز از حسینؑ
اہل حق حرمت آموز از حسینؑ

(زبور عجم)

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام
خون حسینؑ باز دہ کوفہ و شام خویش را

(جاوید نامہ)

فقر عریاں گرمی بدر و حنین
فقر عریاں بانگ تکبیر حسینؑ

وہ ہندوستان کو مغرب کی کوری تقلید سے بچا کر مادہ پرستی کے بجائے حق پرستی کی سمت لے جانا چاہتے تھے، ان کا کلام بہت مقبول ہوا۔ دور حاضر کے کسی شاعر کو وہ شہرت نصیب نہ ہوسکی جو ان کو ملی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی رائے میں

اقبال اردو کے ان شعراء میں ہیں جو مغربی خیالات سے متاثر ہو کر اردو میں کامیابی کے ساتھ نئے مضمون کو جگہ دیتے ہیں، اور فلسفیانہ تخیل سے مضمون کو نہایت بلند و شاندار بنا دیتے ہیں، اپنے عمیق مشاہدے سے مناظر قدرت مثلاً چاند تارے وغیرہ کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں کہ گویا وہ بھی اپنے میں سے ہیں اس رویے نے اردو شاعری کو ایک نیا میدان دے دیا ہے[1]

اقبال نے اردو شاعری کو نئے خیالات بخشے ہیں، اور بہترین استعاروں و محاوروں کا برمحل استعمال کیا ہے، اقبال کے یہاں حادثہ کربلا کا ذکر اسلام کی بنیادی خصوصیات گنواتے ہوئے آیا ہے۔ کچھ اشعار ان کے یہاں عقل و عشق کے بارے میں ہیں لیکن جب اقبال اصل موضوع کی طرف آتے ہیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کردار حسین کو کس نئی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ اور کن پہلوؤں پر زور دینا چاہتے ہیں، حسینؑ کے کردار میں انہیں عشق کا وہ تصور نظر آتا ہے جو ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ تھا۔ اور اس میں انہیں حریت کا وہ شعلہ بھی ملتا ہے، جس کی تب و تاب سے وہ ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ ذیل کے اردو اشعار اس سلسلے میں بے حد اہم ہیں:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؑ
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل

---

[1] تاریخ ادب اردو، ص ۲۰۷، ڈاکٹر اعجاز حسین

اسی طرح ہم ان کو ایک نظم کا ایک حصہ بھی یہاں پیش کر رہے ہیں جو کہ بال جبرئیل کی مختصر نظم ''فقر'' سے لیا گیا ہے اور اس کا بنیادی نقطہ ہی ہے سرمایہ شبیری۔ اقبال کہتے ہیں

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو آمیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہاں گیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی سرمایہ شبیری

اسی طرح ''بال جبرئیل'' کی ایک شاہکار نظم ''ذوق وشوق'' کے دوسرے بند میں یہی تصور ابھر کر سامنے آتا ہے

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اور اسی بند کا ایک اور شعر یہ ہے

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

یہاں پر اقبال کے جذبوں کی تڑپ نمایاں ہے کہ وہ حسینؑ کی طرح ظلم سے ٹکرانے والے کی تلاش کر رہے ہیں۔ اقبال اس رجحان کے سنگ میل کہے جا سکتے ہیں، بعد میں آنے والے شعراء نے ان کے اس تاریخی حوالے کی علامتوں کو پیش کرنے کی طرز خوب خوب دوہرائی۔

گوپی چند نارنگ اس بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

''اقبال کے اس تخلیقی رویے کا اثر بعد میں آنے والے شاعروں پر رفتہ رفتہ مرتب ہوا، اور یوں آہستہ آہستہ شعری اظہار کی ایک نئی راہ کھل گئی۔[1]

ان کی شاعری میں عصر حاضر کی محرومیوں کا کرب اور کسی حسینؓ کی تلاش موجود ہے، ریگ عراق کا منتظر ہونا یا کشت حجاز کا تشنہ کام ہونا شاعر کے ذہن کا ایک تصوراتی پیکر ہے، یعنی وہی تشنگی پھر ہے اور اپنے عہد کے حالات میں اقبال کو پھر خون حسینؓ کی سرخی کی طلب محسوس ہوتی ہے، جو باطل پر چھا جائے اور ظلم کے ہر رنگ پر بھاری پڑ جائے اور باطل کو بھرپور جواب دے سکے یہ تھی وہ تڑپ اور آگ جو اقبال کے اس حوالے کی طرف بار بار لے گئی اور شعر میں ڈھل گئی

اذاں کشت خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خون شبیرے ندارد

(ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء)

اگر پندے زد رو ایسے پزیری
ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتوے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیر بگیری

رثائی ادب سے ہٹ کر نئے تناظر میں اس حوالے کی اہمیت کا ذکر اردو دنیا کے لئے ایک بالکل نیا موضوع تھا۔ اردو کا ایک شعر اقبال کا دیکھئے

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

---

[1] سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، گوپی چند نارنگ، صفحہ ۳۴

واقعہ کربلا کے سلسلے میں اقبال کی شاعری ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے دراصل بھرپور اظہار غزل اور نظموں میں اس تاریخی حوالے کا سب سے پہلے اقبال نے کیا۔ انہوں نے شہادت حسینؑ کی مقصدیت اور قربانی کی اہمیت اور کرداروں کی بلندی کو واضح کیا اور مرد مومن، مرد کامل، حقیقت ابدی کو شعری پیرائے میں پیش کر کے پیغام دیا۔ راہ عمل اور حق و صداقت کی اہمیت واضح کی ہے۔

اقبال کے بعد اسی عہد کے ایک اور شاعر فضل الحسن حسرت موہانی ہیں۔ حسرت کی شاعری میں روایتی قدروں کی بھرپور اہمیت ہے روایت کی پاسداری کے علاوہ قدیم شعراء کی تقلید کا اثر ان کے یہاں کئی لحاظ سے نمایاں ہے۔ ساقی و پیمانہ، شمع و پروانہ، گل و بلبل وغیرہ ان کے خاص موضوع کلام تھے، کبھی کبھی پرانے لوگوں کی تقلید میں مسلسل غزلیں بھی کہتے تھے۔ ان کا کلام نہ تو سراپا یاس و نامرادی کا مرقع ہے اور نہ عیش و نشاط کی محفل، ان کے یہاں دکھ درد کا ذخیرہ ہے تو مسرت و شادمانی بھی ہر جگہ نظر آتی ہے، دوستوں کا شکوہ، احباب کا ماتم، سیاسی و مذہبی عقائد وغیرہ سب ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ غزل کے پیرائے میں ہی انہوں نے واقعہ کربلا کو پیش کرنیکی کوشش کی ہے ۔ لیکن غزلیت حاوی ہی رہتی ہے کربلا بھرپور طریقے سے ابھر کر نہیں دکھائی دیتی بلکہ اشاروں کنایوں میں بات کہی گئی ہے جیسے یہ شعر کہ

ہوگیا راہ عشق میں جو شہید
وہ فنا ہوکے بھی فنا نہ ہوا

یہاں راہ عشق میں شہید استعمال کیا گیا ہے لیکن دراصل یہ امام حسینؑ کی راہ حق میں شہادت اور بعد شہادت ان کے بے مثال مقبولیت اور حیات دائمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے

لذت عشق کب ملی جب تک
سر تہ خنجر جفا نہ ہوا

اور اس شعر میں صاف طور پر ذکر کربلا کرتے ہوئے حسرت کہتے ہیں

لاکھوں ہی بے کس اس میں تڑپے ہیں خاک و خوں میں
کوچہ ہے تیرا ظالم یا دشت کربلا ہے

اور ذیل کے شعر میں حسرت نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے سر کو نوک سناں پر اٹھائے جانے کا ذکر یوں کیا ہے

کیا نہیں شوق شہادت کو یہ کافی اعزاز
کہ مرا سر ہے ترے نوک سناں کی رونق

تم پر مٹے تو زندہ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

اب یہاں پر زندہ جاوید، فنا، بقا یہ سب لفظ واقعہ کربلا کے استعارے ہیں، حسرت کہتے ہیں کہ

اسیران بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی
نگہباں چیخ اٹھے ہل گئی دیوار زنداں کی

اس شعر میں حضرت عابدؑ اور امام حسینؑ کے حرم کی شام کے زنداں میں قید و مصیبت کا ذکر حسرت نے غزل کے لفظوں میں کیا ہے، اور اسی طرح کا یہ شعر بھی ہے

کافی ہیں میرے بعد پشیمانیاں تری
میں کشتہ وفا ہوں مرا خوں بہا ہے کیا

اور اس شعر میں امام حسینؑ کے حق پر ہونے کی وجہ سے ان کی دائمی مقبولیت اور بقا کا ذکر حسرت یوں کر رہے ہیں

تھے حق پہ وہ بے شک کہ نہ ہوتے تو نہ ہوتا
دنیا میں بپا ماتم شبیر ابھی تک

اور یہ غزل کا شعر

ہم سر جھکا چکے تھے علم ہو چکی تھی تیغ
پھر کیا کیا خیال کہ قاتل ٹھہر گیا

حسرتؔ نے سلام کے بطور بھی کچھ اشعار کہے ہیں جو یہاں رقم کئے جا رہے ہیں

امام برحق اہل رضا سلام علیک
شہید معرکہ کربلا سلام علیک
ثبوت یہ ہے کہ نور شہادت کبریٰ
تری جبیں سے نمایاں ہوا سلام علیک
عبث ہے اور کہیں راہ صبر و حق کی تلاش
تری مثال ہے جب رہنما سلام علیک

ان اشعار کے بعد غزل کے پیرائے میں غیر واضح انداز میں یہ شعر دیکھئے

اک بار تھا سر گردن حسرتؔ پہ رہیں گے
قاتل تری شمشیر کے احسان ہزاروں

اور اس شعر میں واضح طور پر خون شہیدان کربلا کی حرمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

غم نہ ہو ممکن تو چار آنسو ندامت کے سہی
کچھ تو آخر حرمت خون شہیداں کیجیے

حسرت کے کلام کا یہ مختصر سا جائزہ لینے کے بعد ہم اسی عہد کے ایک اور شاعر فانی بدایونی کی شاعری میں اس تاریخی حوالے کو تلاش کریں گے۔

فانی کی شاعری میں یاس و حسرت و حزن و ملال شدت کے ساتھ ملتا ہے، لیکن روایت کی پاسداری اور غزل کی روایتی قدروں کا دامن تھام کر چلتے ہوئے فانی اشاروں میں بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن چونکہ واقعہ کربلا بہ ذات خود ایک داستان عشق ہے اور داستان غم بھی ہے امام حسینؑ نے عشق الٰہی کیلئے میدان میں قربانی پیش کی تو اس داستان سے غزل کو متاثر ہونا ہی تھا فانی بھی کہتے ہیں

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا
نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

کربلا کے میدان میں کربلا والے عشق الٰہی کے جذبات کا سمندر دل میں لئے یزیدی لشکر کی باطل پرست طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے جس طرح نظر آتے ہیں اس کا ذکر غزل کے بیان میں فانی یوں کرتے ہیں

فانی کف قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی

فانی نے عشق کے ساتھ شہید لفظ کو یوں استعمال کیا ہے کہ ذہن بے ساختہ اسی عظیم

سانحہ کی جانب چلا جاتا ہے، فانی بدایونی کا شعر ہے

مٹ کر بھی داغ شاہد خون شہید ہے
دھویا ہوا ہے دامن قاتل جگہ جگہ

اور یہاں پر فانی نے ''بے گور وکفن'' کا ذکر کیا ہے اور یہ استعارہ واضح طور پر کربلا سے متعلق ہے اور امام حسینؑ کا وطن چھوٹا تھا تو ان استعاروں کی روشنی میں فانی یہ شعر کہتے ہیں

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور وکفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

وطنِ کا چھوٹنا یہاں پر امام حسینؑ کی بے وطنی کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے، دراصل کربلا وہ جگہ ہے جہاں عشق الٰہی کا نام زندہ رکھنے کیلئے، اتنی قربانیاں دی گئیں۔ اور یہ جنگ حق و صداقت کی باطل سے جنگ تھی بہرحال فانی نے اپنے شعروں میں دبے دبے انداز میں واقعہ کربلا کے استعاروں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

لکھنؤ کے شعراء میں مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی اہم غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے یہاں زبان کی صفائی، اور مضمون کی تلاش کی پے در پے کوشش ہے، خیالات کو بلندی دینے کے لئے انہوں نے بڑی محنت کی ہے نہایت تلے الفاظ بہترین محاورے شاعرانہ تیور کے ساتھ نظم کرتے ہیں واردات حسن وعشق کو لطیف اشاروں میں بیان کرنا ان کا کارنامہ ہے۔ اس سے ان کی فطرت شناسی اور نازک جذبات کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ زورِ کلام اور پرواز تخیل کی کوشش ثاقب کے اشعار میں ایک انفرادی حیثیت پیدا کردیتی ہے۔ ان کے یہاں استعاروں کی صورت میں یہ تاریخی حوالہ موجود ہے۔ لیکن غزل کی کلاسیکی روایت کا دامن وہ نہیں چھوڑتے ہیں اور اس پاسداری کے باوجود سانحہ کربلا کا ذکر کہیں نہ کہیں ان کے یہاں اپنی جھلک دکھا ہی جاتا ہے۔ شعر دیکھئے۔

سن ہی لیں گے داستاں سب قیدی بیداد کی
کچھ نہ کچھ کہنے لگی ہیں بیڑیاں فولاد کی
صبح تک محبوس غم کا کچھ پتا چلتا نہیں
رات تک زنداں سے آتی تھی صدا فریاد کی

یا یہ اشعار بھی اسی طرح کے ہیں دیکھیے

وہ گرد اٹھی وہ تلاطم ہوا وہ حشر آیا
وہ آئے روندنے والے ہماری تربت کے
مٹیں گے نام و نشاں کیا مٹائے لاکھ فلک
مزار بولتے ہیں کشتگان حسرت کے

ان اشعار میں تلاطم، حشر، تربت کا روندنا، مزار، کشتگان حسرت یہ سب واقعہ کربلا کے معنوی استعارے ہیں۔

اس کے بعد یہ شعر

اپنے گھر میں ہوں مگر دل مائل فریاد ہے
وادیٔ غربت کا سناٹا ابھی تک یاد ہے

ہے قیدیوں کا حال کچھ ایسا کہ اہل دل
روتے ہیں قیدخانے کی دیوار دیکھ کر

اے تنگ نائے مرقد اللہ رے تیری شہرت
تیرے لئے مسافر آئے کہاں کہاں سے

ظالم و مظلوم کے انداز کھل ہی جائیں گے
روز محشر رنگ بھر دے گا ہر اک تصویر میں

ان سب اشعار میں کہیں صاف اور کہیں اشارتاً واقعہ کربلا کے استعارے اور واقعات ثاقب نے نظم کئے ہیں اور اپنے ہم عصر شعراء کی طرح بڑی حد تک اس تاریخی حوالے سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے ہم عصر شاعر آرزو لکھنوی کے کلام میں بھی کربلا کا پرتو نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آرزو نے مثنوی، رباعی، قطعات، نظمیں، سلام، مرثیے بہ کثرت کہے ہیں۔ ان سے ان کی پرگوئی اور زبان پر حاکمانہ تصرف کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن سب سے زیادہ ان کی شہرت کا باعث ان کی غزلیں ہی ہوئیں۔ غزلوں میں ایک درد انگیز یاس ہے جس کے اظہار کیلئے ایسے اثر کرنے والے الفاظ وہ شعروں میں لاتے ہیں کہ رنج والم کے ساتھ ایک کیف بھی پیدا ہوتا ہے۔ انداز بیان اور برجستگی میر کی سی ہے اردو کی غزلوں میں بڑی فنکارانہ مہارت رکھتے ہیں:

زیر خنجر بندھتی ہے نیت ادائے فرض کی
یہ نماز عاشقی ہے جو قضا ہوتی نہیں

یہ دشت حرص ہے غارت گروں کا مسکن ہے
پھٹا بھی ہو تو رہے گا نہ پیرہن باقی

بگولے اٹھ کے یہ کہتے ہیں خاک بے کس کے
کسی غریب کی میت پڑی نہیں رہتی

ان سب اشعار میں کربلا پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے کہیں پر بے کس کا لاشہ ہے تو کہیں پر غریب کی میت اور کفن کے پھٹا ہونے کے باوجود یزیدی فوج کے غارت گر اسے بھی لوٹ لینے کے لئے کوشاں تھے یہ سب منظر شاعر اپنے یہاں غزل کے انداز میں پیش کر رہا ہے۔

مہماں نواز وادی غربت کی خاک تھی
لاشہ کسی غریب کا عریاں نہیں رہا

یہاں بھی بنیادی خیال وہی ہے یعنی امام حسینؑ کی شہادت کے بعد لاش کی پائمالی اور خاک سے جسموں پر کفن کا تصور پیش کیا ہے

ضد چھوڑ دے رکھ شرم مری بزم عزا کی
جو خود سے امنڈ آئے ہیں یہ اشک بہادے

کرتی ہے تقسیم عالم بھر میں لے لے کر صبا
یہ تبرک بن گئی کس کے عزاخانے کی خاک

آرزو لکھنوی نے مندرجہ بالا اشعار میں عزاخانے کی خاک کے تبرک ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ اور آہ وزاری کا اصرار کیا ہے۔ دراصل شاعر کے جذبات یہاں پر امام حسین کی

عظمتوں کا تصور کرتے ہوئے ابھر آتے ہیں اور وہ مغلوب الجذبات ہو کر کہہ اٹھتا ہے کہ اے ظالم انسان حق وصداقت کی جنگ میں حق کی فتح کا اعلان حسینؑ کی ذات اور شہادت کی شکل میں آج تک قائم ودائم ہے۔ اس حقیقت سے آنکھ مت چرا اور قصہ غم پر جو آنسو آنکھ میں آئے ہیں انہیں بہادے۔ بہر حال آرزو نے بھی اس شعری حوالے سے استفادہ کیا ہے۔

اس کے بعد صفی لکھنوی بھی اہم شاعر ہیں اور ان کی شاعری کو بھی اسی تاریخی حوالے کے پس منظر میں تلاش کریں گے۔

صفی کی غزلوں میں سادگی ایک خاص جوہر ہے۔ خیال وطرز بیان میں سادگی ہونے کے باوجود عامیانہ پن کہیں نہیں ملتا۔

محاورات وتشبیہات کے استعمال سے کلام میں چاشنی اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ زبان نرم وشیریں ہے۔ نظم کو ہر دل عزیز بنانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کر کے اردو کے میدان کو وسیع تر کرنے کی خوبی کے ساتھ کوشش کی ہے۔ کربلا کا لفظ، قتل گاہ کے ہم معنی کے طور پر غزل میں استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں صاف صاف مقتل کے معنی میں اور کہیں پر تشبیہ واستعارہ کے بطور۔ مقتل کے معنی میں کربلا کا لفظ استعمال ہوتا ہے ہم یہاں پر صفی لکھنوی کی غزلیہ شاعری میں یہ استعارے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شعر پیش ہے

جس میں کبھی بندھے تھے سودائیان الفت
اب تک نشاں لہو کے اس ریسمان میں ہیں

زمانہ ہوگیا باغ محمد کی تباہی کو
ابھی تک ہیں وہی گلکاریاں خون شہیدان کی

سرتا بہ قدم صورت گل زخم ہوں لیکن
چہرے سے نمایاں ہے اثر جوش طرب کا

صحرائے محبت میں تیغیں بھی اگر برسیں
پیچھے نہ قدم سر کے اے ہمت مردانہ

معرکہ کربلا میں ہر ظلم و جبر و مصیبت کے باوجود امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء حق پر قائم رہے اور اسی لئے آج تک خون شہداء کی سرخی قائم ہے۔ صفؔی نے ان خیالات کو بڑے خوبصورت انداز میں شعروں میں پرو دیا ہے۔

لکھنؤ کے شعراء کی اس فہرست میں ایک منفرد نام یگانہ چنگیزی کا ہے، یوں تو وہ لکھنؤ کی روایات سے الگ نظر آتے ہیں، لیکن ان کا ذکر اسی صنف میں کیا جاتا ہے۔ جو یہاں کے بیسویں صدی کے شعراء کا دور ہے، فن کے لحاظ سے ان میں جدت اور امید پائی جاتی ہے۔ مضامین کے لئے ایسے الفاظ لاتے ہیں کہ پوری طرح مفہوم کو ذہن نشین کرادیں۔ کلام میں تخیل کی بلندی اور ذہنی پرواز نمایاں ہے۔ یگانہ کا کلام صفائی اور بیباکی کے اعتبار سے آتش کے کلام کی طرح دو آتشہ ہے۔ یگانہ فارسی ترکیبوں کے دلدادہ ہیں۔ اکثر تشبیہوں کی جدت سے بیان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان صاف و شیریں ہے۔ اشعار دیکھئے

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہوا دریا کنارے

یہاں پر حضرت عباسؑ کی وفاداری کو اس طرح واضح کیا ہے کہ انسان وہی ہے جو مرد

کامل ہے۔ جس میں اتنا اعتماد ہے کہ پیاسا لب دریا کھڑا ہو اور پانی کا قطرہ نہ لے یہاں پر یگانہ نے انسانی کردار کا ایک بہترین پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی مثال صرف اور صرف کربلا کے میدان میں ملتی ہے

نہ ترک اختیار آساں نہ ضبط اضطراب آساں
کوئی ایسا بھی ہے پیاسا پلٹ آئے جو ساحل سے

اس شعر میں بھی وہی منظر دوہرایا گیا ہے

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمیں سے دل لگایا تھا
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر

یہ تمام اشعار نہایت پر اثر انداز میں نہ صرف اپنے معاشرے کے کرب و انتشار کا احساس دلاتے ہیں بلکہ مظلومیت بے بسی و بے کسی اور حق و باطل کی کشمکش کی ان تمام کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں جن کا تعلق واقعہ کربلا اور امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کی قربانیوں سے تھا۔ اس طرح یگانہ کی تقریباً ہر غزل میں ایسے اشعار اور استعارے غیر معمولی طور پر متاثر کرتے ہیں۔

یاس یگانہ کے یہاں زیادہ تر درد و غم کے واقعات کا بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کی رنگینی اور اثر بہت نمایاں ہے۔ چونکہ واقعہ کربلا بذات خود ایک درد و غم کا واقعہ ہے۔ اور حیات انسانی پر اس واقعہ کے اثرات سے انکار ناممکن ہے اس لئے دانستہ اور غیر دانستہ دونوں طرح سے غزل کے المیہ مضامین یگانہ کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ان کی غزل میں محاوروں استعاروں اور ترکیبوں کی شکل میں واقعہ کربلا ہر جگہ نمایاں اور موجود ہے غزل میں عاشق کا جو پیکر ابھر کر آتا ہے اس میں جواں مرد، شہید، یہ سب امام حسینؑ کے کردار سے غزل میں یگانہ نے

خوب اتارا ہے، ان کے یہاں چونکہ ایک رنج وغم کی کیفیت موجود رہتی ہے، اس لئے واقعہ کربلا اپنی بھرپور جلوہ آرائیوں کے ساتھ موجود ہے لیکن مدت تک آپ کا قیام الہ آباد میں بھی رہا، بسلسلۂ ملازمت ہندوستانی اکیڈمی کے رسالہ ہندوستانی کے ایڈیٹر عرصہ تک رہے۔

اسلوب کے لحاظ سے اصغر کا انداز بیان منفرد ہے اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک زبان و بیان و خیال کا تعلق ہے اتنا غیر تقلیدی اور نرالے انداز تغزل کا نمونہ اردو میں کمیاب ہے۔ اصغر بہت کم گو اور دقت پسند شاعر تھے۔ اتنا کم کہنے پر بھی اہل نظر کو اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے کلام میں قابل قدر چیزیں ہیں۔ ان کے یہاں سب سے پہلی چیز لب ولہجہ کی وہ جدت آمیز رنگینی ہے جو سامعین کو چھیڑ کر متاثر کرتی ہے۔ دوسری چیز سکون و اضطراب کی آمیزش ہے جو ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ سامنے کی باتیں ہوں یا عام واردات قلبی ہوں ان سب کو خاص انداز سے بیان کر دیتے ہیں، جس سے کلام میں لوچ اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے، ان کے کلام میں فلسفیانہ تخیل حقائق و مصارف کے رموز شعریت لئے ہوئے نہایت خوبی کے ساتھ جگہ پاتے ہیں، تمام کلام خیالات کی پاکیزگی متانت و لطافت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ ان کے اشعار دیکھئے۔

اسیران بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی
تڑپ کے ساتھ اونچی ہوگئی دیوار زنداں کی

مندرجہ بالا اشعار میں اسیران کربلا کا ذکر ہے

قاتل نگاہ یاس کی زد سے نہ بچ سکا
خنجر تھے ہم بھی اک تہ خنجر لئے ہوئے

اس شعر میں امام حسینؑ کی نگاہ یاس کا ذکر کیا گیا

غزل کیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغرؔ
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغرؔ گونڈوی کے کلام میں واقعہ کربلا کی بازگشت تلاش کرنے کے بعد جگرؔ مرادآبادی کی شاعری میں ان عناصر کا مطالعہ کیا جائے گا۔[1]

جگر کی شاعری میں تغزل کو خاص اہمیت حاصل ہے، جگر کو شاعری ترکہ میں ملی۔ بچپن ہی سے اس کا شوق ہوا، پہلے والد سے اصلاح لیتے تھے پھر داغ کو کلام دکھانے لگے۔ داغ کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم کو کئی غزلیں دکھائیں۔ ان کی شاعری میں کیف وارفتگی اور بے خودی کی لہر ہر جگہ موجود ہے۔ جگر کی آنکھیں حسن شناس ہیں۔ جگر کو محبت سے محبت تھی۔ جگر کے کلام میں ایک نمایاں سادگی و روانی ہے۔ انہیں رعایت لفظی اور بنوٹ کا کسی قدر چسکا ہے۔

الفاظ کی تکرار سے وہ اپنے اشعار میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ان کے موجودہ کلام میں بالکل کم ہوگئی ہیں۔ ان کا رجحان بعد میں زیادہ تر مضمون و معنی کی طرف ہے۔ بعد کے کلام میں زیادہ متانت زور اور پختگی ملتی ہے، ان کے یہاں واقعہ کربلا کے سلسلہ میں محض ہلکے اشارے پائے جاتے ہیں۔

کیا کہیں خونِ دو عالم سے بھی اب بجھتی ہے پیاس
خونِ بسمل کی حرارت خنجرِ قاتل میں ہے

کمال تشنگی ہی سے بجھا لیتے ہیں پیاس اپنی
اسی تپتے ہوئے صحرا کو ہم دریا سمجھتے ہیں

1۔ کلام اصغر گونڈوی، مرتبہ نشاط روح، ۱۹۲۵ء

بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس
شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے

ان میں کسی گہرے احساس کا پتہ نہیں چلتا، لیکن لاشعوری طور پر واقعہ کربلا کے اثرات تلاش کئے جاسکتے ہیں۔

اس دور کے شعراء میں سیماب اکبرآبادی اور بعض دوسرے شاعروں کے کلام میں اس واقعہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ہر شاعر اس تاریخی اور مذہبی واقعہ سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور تھا۔ دراصل جس نے بھی انسانیت کی بلندی اور مظلومیت سے ہمدردی پر توجہ دی اس نے اس واقعہ کو اپنی شاعری کا جزء ضرور بنایا۔

ابتدائی ابواب میں یہ تفصیل پیش کی جاچکی ہے کہ کربلا میں دو لشکر مقابل میں تھے ایک خیر کا لشکر تھا اور دوسرا شر کا لشکر تھا۔ کربلا دراصل معرکہ خیر وشر تھا۔ وہ شر جس کا آغاز شیطان کی نافرمانی سے ہوا تھا اس نے حق وصداقت کے نمائندے کے سامنے سر جھکانے سے انکار کردیا تھا یہاں یزید نے امام حسینؑ کی امامت ـــــــ سے انکار کردیا تھا۔ غزل گو شعرا نے کربلا کو اپنے اشعار میں معرکہ خیر وشر کہا ہے، واقعات کربلا میں یہ بھی بڑا سخت وقت تھا کہ امام حسینؑ بالکل تنہا تھے اور اس وقت انہوں نے خود کو تنہا پا کر نصرت کے لئے آواز لگائی تھی تو اس عہد میں شاعر نے جب خود کو یعنی فرد نے اپنی ذات کو جب تنہا محسوس کیا تو اسے خود میں وہی مظلوم کیفیت کا احساس ہوا جو امام حسینؑ سے ازلی طور پر وابستہ ہے، فرد میں اسی تنہائی، گھٹن، انتشار نے یہ رخ اختیار کیا کہ وہ اپنے عہد کی مماثلت کربلا کے میدان اور شام وکوفہ کے بازار، رسن بستگی، برہنہ پائی، طوق وسلاسل، دار ورسن ......۔ بے چادر، بے پردگی، وغیرہ میں تلاش کرنے لگا ہے۔

دراصل واقعہ کربلا ایک ایسا مشہور و معروف واقعہ ہے، جس سے دنیا کی بیش تر قومیں بخوبی واقف ہیں اسلیئے اس حوالے سے کوئی بھی بات جلد اور گہرائی سے محسوس کر لی جاتی ہے اس لئے شعراء نے اپنے جذبات کی عکاسی میں اس واقعہ کا آئینہ استعمال کیا ہے۔ اور خوب سے خوب تر طریقے سے بھر پور انداز میں ایسے ایسے اشعار نکالے ہیں جو ذہن و دل کو فوراً متاثر کرتے ہیں باطل کی قوتوں سے ہار نہ ماننا ایسا تصور ہے اور مرد کامل و مرد مومن جسے اقبال نے اپنے تصوراتی ہیرو بنایا ہے وہ صاف طور پر امام حسینؑ کی شخصیت کا آئینہ ہے، اس سلسلے میں وقار عظیم کی تحریر قابل غور ہے۔

''مسلمان کو یہ شبیری حاصل ہو جائے تو وہ انسانیت کے اس مرتبہ پر پہنچتا ہے کہ اس کا اخلاق دنیا کے لئے مثال اور نمونہ بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے کلام کے بہت سے حصوں میں مرد مومن کے صفات اس طرح یکجا کئے ہیں کہ پڑھنے والا ایک ایسے انسان کا تصور کر سکے جو انسانی اخلاق اور سیرت کی معراج کمال ہے گو یہ صحیح ہے کہ اس طرح کی صفات کو یکجا کرتے وقت اسلام کا ماضی ان کی نظر کے سامنے رہا تاریخ کی روشنی میں وہ ذاتیں چلتی پھرتی عمل کرتی نظر آتی ہیں جنہوں نے اسلامی آئین کی پیروی کو اپنے عمل کی بنیاد بنایا ہے۔[1]

جیسا کہ اس تجزیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً بھی شعراء نے اشاروں استعاروں اور محاوروں میں اس واقعہ کو بار بار دوہرایا ہے اور جب بھی یہ ذکر آیا ہے تو اس خوبی کے ساتھ کہ ذہن پر دیرپا نقش چھوڑ گیا ہے ادب میں ان اشعار کا اپنا الگ مقام ہے بعد کے دور میں ترقی پسندوں نے بھی خوب خوب اس تاریخی حوالے سے استفادہ کیا ہے اور اس کے استعاروں کا

---

[1] اقبال شاعر اور فلسفی، سید وقار عظیم، صفحہ ۱۶۵

استعمال بخوبی اور حسن کمال کے ساتھ نمایاں طور پر کیا ہے خصوصاً پاکستان کے شاعروں نے اس استعارے کو بہت برتا ہے اور انہوں نے بڑے ہی سلیقے سے یہ ذکر کیا ہے وہاں یہ رجحان واضح طور پر موجود ہے اور ترقی پسندوں کے بعد جدید شعراء نے بھی اس استعارے کو اپنایا ہے۔

باب ششم

ترقی پسند شعراء میں واقعات کربلا

ممتاز ترقی پسند شعراء کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ

ترقی پسند ادب سماجی ترقی کا دعوے دار ہونے کا اور اس ترقی کے لئے ذہنی فضا تیار کرنے والی فکری سرگرمیوں میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، یہ عوام کی جائز امنگوں اور معاشرہ کی تشکیل کے کام کے ساتھ اس قدر گہرا تعلق رکھتا ہے، اسے ''رومانیت'' کا طعنہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ وہ الزام ہے جسے ترقی پسند ادب کی اخلاقی اساس پر یقین رکھنے والے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ جس قدر تیزی کے ساتھ اس الزام کو گلے کا ہار بنالیا جائے گا۔ اتنی ہی تیزی سے معاشرہ میں ظلم اور ناانصافی کی طاقتیں کمزور ہوتی چلی جائیں گی۔

محمد علی صدیقی صاحب کی تحریر کے آئینے میں اسے دیکھئے:

''ہر وہ ادب جو زندگی کی معنویت پر اصرار کرتا ہے زندگی کا آئینہ بنتا ہے، اور اسے آئینہ دکھاتا ہے، وہ حروف میں زندگی کی محسوس لہروں کا ارتعاش پیدا کرتا ہے، اس نوع کے ادب میں مجہولیت اور اکہرا پن صرف انہیں قارئین کو نظر آسکتا ہے، جو زندگی اور اس کے منطقی تقاضوں کو خاطر میں نہ لانے کا فیصلہ کر چکے ہوں اور اپنی اس واضح حکمت عملی کو ''ادب برائے ادب'' کی غیر سیاسی تعریف میں چھپانا چاہتے ہوں'' [1]

ترقی پسند ادب کا ایک یہ بھی داعیہ ہے کہ ادب انسانی مقدر کی صحیح خطوط پر تشکیل کا ایک ذریعہ ہے وہ ادب تمام حلقوں کے لئے مناسب اور سود مند کام نہیں جو تبدیلی وتغیر کی جملہ کوششوں کو رائج الوقت مفروضات کے لئے چیلنج گردانتے ہیں۔ طبقاتی سماج میں صرف ایک

[1] ترقی پسند ادب، محمد علی صدیقی، صفحہ ۶۹

طبقہ کے مفروضات پر مبنی ادب کا فروغ چاہنے والے اس قدر سادہ لوح کیوں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مکتبِ فکر سے ہٹ کر تحریر ہونے والے ادب کا جواز بھی نہ سمجھ سکیں۔ ترقی پسند ادب انسان کی ''مائیکرو'' کائنات کا مائیکرو اظہار ہے لیکن اس طرح کہ زندگی اور کائنات اور زندگی اور تاریخ کے مابین ایک قوس سی کھینچتی دکھائی دیتی ہے۔

ترقی پسند ادب انسانی آزادی کا ادب ہے۔ انسانی مقدر پر استحصالی قوتوں کی عمل داری کے خلاف ادب ہے۔ یہ غیر جانبدار ادب نہیں ہے کہ اپنا رخ زندگی گریز رجحانات کی جانب منعطف کر کے یہ دعویٰ کرے کہ ادیب اجتماعیت پسندی پر یقین نہیں رکھ سکتا کہ اس طرح فنکار کی انفرادیت مجروح ہو جاتی ہے۔ انفرادیت کا تانا بانا تاریخ کی پُر اسرار قوتوں سے جا ملتا ہے جو جبریت Fatalism کا نظریہ جنم دیتی ہے۔ جب کہ ترقی پسند ادب تاریخ کی پُر اسرار قوتوں کی بجائے جدلیاتی مادیت پر قائم ایک ایسا سماجی نظام سامنے آیا جس نے کچلے ہوئے عوام کو اپنی توجہ کا مرکز اور طاقت کا منبع قرار دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نظام نے ایک ملک کے کچلے ہوئے عوام کو دوسرے ممالک کے کچلے ہوئے عوام کے ساتھ ایک ایسی لڑی میں پرو دیا ہے جو ناگزیر طور پر ایک دوسرے کی معاونت کرتی ہے، اس نئے سماجی نظام نے نظریہ علم ہی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نظریہ کے تحت علم پُر اصرار قوتوں پر فتح پانے کا وسیلہ بن گیا ہے، ادب بھی لازمی طور پر علم اور عمل کے اس انطباقِ کلی میں ایک ایسا فریق بن چکا ہے جو زندگی کی تفہیم اور اس کی بنیاد پر زیادہ موثر کردار ادا کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب کی ضرورت اور اہمیت ہمارے سماج کے لئے اتنی ہی بنیادی ہے جس قدر آزادی اور معاشرتی انصاف کی۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک بڑے زور و شور سے عمل کرتی رہی، ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں پہلی ترقی پسند مصنفین کانفرنس ہوئی۔ دراصل یہ رجحان انقلاب روس ۱۹۱۸ء میں جو اشتراکیت کی لہر اٹھی تھی وہ پوری دنیا میں پھیل گئی۔ تمام ادیب اور دانشور اس سے متاثر ہوئے تھے لیکن

باضابطہ طور پر اشتراکی نقطہ نظر کی تبلیغ کا کام ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' قائم ہو جانے کے بعد شروع ہوا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس سلسلے میں اپنی تحریر میں اس بارے میں کافی حد تک روشنی ڈالی ہے:

''ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے اردو ادب کے راج میں سیاسی شعور کا داخلہ شروع تھا۔ حالؔی، آزاؔد، اور اقباؔل کے ذہنوں میں ان تحریکات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات سخن جنم لے چکے تھے چنانچہ میرا خیال ہے کہ اگر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں نہ بھی پڑتی جب بھی اردو شاعری موجودہ موضوعات سخن سے دوچار ہو جاتی'' [۱]

ابتداء میں مختلف عقائد اور سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اور دانشور ترقی پسند ادب کی سرپرستی کر رہے تھے۔ ان میں رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذر الاسلام، پریم چندر، سروجنی نائیڈو، مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار وغیرہ کے نام اس ضمن میں آتے ہیں، ایسے مختلف الخیال اور مختلف العقائد لوگوں نے اس تحریک کو کس لئے قبول کیا اور اس کا جواب شہزاد منظر نے یوں دیا ہے:

''ابتداء میں ترقی پسند ادبی تحریک کا مقصد ادب کے ذریعے سوشلزم کا پرچار نہیں تھا اس کا بنیادی مقصد قومی آزادی کا حصول، عقلیت پرستی اور معاشرے میں موجود توہمات کو دور کرنے کے لئے لکھنا لکھانا تھا۔ اس بات کا ثبوت ترقی پسند تحریک کا پہلا منشور ہے جس میں سوشلزم کا کہیں ذکر نہیں ہے'' [۲]

---

۱ ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، خلیل الرحمن اعظمی۔

۲ ترقی پسند ادب کے پچاس سال، صفحہ ۳۶۱، شہزاد منظر

لندن میں ۱۹۳۵ء میں جب ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی تو کون کہہ سکتا تھا کہ چند سر پھرے نوجوانوں کا یہ اقدام برصغیر کی سب سے بڑی ادبی تحریک کی شکل اختیار کرلے گا۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں پہلی ترقی پسند مصنفین کانفرنس بے حد کامیاب ہوئی۔ ہندی، اردو بولنے والے علاقے میں اسے ٹھوس کامیابی ملی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء میں یہاں ہندی اور اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی مشترکہ کانفرنس ہوئی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کی نظریاتی شدت میں زبردست اضافہ ہوگیا اسی دور میں ترقی پسند ادیبوں نے ادب کی فنی اور جمالیاتی قدروں کو فراموش کر کے ادب کو پروپیگنڈہ کی سطح تک پہنچایا اور نعرے بازی کو انقلاب پسندی قرار دیا جب کہ ترقی پسند ادب کے پیش رو یا پہلے دستہ کے ادیب نعرے بازی کی حد تک پروپیگنڈہ کرنے کے قائل نہ تھے اور اپنی تحریروں میں اس بات کی طرف توجہ بھی دلا چکے تھے۔ مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں:

> ''مقصد کی ننگی نمائش کا نام فن یا ادب نہیں ہے بدویت کے دور سے لے کر اب تک اگر انسانی ثقافت کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا اور صالح ذہن اس کو مانتے آئے ہیں، مارکس، انگلز، اور لینن بھی ادب کو ڈھنڈورا نہیں سمجھتے ہیں اور انگلز تو جس کو میں کئی اعتبار سے مارکس کے مقابلے میں بہت زیادہ بالغ اور رچی ہوئی شخصیت مانتا ہوں ادب کو پروپیگنڈہ سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو، لیکن پروپیگنڈہ کو ادب نہیں سمجھتا اس نے ایک موقع پر صاف صاف لکھا ہے کہ جتنا ہی زیادہ مصنف کا مقصد چھپا ہوا ہوگا اتنا ہی زیادہ فنی تخلیق کے حق میں بہتر ہوگا۔''[1]

بعد کے ترقی پسندوں کا مسئلہ یہ تھا کہ فنی محاسن کا خیال رکھ کر وہ اپنی بات عوام تک

---

[1] ترقی پسند ادب کے پچاس سال، صفحہ ۳۶۱، مجنوں گورکھپوری، مرتب: شہزاد منظر

با آسانی پہنچانا کار دشوار تصور کرتے تھے۔اسی لئے ان کے یہاں خطیبانہ انداز پایا جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا نقطہ آغاز ۱۹۳۵ء ہے اور تحریک کے بارے میں علی سردار جعفری صاحب لکھتے ہیں کہ

''ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کے انسان کے بیدار ضمیر کی صدائے بازگشت ہے اس تحریک سے متعلق فنکاروں کی بہترین تخلیقات میں فن کار کے دل کا حسن اور روح کی صداقت شامل اور جلوہ گر ہے، حسن وصداقت کیا ہے؟ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی نے مارچ ۱۹۶۶ء میں نظریاتی اور تہذیبی مسائل پر ایک تجویز منظور کی تھی جس میں یہ عبارت ہے:

What is the creator? Whether consider music poetry the novel Drama cinema Architecture, painting or sculpture the creator is not just a manufacturer he is no a mere arranger in every work of art there is a part which is not reducible to a set of given data and this part is the creative artist himself (Marist on literature an anthology editet by david craig dong in books page 527)

ترقی پسندوں نے ایک نئے انداز سخن اور موضوع کی تلاش کا کام پورا کیا۔ترقی پسند شعراء میں تین رجحان غالب رہے، پہلا رجحان بلند آہنگ لہجہ میں سیاسی اور نظریاتی شاعری کا دوسرا نیم فکری اور نیم رومانی شاعری اور تیسرا قوم پرست شاعروں کا ملا جلا لہجہ پہلے رجحان کے

بارے میں ڈاکٹر ابن کنول کے خیالات دیکھئے۔

''شاید جوش کے اثر سے مجاز نے اس کا آغاز کیا جو بعد میں سردار جعفری مخدوم، کیفی، نیاز حیدر، ظہیر کاشمیری، اور جاں نثار اختر کے یہاں نمایاں ہوا''۔[۱]

ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر تھے اور ترقی پسند شعر میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، ن۔م راشد، تلوک چند محروم، آنند نرائن ملا، فراق گورکھپوری، مجاز ردولوی، جمیل مظہری، وامق جونپوری، مجروح سلطانپوری، مخدوم محی الدین، اختر الایمان، محسن زیدی، اجمل اجملی، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، معین احسن جذبی، غلام ربانی تاباں، وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں، ترقی پسند تحریک کے مقاصد اور نظریات کی تبلیغ میں کربلا کے حوالے نے ایک بنیادی کردار ادا کیا تھا، اور اس کی مدد سے ایسی بہت سی باتیں کہی جاسکی تھیں کہ لوگوں کے دلوں پر قدیم شعری علامتوں سے زیادہ اثر انداز ہوتیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں:

''حق بات یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے انقلابی مفاہیم کیلئے یہ حوالہ جس قدر موثر تھا اتنے بڑے پیمانے پر اس کا ذکر ترقی پسند شاعری میں نہیں ملتا''۔[۲]

چونکہ ترقی پسند ادب میں مظلوم انسانوں، بے کس و بے بس عوام اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی جاتی ہے، اس لئے ان کے یہاں واقعہ کربلا کے اشارے اور اس کی بازگشت تقریباً ہر شاعر کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں اس سانحہ کی جھلک پھر بھی جگہ جگہ موجود ہے، اور ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں اس واقعہ کے واضح یا غیر واضح نقوش دیکھے جاسکتے ہیں، ترقی پسندوں سے قبل اقبال کی شاعری میں ہم یہ گونج سن

۱۔ ترقی پسند ادب کے پچاس سال'' ڈاکٹر ابن کنول، مرتبہ قمر رئیس عاشور کاظمی، صفحہ ۶۲۴

۲۔ ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ'' گوپی چند نارنگ، صفحہ ۴

چکے ہیں۔ ان کے بعد دوسرے ممتاز نظم گو شاعر جوش ملیح آبادی کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔

یوں تو جوشؔ کی شاعری کی ابتداء ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑنے سے بہت پہلے ہو چکی تھی، لیکن وہ اس تحریک سے بہت قریب تھے اور ان کے شاعرانہ نظریات ہر دور میں عوام کے غم والم کا اظہار کرتے رہے ذاتی طور پر وہ واقعہ کربلا اور حضرت امام حسین کی شہادت کو انسانی تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں ہر دور میں ان کے کارناموں کو نسل انسانی کی بقا کے لئے مثالی طور پر پیش کیا گیا۔

یوں تو جوش ملیح آبادی نے ''ذاکر سے خطاب'' اور ''سوگواران حسین سے خطاب'' جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن کا مقصد اصلاحی تھا، لیکن شہادت حسین کی انقلابی معنویت کی طرف اشارے انہوں نے ''رثائی ادب'' کے دائرے میں رہ کر ہی کیے۔ ''شعلہ و شبنم'' میں اس نوعیت کا جتنا کلام ہے اس کے بارے میں جوش نے خود کہا ہے کہ یہ تمام نظمیں ۱۹۲۷ء سے پہلے کی ہیں جوش ان نظموں کو بھلے اہمیت نہ دیتے ہوں لیکن کردار حسینؑ کی انقلابی معنویت کو روشن کرنے میں جوش کی شاعری نے نہایت اہم خدمت انجام دی ہے، جوشؔ کی ایک نظم کا بند یہاں دیا جا رہا ہے

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابن علیؑ ہو

جوش کا ایک اور مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' ۱۹۴۱ء کی تصنیف ہے، اس کے ایک بند کی یہ بیت ہے۔ دیکھئے:

عباسؑ نامور کے لہو سے دھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

یہاں پر حضرت عباسؑ کی وفاداری اور حسینؑ کی قربانی دونوں کی اہمیت کو جوش نے دکھایا ہے۔ اسی طرح ان کے کلام کے کچھ حصے اور بھی یہاں پر ہم اس شعری حوالے کی مثال کے طور پر پیش کریں گے۔

انہوں نے ایک نظم میں ان خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے:

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو
یہ جو مچل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغ ظلم کی تھرّا رہی ہے لو
در پردہ یہ حسینؑ کے انفاس کا ہے رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو
پھر حق ہے آفتاب لب بام اے حسینؑ
پھر بزم آب وگل میں ہے کہرام اے حسینؑ
پھر زندگی ہے ست و سبک گام اے حسینؑ
پھر حریت ہے مورد الزام اے حسینؑ
ذوق فساد و ولولہ و شر لئے ہوئے
پھر عصر نو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتظار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوع بشر دوچار
اے زندگی جلال شہ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسینؑ دے
آئین کشمکش سے ہے دنیا کی زیب و زین
ہر گام ایک بدر ہو ہر سانس اک حنین
سینوں میں بجلیاں ہوں زبانوں میں یا حسینؑ
تم حیدری ہو سینۂ اژدر کو پھاڑ دو
اس خیبر جدید کا در بھی اکھاڑ دو

جوش نے اسی زمانے میں یہ بھی کہا ہے کہ

انسان کو بے دار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

اسی طرح جوش کے ایک سلام کے دو شعر بھی دیئے جا رہے ہیں

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو
اس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزر و مد
دشت بلا میں تھی جو بہتّر کی آرزو

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جوش رثائی ادب کی کلاسیکی روایت سے جو مذہبی مقصد کے لئے مخصوص تھی سیاسی نوعیت کا کام لے رہے تھے۔ جوش نے مرثیے میں انقلاب اور قومی آزادی کے تصور کو رواج دیا، جوش اپنی رومانیت اور بغاوت کی وجہ سے ہر چیز نبھا لے جاتے ہیں، دوسروں کے لئے یہ ناممکن تھا۔ جمیل مظہری نے کوشش کی لیکن ان سے چلا نہیں ان کوششوں کے برعکس اقبالؔ اور محمد علی جوہر نے نظم اور غزل میں کردار حسینؑ کی عظمت کے بلاواسطہ اور بالواسطہ تخلیقی اظہار کی جو راہ دکھائی تھی، اس نے آنے والے شعراء کے لئے ایک شاہراہ کھول دی اور بعد کی اردو شاعری میں اس رجحان کا فروغ دراصل انہیں اثرات کے تحت ہوا۔

ترقی پسند تحریک کی ترغیبات ذہنی میں تصور قومیت و آزادی و انقلاب کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس تحریک کے زیر اثر ان تصورات کو جن شاعروں نے آگے بڑھایا ہے ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی اپنے کلام کی بدولت اردو، ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے یہاں طرز بیان میں بھی ایک خاص ندرت ہے۔ لب ولہجہ میں ایک ایسا تیکھا پن ہے جو کلام میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ کلام میں درد و کسک پیدا کرنے کی کوشش ہر جگہ نمایاں ہے اسی سے ان کے کلام میں للکار اور خطیبانہ خروش بہت کم ہے۔ تشبیہ و استعارے بڑے حسین نظم کرتے ہیں۔ مگر منظر نگاری میں ان کا قلم وہ پرکاری نہیں پیدا کر سکا جو جوش یا علی سردار جعفری کو حاصل ہے۔ البتہ متانت و سنجیدگی سے کلام مالا مال نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ دیکھئے:

یہ شہادت ہے اس انساں کی کہ اب حشر تلک
آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں

یہاں پر احمد ندیم قاسمی نے شہادت حسینؑ کی عظمت کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ حسینؑ کی شہادت نے انسان کے کردار کو وہ بلندی اور معراج بخشی ہے کہ حشر تلک یہ عظمت اپنی

مثال نہ پیش کر سکے گی۔ چونکہ یہ مثال صرف آپ ہے

لب پر شہدا کے تذکرے ہیں
لفظوں کے چراغ جل رہے ہیں
دیکھو! اے ساکنان عالم
یوں کشت حیات سینچتے ہیں

احمد ندیم قاسمی کے بعد اب ہم فیض احمد فیض کے بارے میں چند باتیں تحریر کریں گے، فیض کے انداز بیان میں ایسا تیکھا پن ہے جو اس دور میں کم ہی نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے وہ اختصار و جامعیت ہے۔ نظم میں اختصار اور بیان میں جامعیت محسوسات کو چھو کر نہیں نکل جاتے بلکہ ذہن کو اس طرح چھیڑتے ہوئے جاتے ہیں کہ جیسے تیر نیم کش کسی دل کو جس کا اثر دیر تک باقی رہتا ہے۔ فیض کے یہاں چند نظمیں ایسی بھی ہیں جو اردو ادب میں اضافہ معلوم پڑتی ہیں۔ انہوں نے دلکش انداز میں الفاظ کے خوبصورت دام میں خیالات کو پیش کیا ہے۔ تاریخی شعور اور نفسی الجھنوں کو شاعرانہ انداز میں سمو کر شعر بنا دیا ہے۔ اشارے صاف اور مفہوم اتنا واضح ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں۔ فیض نے یوں ایک مرثیہ بھی لکھا ہے (رات آئی ہے شبیر پہ یلغار بلا ہے) ان کے یہاں اس مرکزی حوالے کا اثر نظموں میں بالخصوص ملتا ہے۔ غزلوں میں یہ حوالہ نہ ہونے کے برابر ہے ذیل کے اشعار میں مقتل، جاں، حساب چکانا، شان سلامت رہنا یہ تمام استعارے اسی تاریخی حوالے سے وابستہ ہیں لیکن چونکہ آج کے دور کے انسان کا درد اس میں پر دیا گیا ہے۔ اس لئے اسے ترقی پسند شاعری کہا جا سکتا ہے۔ فیض کہتے ہیں:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا
وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے
اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

مرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

فیض کے کلیات نسخہ ہائے وفا میں مرے دل میرے مسافر کے بعد کا کلام ''غبار ایام'' کے تحت درج ہے۔ اس میں ایک تازہ نظم ہے ''ایک نغمہ کربلائے بیروت کیلئے'' جس میں ان مظالم کا بیان ہے جو اسرائیلی درندوں کے طرف سے فلسطینی مجاہدین پر ڈھائے گئے۔ لیکن اس سلسلے میں فیض کی نظم جو دست تہ سنگ میں ہے ''شورش زنجیر بسم اللہ'' ہے۔ یہ نظم لاہور جیل میں لکھی گئی تھی۔ اس کی فضا بندی میں پرشش دربار، دریدہ دامنی اور کہرام دار و گیر کی صدیوں پرانی روایت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:۔ شورش زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرام دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورش زنجیر بسم اللہ

در زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں درد دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ
گنو سب داغ دل کے حسرتیں شوقیں نگاہوں کی

سر دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمار نالۂ شبیر بسم اللہ
ستم کی داستاں کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیر لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مصر ہے محتسب راز شہیدان وفا کہیے
لگی ہے حرف ناگفتہ پہ اب تعزیر بسم اللہ
سر مقتل چلو بے زحمت تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ

دست تہ سنگ کی ایک اور نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' بھی اسی نوعیت کی ہے۔ ان دونوں نظموں کا زمانہ تقریباً ایک ہے یعنی دونوں لاہور جیل میں کہی گئیں پہلی جنوری ۱۹۵۹ء میں کہی گئی اور دوسری فروری ۱۹۵۹ء کی یادگار ہے۔ امیجری کے فرق کے ساتھ دونوں جگہ بنیادی کیفیت بے گناہی اور حق کے لئے قربانی ہے۔

چشم نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

اسی ترقی پسند گروہ سے تعلق رکھنے والے شعراء میں مخدوم محی الدین کی شاعری کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

مخدوم محی الدین کم گو تھے لیکن ان کی شاعری گہرے تخلیقی رچاؤ شائستہ اظہار اور حسن کاری کا امتیازی نشان رکھتی ہے۔ مخدوم کے یہاں یہ تاریخی حوالہ سب سے قبل ان کی نظم ''تلنگانہ'' کے اس بند میں دیکھئے:

امام تشنہ لباں خضر راہ آب حیات
اندھری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
مرا ثبات مری کائنات میری حیات
سلام مہر بغاوت سلام ماہ نجات

اس کے بعد اس نظم کے ایک شعر میں یہ حوالہ دیکھئے یہ نظم انہوں نے ''مارٹن لوتھر کنگ'' کے قتل پر کہی تھی

یہ شام شام غریباں ہے صبح صبح حنین
یہ قتل قتل مسیحا یہ قتل قتل حسین

لیکن اس تاریخی حوالے کا بھرپور تخلیقی اظہار اس نظم میں ہوا ہے۔ جس کا عنوان ''چپ نہ رہو'' جو کہ لوممبا کے قتل پر لکھی گئی ہے دیکھئے:

شب کی تاریکی میں ایک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح

آدمیت کا ضمیر

پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سناٹے میں پھر خون کے دریا چمکے
صبح دم جب مرے دروازے سے گذری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خون سحر گذری ہے
جب تلک دہر میں قاتل کا نشان باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشن شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو

یہ کیفیت غزل کے اشعار میں بھی ملتی ہے۔ آنسو سرِ چشم وفا، دشت، جذبہ عشق، آبلہ، دل کی محراب میں سرِ شام شمعِ وفا کا جلنا اور صبح دم ماتم اربابِ وفا کس کی یاد دلاتے ہیں دیکھئے یہ اشعار

اب کہاں جا کے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے
ایک آنسو جو سرِ چشم وفا ہوتا ہے
اس گذرگاہ میں اس دشت میں اے جذبہ عشق
جز ترے کون یہاں آبلہ پا ہوتا ہے
دل کی محراب میں اک شمع جلی تھی سرِ شام
صبح دم ماتم اربابِ وفا ہوتا ہے

علی سردار جعفری کا معاملہ مخدوم سے مختلف ہے، وہ خاصے پر آہنگ اور پر گو شاعر ہیں

اور ان کے موضوعات میں تنوع بھی زیادہ ہے مخدوم جس طرح اپنے رمزیہ انداز بیان اور جمالیاتی رچاؤ سے فیض کی یاد دلاتے ہیں۔ سردار اپنے زور بیان اور جوش خطابت سے جوش کی یاد دلاتے ہیں۔ علی سردار جعفری کے لئے کمال احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب میں فرمایا ہے کہ

''سردار جعفری نے شاعری کی ابتداء مرثیوں سے کی تھی، انیس اور اقبال کا اثر ان پر اتنا گہرا تھا کہ ۱۹۴۷ء تک وہ خود کو غزل کی گرفت سے باہر نہ نکال سکے۔ آج بھی ان کے یہاں تغزل رچا بسا ہے، صرف آزادی سے کچھ پہلے اور کچھ برسوں بعد تک انہوں نے شعوری طور پر آزاد نظم کو چھوا حالانکہ انہوں نے پہلے آزاد نظم کو شاعری ماننے ہی سے انکار کر دیا تھا، انقلابی تحریک میں لکھنا زیادہ تھا اور فنی نفاستوں اور نزاکتوں کے لئے وقت کم اور پھر آزاد نظم اب اتنی منجھ چکی تھی کہ اور شاعری کی حیثیت سے قابل قبول تھی، اس لئے سردار نے اس فارم کو بھی استعمال کیا اس فارم نے انہیں خطابت کی شاعری کے لئے وہ آزادی دی جس سے صرف ن، م، راشد نے فائدہ اٹھایا تھا نئی دنیا کو سلام میں سردار نے نظم آزاد کا بہت اچھا استعمال کیا ہے۔''[1]

ان پر انیس کا تحت الشعوری اثر موجود ہے۔ دیکھئے ان کے یہاں جوش بیان ہے۔ انہوں نے اپنے مجموعوں تک کے نام میں خون اور لہو کا استعمال کیا ہے۔ (خون کی لکیر، لہو پکارتا ہے) سردار جعفری کی امیجری واضح طور پر لہو رنگ ہے۔ یہ شہادت عظمیٰ کے تخلیقی فیضان کی روایت کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کی شہادت گاہ میں ہو جو اپنے لہو سے سرخ کفن
ہے چاک جگر کی شرط یہاں یہ حلقۂ دل افگاراں ہے

---

[1] ''ترقی پسند ادب'' پروفیسر قمر رئیس عاشور کاظمی، ص ۷۹۴، مضمون کمال احمد صدیقی

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
ایک سیل روان درد حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں
ہر گام پہ خون کے طوفاں ہیں ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں
ہر لحظہ ہے قتل عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

یہ ظلم و جبر بھی اک پیاس ہے جو صدیوں سے
بجھائی جاتی ہے انساں کے خون ناحق سے
کوئی حسین ہو کوئی مسیح یا سقراط
لہو کی پیاس انہیں ڈھونڈھتی ہی رہتی ہے
زباں نکالے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے

تمام صحن چمن مقتل تمنا ہے
کفن لہو کا ملا ذوق جستجو کے لئے

اس سلسلے میں سردار جعفری کی نظم ''قتل آفتاب'' اور ''یہ لہو'' کا ذکر بھی آئے گا جو بے حد اہم ہیں قتل آفتاب کے یہ بند دیکھئے:

شفق کے رنگ میں ہے قتل آفتاب کا رنگ
افق کے دل میں ہے خنجر لہو لہان ہے شام
سفید شیشہ نور اور سیاہ بارش رنگ
زمیں سے تابہ فلک ہے بلند رات کا نام

یقیں کا ذکر ہی کیا ہے کہ اب گماں بھی نہیں
مقام درد نہیں منزل فغاں بھی نہیں
وہ بے حسی ہے کہ جو قابل بیاں بھی نہیں
کوئی ترنگ ہی باقی رہی نہ کوئی امنگ
جبین شوق نہیں سنگ آستاں بھی نہیں

رقیب جیت گئے ختم ہو چکی ہے جنگ
دلوں میں شعلہ غم بجھ گیا ہے کیا کیجئے
سوائے اس کے کہ قاتل ہی کو دعا دیجئے

ذیل کی نظم کا بنیادی مرکز حوالہ کربلا ہے، اور بہت معنی خیز ہے۔ روایت یہ ہے کہ امام حسینؑ، علی اصغر، کو اپنے ہاتھوں پر بلند کرتے ہیں اور دشمن کو مخاطب کرتے ہیں کہ یہ معصوم پیاس سے جاں بلب ہے اگر اسے پانی پلا دو تو اس کی جان بچ جائے گی، یہ منظر پتھر دلوں کو بھی پانی کر گیا، اور لوگوں میں انتشار سا پیدا ہونے لگا یہ دیکھ کر عمر بن سعد کے اشارے پر حرملہ نے ایسا تاک کر سہ پہلو تیر مارا کہ بچے کی گردن اور باپ کا بازو دونوں چھلنی ہو گئے۔ علی اصغر کی گردن سے بہنے والے خون پر زمین لرز گئی اور صدا آئی کہ اگر خون اصغر مجھ پر گرا تو قیامت تک اناج کا ایک دانہ نہ اگے گا آسمان کی سمت امام نے اچھالنا چاہا تو آسمان پکارا کہ اصغر کا خون ناحق اگر میری طرف پھینکا تو کبھی قطرہ رحمت نہ برسے گا۔ مجبوراً امام حسینؑ نے وہ خون ناحق اپنے چہرے پر مل لیا اب یہ امیجری دیکھئے شاعر اس خیال کو کس طرح لفظ و معنی کے ساتھ شعروں میں پروتا ہے

اس لہو کا کیا کرو گے
گرم و سرخ و نوجواں
خاک پر ٹپکے گا تو جل جائے گی دھرتی کی کوکھ
آسماں سے قطرۂ رحمت نہ برسے گا کبھی
کوئی دانا پھر نہ اُبجے گا کبھی
کوئی کونپل مسکرائے گی نہ پھر مہکے گا پھول

یہ لہو ہونٹوں کی خوشبو، یہ لہو نظروں کا نور
یہ لہو عارض کی رنگت، یہ لہو دل کا سرور
آفتاب کوہ فاراں، جلوہ سینا و طور
شعلہ حرف صداقت، سوز جان ناصبور
کلمہ حق کا اجالا یہ تجلی کا ظہور
یہ لہو میرا لہو تیرا لہو سب کا لہو

اس واقعہ سے متعلق علی سردار جعفری کے یہ دو قطعات بھی زیر نظر ہیں

درد دریا ہے ایک بہتا ہوا
جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں
وہی تلوار اور وہی مقتل
صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

یہ اسی طرح کا یہ دوسرا قطعہ بھی دست صبا اور پیراہن گل سے ہو کر بسمل کے گلو اور

شہیدوں کے گلو تک پہنچتا ہے۔

ہر ایک خوشی درد کے دامن میں پلی ہے
نسبت ہے ہر اک نغمے کو بسمل کے گلو سے
پیراہن گل دست صبا پنجہ گل چیں
رنگین ہے ہر چیز شہیدوں کے لہو سے

ترقی پسند شعراء نے اس طرح اپنی بات کہی کہ جلد ہی خون ناحق کرنے والے بھی تھر تھرا گئے۔ اور ظلم سہنے والوں نے بھی اس طرح سوچنا شروع کر دیا کہ ہم بھی مخالفت کا حق رکھتے ہیں ہم بھی انسان ہیں، اس طرح ترقی پسندوں نے سماج کو بے دار کر کے اس نیند کو توڑ دیا جس میں صدیوں سے وہ سو رہا تھا یہ بے حسی ایسی طاری تھی کہ گرفتار بلا خود کو گرفتار دیکھ کر قسمت کا لکھا تصور کرتے تھے۔ اور ظلم کرنے والے حق سمجھ کر ظلم کرتے تھے ان شعروں اور تقریروں نے زلزلہ کا کام کیا، سماج چونک پڑا، اسی ضمن میں ہم علی سردار جعفری کی ایک نظم پیش کرنا چاہتے ہیں جس کا عنوان ''کربلا'' ہے۔

پھر العطش کی ہے صدا
جیسے رجز کا زمزمہ
پھر ریگ صحرا پر رواں
ہے اہل دل کا کارواں
نہر فرات آتش بجاں
راوی و گنگا خونچکاں
کوئی یزید وقت ہو
یا شمر ہو یا حرملہ

اس کو خبر شاید نہ ہو

روز حساب آنے کو ہے

نزدیک ہے روز جزا

اے کربلا اے کربلا

گونگی نہیں اب یہ زمیں

گونگا نہیں یہ آسماں

گونگے نہیں حرف و زباں

گونگی اگر ہو مصلحت

زخموں کو ملتی ہے زباں

وہ خوں جو رزق خاک تھا

تابندہ و پایندہ ہے

صدیوں کی سفاکی سہی

انسان اب بھی زندہ ہے

زندہ ہے اعجاز فغاں

ہر ذرہ پامال میں

دل کے دھڑکنے کی صدا

اے کربلا اے کربلا

ترقی پسندوں نے اس اظہار کو شعوری طور پر جابجا استعمال کیا ہے اس سے قبل کے شعراء نے کہیں واضح یا کہیں غیر واضح طور پر اسی استعارے کو اظہار کا راستہ بنایا ہے۔

ترقی پسند شعراء میں جاں نثار اختر کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی ایک نظم میں

یہ عناصر آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

دنیا کو درس جہد ویقیں دے رہا ہوں میں
نام حسین ابن علی لے رہا ہوں میں
جو حق پہ زندگی کو لٹانا سکھا گیا
اپنے لہو سے پھول کھلانا سکھا گیا
جو جذب عشق روح میں تحلیل کرگیا
اپنے عمل سے دین کی تکمیل کرگیا
آواز دے رہی ہے شہادت حسینؑ کی
دنیا کو آج بھی ہے ضرورت حسینؑ کی

یہاں پر شاعر کا دل یہ آواز دے رہا ہے کہ اس دور ظلم و بربریت میں اور یزیدوں کے سماج میں جہاں صرف باطل کے اندھیرے ہیں ایک ایسے انسان کی ضرورت ہے جو حسینؑ کی طرح ہر ظلم و جبر کے خلاف حق کے لئے جنگ کرنے پر تیار ہو جائے اور یہ صرف کسی ایک شخص کی بات نہیں بلکہ قوم و ملک کو ہر فرد میں وہی جذبہ چاہئے جو ملک کو استحصال اور ظلم کے ہاتھوں سے آزاد کرا سکے۔ ترقی پسند شاعروں نے کربلا کے واقعات کو اپنے نظریات کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا۔ مگر ان میں بیش تر کے یہاں یہ واقعہ بھرپور توانائی کے ساتھ نہیں آسکا ہے۔ البتہ چند نظمیں اور کچھ اشعار اس موضوع پر ترقی پسند شاعروں کے یہاں آب و تاب کے ساتھ بھی نظر آتے ہیں۔

شاعری کے سلسلے میں جاں نثار اختر کا بھی اپنا ایک الگ نظریہ ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ''عوام ہر اس ادب کو رد کر دیتے ہیں جو سیاسی سوجھ بوجھ تو دے مگر جمالیاتی جذبے کو تسکین نہ بخشے۔ اسی نظریہ کی تائید میں کہتے ہیں

فکر معاش و حکمت دنیا کے باوجود
ہم کو عزیز عشق کا دیوانہ پن بھی ہے

جاں نثار اختر شاعری میں ذاتی تجربات کا گہرا مشاہدہ بیان کرتے ہیں انہوں نے شاعری میں کہیں یاوہ گوئی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ ان کے ساتھ گذری وہ بیان کرتے ہیں اور حقائق کا ذکر کرتے ہیں لیکن انداز بیان میں کہیں کہیں تلمیحات واستعارے کے طور پر کربلا کے تاریخی حوالے کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً

زندگی دیکھ مجھے عزم سفر دیتی ہے
ایک دل شعلہ بہ جاں ساتھ لئے جاتا ہوں
ہر قدم تو نے کبھی عزم جواں بخشا تھا
میں وہی عزم جواں ساتھ لئے جاتا ہوں

اور کہیں پر وہ رنگین باتیں شاعری میں دہراتے ہیں ساتھ ساتھ یہ حوالے بھی دیتے رہتے ہیں عجب انداز ہے ان کا ایک مصرع رنگین ہے تو دوسرا مصرع تلوار، تیغ، پسر، خون، ذوق سفر وغیرہ جیسے لفظوں سے سجا رہتا ہے:

مجھ کو اکثر ترے پہلو میں خیال آتا ہے
تو کہیں مجھ سے مرا ذوق سفر چھین نہ لے
یہ تری نرم لپٹتی ہوئی بانہوں کا گذار
میرے ہاتھوں سے کہیں تیغ و سپر چھین نہ لے

انہوں نے غزل کو ایک نیا ذہن اور نئی سوچ عطا کی ہے، اور یہ بات ثابت ہے کہ روایت کا مفہوم فنی اعتبار کے ساتھ زبان کا رکھ رکھاؤ ہے، ورنہ کہاں جاں نثار اختر اور کہاں پاس روایت ہے

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے

ہم کو گذری ہوئی صدیاں تو نہ پہنچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے
ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے

ہندوستان میں آزادی کے بعد بھی فرقہ واریت کا زہر پھیلتا رہا اور اب بھی اسی کے جال میں ہی پھنسا ہے۔

اور شاید ہی کبھی آزاد ہو سکے انسان انسان کے خون سے ہولی کھیلتا ہے اور اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو کوئی تیار نہیں ہے، تو یہاں پر شاعر کا بے دار ذہن اسے ایک سوال کی شکل پوچھتا ہے کہ

کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

زندگی تنہا سفر کی رات ہے
اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے

میں زندگی میں بہت دور تک چلا آیا
کسی کے غم نے بڑا آسرا دیا ہے مجھے

جنون شہر نوردی نے کیا دیا ہے مجھے
بس اپنی آنکھ سے سب کچھ دکھا دیا ہے مجھے

ایک ہے زمین تو سمت کیا حدود کیا
روشنی جہاں بھی ہو روشنی کا ساتھ دو

کیا بتوں کا واسطہ کیا خدا کا واسطہ
آدمی کے واسطے آدمی کا ساتھ دو

بہر حال وہ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہی تھے لیکن شروع کے اشعار ہلکے ہلکے اشارے لئے ہیں اور اب عصری حسیت کے آفاقی شاعر وامق جونپوری صاحب کی شاعری میں اس پرتو کو تلاش کرنا ہے۔

وامق جونپوری نے نہ صرف یہ کہ غزلیں کہی ہیں بلکہ نظم کے بھی بہت اچھے شاعر ہیں ان کی دو کتابیں ''جہاں نما'' اور ''سفر نا تمام'' بہت ہی مکمل اور معقول ہیں۔ وامق جونپوری نے ذوق کی تشنگی اور ان کے وجدان نے دونوں نظموں کے آخر میں بغیر غزل کہے نظم تمام کرنے کی

ان کو اجازت ہی نہیں دی۔

لیکن وامق جونپوری مشہور ترقی پسند شاعر ہیں، تحریک امن عالم سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ اسی مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے خود کو وقف بھی کر دیا ہے۔ ان کا مزاج فطری طور پر ہی ترقی پسند معلوم ہوتا ہے بغاوت ان کے لہجے میں ہی ملی ہوئی ہے، ان کے جذبات و خیالات کا تیز دھارا اپنا راستہ خود معین کرتا ہے۔

زندگی موت سے لڑتی ہی چلی جائے گی
سینہ دار پہ چڑھتی ہی چلی جائے گی

وامق عصری حسیت کو اپنے احساسات و تجربات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ایک آفاقی جذبے کی تشکیل کر کے اسی جذبے کے تحت شعر کہتے ہیں:

اس دور ترقی کا ایک معجزہ یہ بھی ہے
مجرم نظر آتے ہیں جب کام نہیں ہوتا

وہ ایک شب تھی کٹ گئی جو انتظار صبح میں
مگر وہ صبح جب سے نیند آج تک حرام ہے

وامق کی تلخ نوائی سے ذہن سوچتا ہے کہ آخر ان کے افکار میں اتنا زہر کیسے گھل گیا ہے:

بانکپن اپنا سلامت ہے تو ہم تشنہ لباں
دست بے آب میں کر لیتے ہیں چھاگل پیدا

وامق صاحب کی ''سفر ناتمام'' شعری مجموعہ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا جسے مرتب کیا ہے غلام رضوی گردش نے اس میں بہت سے اشعار ہمارے تاریخی حوالے ''کربلا'' سے ہی فیض یاب ہوئے ہیں اور مقتل وقاتل صبر ورضا حق وباطل ان کے یہاں جا بجا ملتے ہیں۔

کوئی اسیروں کو پہچان لے نہ خوشبو سے
بس اک ردا کے لئے چھن گئیں ردائیں سب

جہاں تشنگی میں حیات ہے جہاں تلخ جام فرات ہے
جہاں پیاس میں کوئی بات ہے وہاں ذکر تشنہ لباں چلے

جو تخت و تاج سے جیتا ہو اس کو مردہ کہو
وہ سر جو نیزے پہ بولے اسے امر جانو

چاہنے والوں نے مہلت نہ فغاں سے پائی
دعوت دربدری کوئے بتاں سے پائی
زبان کٹ چکی جاری قتال ہے پھر بھی
وجود اپنا خود اپنی مثال ہے پھر بھی

اور جب جبر واستبداد کی آہنی دیواریں ان مقتلوں اور مقتولوں کے چہروں اور متجس نگاہوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں تو ایک طریقہ جسے وامق اکثر استعمال کرتے ہیں، اپنی شاعرانہ اظہار میں وہ اسے یوں بیان کرتے ہیں:

جو آب تیغ کو مہمل بنادے موت وہ ہے
جھٹک دے جام غلامی کو تشنگی جیسے

کہیں پر وہ انسان کی محرومیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ

ہے جس کی ٹھوکروں میں آب زندگی واحق
وہ تشنگی کا سمندر دکھائی دیتا ہے

تیغ پر قبضہ بندگی تہ تیغ
سرکشی اور سروری کا فرق

لاکھ مقتل کی فصیلیں ہوں بلند
خون ناحق کا چھپانا مشکل

جسم بے سر لئے جب ہم سر محشر نکلے
سرنگوں شرم سے قدموں کے پیمبر نکلے

ترقی پسند شعراء میں بہت اہم نام کیفی اعظمی کے یہاں بھی یہ استعارہ قابل غور بھی ہے اور توجہ طلب بھی

صحرا صحرا لہو کے خیمے
پھر پیاسے لب فرات آئے

معاشرے کی کشمکش غریبوں کی بے کسی اور ظالم و سرمایہ داروں کے ظلم کا صاف طور پر اپنے کلام میں کیفی نے اظہار کیا ہے اور بغاوت کا درس دیا ہے، یہاں پر ان کی نظم کا ایک بند تحریر ہے جس میں انہوں نے بنی نوع انسان کی طرف سے لینن کا شکریہ ادا کیا ہے، جس نے مزدوروں کو اوپر اٹھانے کا جذبہ دلوں میں پیدا کیا اور پس ماندہ طبقات کی ترقی کے لئے جدو جہد کی۔

آسماں اور بھی اوپر کو اٹھا جاتا ہے
تم نے سو سال میں انساں کو کیا کتنا بلند
پشت پر باندھ دیا تھا جنہیں جلاّدوں نے
پھینکتے ہیں وہی ہاتھ آج ستاروں پہ کمند

اب ان سطروں میں ''انسانیت کو بلندی عطا کرنا'' اور ''پشت پر ہاتھوں کو باندھ دیا جانا'' یہ سب واقعہ کربلا کے استعارے ہیں۔ ان کی شاعری نے موضوع اور فکری تہ داری کی وجہ سے خواص اور عوام دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے یہاں جذباتیت اور غنائیت کے سبب دل کے ساز پر زندگی کا نغمہ سنائی دیتا ہے۔

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

اب یہاں پر تیغ اور قتل سانحہ کربلا کے ہی شعری استعارے ہیں اور شاعر نے ان سے بخوبی استفادہ کیا ہے۔ اور اپنی بات وہ اس طرح بھی کہتے ہیں:

میں کبھی گھاؤ سینے کے گنتا نہیں
جاں رہے نہ رہے کوئی چنتا نہیں

خون کتنا بہا دیکھ لوں گا کبھی
پہلے فرعون کو غرق دریا کروں

یہاں پر انہوں نے فرعون کو سرمایہ داری، حق تلفی نا انصافی، ظلم و زیادتی اور جبر و استحصال کی علامت قرار دیا ہے اور اسے مٹا دینے کی بات کی ہے

کیفی اعظمی کے مجموعے اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ''جھنکار'' اور ''آخر شب'' اور ''آوارہ سجدے''۔ انہوں نے جذبات اور مواد کی اہمیت کے ساتھ ہی ہیئت اور اسلوب پر بھی زور دیا ہے اور نظریات کی رو میں بہتے ہوئے بھی شعر کے جمالیاتی عناصر سے چشم پوشی نہیں کی ہے یہ اور بات ہے کہ اپنی نظموں میں جا بجا اپنا شاعرانہ مسلک بھی بتاتے چلیں ہیں جسے بعض ناقدین نے بھونڈی نعرے بازی کا نام دیا ہے

فضا میں سرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغ عمل جلائے ہوئے

حق تلفی ناانصافی ظلم و زیادتی نابرابری اور استحصال کے خلاف اس سرخ جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں لے کر چلنے والوں نے قید و بند اور بھوک و پیاس کی صعوبتیں برداشت کی ہیں وہ ہوا کی زد پر چراغ جلانے ہی کے مترادف ہے۔ اور یہ تمام حالات ہمارے تاریخی حوالے کے پس منظر میں اسی طرح قربانیوں اور استقامت کی مثال اور اسی لئے ان کے یہ اشعار ہمیں اسی پس منظر میں لے جاتے ہیں کیفی اعظمی کو یقین ہے کہ سرمایہ داری کا طلسم پھر بہت جلد ٹوٹ کر رہے گا وہ کہتے ہیں

زنجیر پا و طوق گلو ٹوٹتے رہے
زندان رنج و غم سے بشر چھوٹتے رہے

جو بھی شب آئی ظلم و ستم کی گذر گئی
انسان فتح مند ہوا موت مر گئی

کیفی اعظمی اس سرمایہ دارانہ نظام کے موجد کو غرق دریا کرنے کے لئے خود بھی عزم لے کر اٹھے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہیں وہ بنیادی حوالہ ان کو راستہ دکھانے کے لئے مشکل بن جاتا ہے، جیسے امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے میدان میں جس طرح قربانیاں پیش کیں وہ سب مثالیں وہ اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ کیفی اعظمی کی اپنی نظمیں توہم پرستی ضعیف الاعتقادی، خام خیالی، تنگ نظری، خوش فہمی اور جھوٹی ترقی پسندی پر ایک طنز ہے۔

کیفی اعظمی کا ایک سلام "گل دستہ سلام" (مرتبہ ڈاکٹر سید علی امام زیدی گوہر لکھنوی نبیرہ میر انیس) میں حاصل ہے۔ سلام میں ندرت قابل غور ہے۔

سلام

سوکھے گلوں پہ چلتا ہے خنجر الگ الگ
مارے گئے حسین کے یاور الگ الگ
چھینی گئی سروں سے جو چادر الگ الگ
سیدانیاں کھڑی ہیں کھلے سر الگ الگ
فطرس کو پرتو حر کو جناں بخش دی حسینؑ
دونوں کا تم نے بدلا مقدر الگ الگ

سلام کے ان اشعار کے بعد کیفی اعظمی کے غیر مطبوعہ سلاموں کے مجموعے، ''منارہ ہدایت'' سے کچھ حصے یہاں پر تحریر کئے جا رہے ہیں جو نظم کے انداز میں کہے گئے ہیں۔ ''حسینؑ کا عزم'' سے آخری حصہ لیا گیا ہے

پھر سنبھل بیٹھی ہے قدرت پھر مشیت گرم ہے
پھر ہے ہستی کو حسینی جاہ و لشکر کی تلاش
پھر جوانی کھولنے کو ہے نشان حریت
پھر ہوئی ہے دوش عباس دلاور کی تلاش
پھر حمیت جاگ اٹھی پھر ہے غیرت گرم کار
پھر ہوئی ہے زندگی کو جوش اکبر کی تلاش
پھر صدا دیتی ہے قاسم کو زمیں جنگاہ کی
پھر ہوئی ہے رزم گہہ کو عون و جعفر کی تلاش
پھر فضائے گرم میں پھنکارتا ہے انقلاب
پھر جہاں کو ہے شباب برق پرور کی تلاش
دیکھنا کیفی نشان حریت لہرائے گا
جب جہاں کو عزم شاہ کربلا مل جائے گا

کیفی اعظمی کی ایک اور نظم اسی انداز کی ہے جس کا عنوان ہے ''حسینؑ کی آخری نماز'' اس میں سے کچھ حصے تحریر کئے جا رہے ہیں:

خم کمر بازو شکستہ قلب و سینہ چور چور
فوج کی یلغار، شدت پیاس کی غم کا وفور

سامنے بے جاں بھتیجے، بھانجے، بھائی پسر
خاک پر بکھرے ہوئے تسبیح زہرا کے گہر
چھاؤں میں تیغوں کی اک سونہر بل کھاتی ہوئی
اک طرف پیاسوں کے رونے کی صدا آتی ہوئی
سر پہ تیغ خونچکاں سجدے میں خم فرق نیاز
ہم ہیں کیفی کیا نہ بھولے گا خدا بھی یہ نماز

ان اشعار میں عقیدت کی شدت سے زیادہ مقصدیت کی اہمیت کو واضح شکل دی گئی ہے، اسی طرح ''حسین کی کامیابی'' کے عنوان سے ان کے سہ مصرع اشعار درج ذیل ہیں:

حسین کی کام یابی

حسین فاتح لیل و نہار بن کے رہا
حسین زیست کا اک شاہکار بن رہا
حسین آئینہ کردگار بن کے رہا

حسین بے کس و مظلوم و بے دیار سہی
غریب و مفلس و غمدیدہ و نزار سہی
مگر وہ معنی عز و وقار بن کے رہا

اب ہم ایک اور اہم شاعر کا ذکر کریں گے اور یہ شاعر ہیں مجاز لکھنوی۔ مجاز لکھنوی کے لئے کمال احمد صاحب فرماتے ہیں

مجاز ہمارے پہلے ترقی پسند شاعر ہیں جو شعوری طور پر ترقی پسند نظریات کے

پہلے علمبردار تھے اس وقت جب انقلاب اور سماجی انقلاب کی ہوائیں آندھی نہیں بنی تھی۔ ''

اور انجمن وجود میں نہیں آئی تھی

مجاز کے شعر جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں یہاں پر دیئے جا رہے ہیں۔

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ایک شعر

مقام گرمی آہ و فغاں بنا تو لیا
غم نہاں کو ترے حرز جاں بنا تو لیا

ان دو شعروں میں جو بنیادی حوالہ موجود اور متحرک نظر آتا ہے، اسے کوئی بھی ذی شعور فوراً تاڑ لے گا۔ مجاز کی نظم کا ایک شعر جو مجاہدین عرب سے خطاب کر کے کہی گئی ہے، یہاں پر دیا جا رہا ہے۔

پھر شہادت گہ الفت پہ قدم اپنے جما
دین و ایمان سے رنگین بنا اپنا بدن

مجاز مجموعہ کلام ''رنگ مجاز'' (جسے مرتب کیا ہے حکیم اعجاز محمد خاں نے) میں یہ اشعار اپنی پوری توانائی کے ساتھ نظر آتے ہیں

معرکہ جب حق و باطل کا کہیں ہوتا ہے
قلب میں مومن جاں باز کے ہوتی ہے چبھن

اسی طرح مجاز نے اپنی نظم ''اے ارض فلسطین'' میں بھی اس تاریخی حوالے کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ نظم کے ان بندوں کو سمجھیں تو کربلا ہر جگہ واضح شکل میں جلوہ گر ہے

اے ارض فلسطین

تاریخ ترے نام سے صدیوں سے ہے روشن
آباد مسلمانوں نے رکھا ترا گلشن
تو قبضۂ اغیار میں ہے یہ ہوئی الجھن
تر خون شہیداں سے ہوا ہے تیرا دامن
اے ارض فلسطین

پھر اہل وفا کو تو شہادت کی دے آواز
سر لے کے ہتھیلی پہ نکل آئیں یہ جاں باز
پھر حیدر و حمزہ کا سا دکھلائیں یہ اعجاز
مٹ کر یہ ترے نام پہ ہوجائیں سرفراز
اے ارض فلسطین

ہوجائے جو مومن کی خودی صورت فولاد
گھبرا کے سپر ڈالیں یہودی ستم ایجاد
پھر ہاتھ میں لے کر یہ انھیں تیغ خوں آشام
مرنا ہی ہے تجھ پر تو نہ سوچیں کوئی انجام
اے ارض فلسطین

یہاں پر مجاز نظم کے ان اشعار میں جو الفاظ استعمال کر رہے ہیں وہ سب ایک حوالہ ہیں بلکہ نظم صاف اور شعوری طور پر کربلا کی بازگشت بن گئی ہے اور کربلا کے عظیم کرداروں کا بھی ذکر انہوں نے کیا ہے ایک اور نظم ہے ''داستان اخوان المسلمین'' (مصر) سے متاثر ہو کر اس کا یہ بند دیا جا رہا ہے جس میں دار اور نعرہ خوں کا قطرہ، اللہ سے پیمان وفا یہ تمام شعری استعارے

تاریخی حوالے سے منسلک ہیں

کر کے آئے تھے یہ اللہ سے پیمان وفا
حق توحید ادا کر گئے یہ مرد خدا
دار پر نعرہ حق ان کی زباں سے نکلا
خوں کے ہر قطرہ نے دی ان کی صداقت کی صدا

مجاز کے کلام پر نظر ڈالنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ اسی عہد کے ایک اور عظیم شاعر فراق کا بھی ذکر کیا جائے۔ فراق کہتے ہیں

رکی رکی سی شب مرگ ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

فراقؔ، کیفیؔ، جاں نثار اخترؔ، مجازؔ، مخدوم محی الدین اور فیض احمد فیضؔ، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے اپنی نظموں اور غزلوں سے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی ترجمانی کی ہے۔ فراق کا لہجہ منفرد تھا۔ وہ روایت کے پاسدار بھی ہیں اور ترقی پسندوں کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی بھی کوشش کرتے ہیں لیکن غزل کی غنائیت ان کے کلام میں عموماً حاوی ہی رہتی ہے۔

آج بھی آگ دبی ہے دل انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے

ان اشعار میں غزل ہر جگہ روایتی پاسداریوں کا ساتھ نبھاتی نظر آتی ہے بس ہلکے ہلکے اشارے ہی یہاں پر ہیں جن میں چند استعارے ہمیں اپنے موضوع کی طرف لے جاتے ہیں

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی حیات کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

یوں تو فراق اس شعر میں عہد نو کی خواہش کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ خون چاہے کتنا بہایا جائے ظالم اسے پانی سمجھتا ہے، لیکن ہمیں خون بہانا منظور ہے چونکہ زندگی کے چہرے پر ہم آب و تاب دیکھنا چاہتے ہیں اور کچھ اشعار اور بھی اسی طرح کے ہیں

اب فراق اور کیا ہوگا زیست کا ماتم
زندگی کی حالت پر موت ہاتھ ملتی ہے

اگر ہے زندگی تو ماتم ماضی بھی کریں گے
جو مرتا ہے یہ دور زندگی مرجائے اچھا ہے

اس شہادت گہہ ہستی میں جو ڈر ڈر کے جیے
زندگی دور رہی موت بھی پلّے نہ پڑے

قدروں نے جھک کے سلام کیا چوما قدموں کو فضاؤں نے

اطراف قضا و قدر میں آ نکلا تھا عشق بے بس

ان تمام شعروں میں فراق نے غزل کے حسن کو برقرار رکھتے ہوئے اس تاریخی حوالے سے فیض حاصل کیا ہے۔ دراصل یہ سب اپنے سماج سے بغاوت کرنے والے لوگ تھے۔ انہوں نے شاعری کے ذریعہ لوگوں کے دل و دماغ بدلنے کی بھرپور و کامیاب کوشش کی ہے۔ ان شعراء نے ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ ان کی شاعری اس بات کی آئینہ دار ہے ان شاعروں نے سماج کے وہ کونے روشن کرنے کی کوشش کی ہے جہاں مدتوں تک اندھیرا ہی پھیلا رہا ہے۔ اور دبے و کچلے ہوئے لوگ اس اندھیرے میں گھٹ گھٹ کر جیتے رہے۔ اور سماج جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کرتا رہا جب دانشوروں نے اس پہلو پر روشنی ڈالی تو لوگوں کا دھیان اس طرف گیا اور اس کام میں ان کو سانحہ کربلا کے تمام کرداروں و استعاروں کی مدد خوب لینی پڑی ہے یہاں پر ہم مجروح سلطان پوری کا ایک شعر دے رہے ہیں

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ

جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اور مجروح کا ایک اور شعر جو اسی سانحہ کے پس منظر میں ہے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارروان بنتا گیا

یہاں پر امام حسینؑ کا سفر یاد آتا ہے، جب وہ مدینہ سے چلے تھے تو پورا لشکر ان کے

ہمراہ تھا دراصل ان انتہائی دردناک واقعات کے تاریخ میں بے مثال ہونے کا ایک پہلو یہ ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ اس قربانی میں پورا خاندان، ایک پوری جماعت اور ایک پورا قافلہ شریک تھا۔ جن میں سے ہر فرد راہ حق میں اپنا سب کچھ لٹانے کو عین شہادت سمجھتا تھا۔ اور شاید شاعر کے ذہن میں یہی خیال تھا جسے اس نے شعر میں ڈھال دیا۔ بہر حال اس طرح ان ترقی پسندوں نے اردو شاعری کو ترقی پسند شاعری کی طرف لے جانے میں سانحہ کربلا کا سہارا لیا اور اس تاریخی حوالے کی استعاراتی خوبیاں چن چن کر اپنے یہاں جمع کر لی اور ترقی پسند ادب کے ذریعہ ادب کو ایک نیا رخ دیا۔ ادب نے اس سرمایہ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

اسی سلسلے کا ایک اور اہم شاعر ہے محسن زیدی، محسن زیدی کی شاعری حالات اور معاشرے کی کشمکش کا اظہار معلوم ہوتی ہے شاعر اپنے عہد سے ناخوش ہے۔ اسے بہت سی کمیاں جو سماج میں ہیں تکلیف دہ محسوس ہوتی ہیں۔ اور ان مسائل اور دشواریوں سے نبرد آزما انسان اور وہ عصری ادبی معاشرتی مسائل اس کے ذہن میں ایک خاکہ پیدا کرتے ہیں جہاں وہ آج کے انسان کو کربلا کے کارزار میں تنہا کھڑا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام مسائل کے اندھیروں کے باوجود شاعر کو امید بھی ہے کہ روشنی بہر حال ایک دن ضرور نصیب ہوگی۔ محسن زیدی کی امید کا سورج ڈوبا نہیں ہے وہ ایک دن ایسا دیکھتے ہیں جب تمام مسائل کا حل ضرور نکلے گا اور اس پورے فکری نظام میں جا بجا کربلا واضح طور پر موجود ہے۔ محسن زیدی کے یہاں استعاروں، محاوروں، تشبیہات تلمیحات کا جگہ جگہ بہت ہی سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے یہ ترقی پسند شاعر عصری آگہی کا رجحان رکھتا ہے۔ ''رشتہ مجموعہ کلام'' میں ان کے بہت سے اشعار ہمارے موضوع پر ملتے ہیں۔ یہ تمام اشعار غزل کے ہیں۔ محسن زیدی عہد نو کے ایک بے پناہ شاعر ہیں۔ اور ترقی پسندوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ''کربلا'' اور ''تشنگی'' بار بار اشعار میں نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ذہنی طور پر اپنے عہد سے دل برداشتہ

ہے، اور یہی تشنگی اسے صحرائے وقت میں مسلسل بھٹکا رہی ہے۔ اشعار میں یہ کیفیت ہے

چاروں طرف بلند نشاں تیرگی کا تھا
رکھا ہوا فصیل پہ سر روشنی کا تھا

آج تک نہر ہے جس دشت کے سینے پہ رواں
پیاس میں قتل ہوا تھا وہیں لشکر اپنا

شہر میں ہر صبح ہے اک تازہ قتل آفتاب
صبح کا منظر کسی صحرا میں چل کر دیکھیے

دشت غربت میں تو سب ہی خانماں برباد ہیں
کس سے پوچھے کوئی چھوڑ آئے ہو اپنا گھر کہاں

کوئی چہرہ کیا ملے گا اس یزیدی فوج میں
ہے یہ اک انبوہ بے سر تن پہ اس کے سر کہاں

کہیں محسن زیدی کی شاعرانہ فکر وقت کے تقاضوں پر سر کا نذرانہ دینے کی تمنا ظاہر کرتی ہے، اور کہیں پر یہ خیال کہ ہر دور میں وقت سر کا نذرانہ مانگتا ہے۔ شعر ہیں

کہیں دل میں آرزوؤں نے خیمے کئے تھے نصب
کس دشت بے شجر میں یہ لشکر پڑا رہا

ہمارے جسم سے سر اب جدا جدا سا ہے
یہ فرق و عرش کا رشتہ بھی ٹوٹتا سا ہے

جیسے گھرا ہوا ہوں میں فوج یزید میں
جیسے ہوں سارے دشنہ و خنجر مرے لئے

یہاں پر محسن زیدی کی اپنے عہد اور اپنے لوگوں سے شکایت ظاہر ہو رہی ہے کہ اس درجہ بددل ہیں کہ خود کو حسینؑ کی طرح تنہا اور فوج یزید میں گھرا محسوس کرتے ہیں:

تاکے ہے آب تیغ بڑی آس سے مجھے
ہے منتظر لہو کا سمندر مرے لئے

گلہ کرو نہ مرے قتل کا کہ دے کے کفن
چکا دیا ہے زمانے نے خوں بہا میرا

جن سے مانگے تھا کبھی دامن صحرا پانی
بند ہے آج انہیں پر لب دریا پانی

مہنگا جس دشت میں تھا جاں سے زیادہ پانی
دے دیا مفت جو دشمن نے بھی مانگا پانی

اس مندرجہ بالا شعر میں وہ امام حسینؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ حر کے لشکر کو پانی سے سیراب کیا، اس جگہ جہاں کہ خود انہیں تین دن کی تشنگی میں لشکر سمیت شہادت دینی تھی اور جہاں ایک قطرۂ آب کے عوض علی اصغر کی گردن ناوک سے چھیدی گئی، لیکن عظمت کردار امام حسینؑ کا یہ منظر بے مثال اور لاثانی ہے کہ انہوں نے کردار کی بلندیوں کو حاصل کرلیا تھا، اور کہیں پر محسن زیدی عاشور کی رات امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو جو خطبہ دیا تھا اس کا منظر اس طرح پیش کررہے ہیں

سوچ لو ایسے سفر پر نہ مرے ساتھ چلو
لوٹ آنے کا جہاں سے نہ ہو رستہ کوئی

پیاس صحرا کی طرح ہے دور تک پھیلی ہوئی
کربلا ہے دوستو پانی کا ایک قطرہ نہیں

کرلو شمار کشتہ چراغوں کو ورنہ کل
الزام قتل صبح پہ دھر جائے گی یہ رات

اندھیرا ہی آگیا تھا خنجر لئے
جو سورج کا سر کاٹ کر لے گیا

دور تک وقت کے نیزوں پہ ہیں سر رکھے ہوئے
وقت ہر دور میں نذرانہ سر مانگے ہے

محسن زیدی کے یہ اشعار ان کے مجموعہ کلام ''رشتہ کلام'' سے لئے ہیں اور ان سب اشعار میں کربلا کا پس منظر موجود ہے، شاعر نے ایک خاص ذہنی رویہ کے مطابق یہ تمام اشعار کہے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک اور شاعر ہیں اجمل اجملی ان کے مجموعہ کلام ''سفرزاد'' میں پروفیسر سید محمد عقیل نے صفحہ ۱۹ ر پر اجمل اجملی کے بارے میں اپنی رائے کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے۔

''رومانیت اور اس کی تلخیاں، فکر میں خارجی اظہاریت عزم اور آہنگ انقلاب سماجی ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد اور پھر ایک نئی صبح کا انتظار جس میں انسانوں کی دنیا بدلے گی۔ اور ان صورتوں کے اظہار کے لئے نظم کا سانچہ میرا خیال ہے کہ اجمل اجملی کی شاعری کی یہی محبوب صورتیں ہیں ان کی شعری کیفیت کو بلندی ان کی نظموں ہی سے ملتی ہے، اگرچہ انہوں نے غزلیں کچھ کم نہیں کہی ہیں مگر وہ دنیا الگ ہے۔''[1]

ذیل کی نظم میں احساس اور کشمکش کی لڑیاں جڑتی چلی گئی ہیں شعری بلندیاں Eievation اور اتار Depressions سب بڑے سلیقے سے متحرک ہیں مگر اپنی توسیع کے متمنی بھی ہیں۔

مسند نشین قاتل دوراں ہے دوستو
نازاں کھڑے ہیں وقت کے شبیر دیکھنا

ان کی نظموں میں عہد حاضر کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے، کچھ نظمیں فرقہ پرستی کے خلاف کہی گئی ہیں ان میں احتجاج کی لے نسبتاً تیز نظر آتی ہے، اعتراف ایک فساد زدہ شہر اور پھول زخمی ہیں، اسی طرح کی نظمیں ہیں اس کے علاوہ ''دعا''، زندگی، چاند، سوالیہ نشان، موم کے

---

[1] ''سفرزاد'' صفحہ ۱۹، پروفیسر سید محمد عقیل

بت، نئی نسل، وغیرہ بھی موضوعات اور پیش کش کے اعتبار سے بہت اچھی ہیں جو ٹریجڈی ہمارے عہد میں براہ راست نبرد آزما ہے ان کی شاعری کا اظہار ہے۔

علی احمد فاطمی کے لفظوں میں

"اجمل اجملی انجمن ترقی پسند مصنفین سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں اور آج بھی ان کے کمزور جسم میں انجمن آتما بن کر دوڑ رہی ہے وہ آئین اور منشور کے قائل اور نقطہ نظر کے حامل ہیں۔[1]

"دعا" نظم میں اجمل اجملی کی فکر اور انانیت دیکھنے کے لائق ہے، اور زندگی کا سچائیوں سے بھرا چہرہ وہاں جلوہ گر ہے:

"دعا"

وقت آخر ہے اے ضمیر مرے
حق پرستی کی شان باقی رکھ
بے محابہ زبان باقی رکھ
سر کا جو حشر ہو رہے یا جائے
آبرو پر قلم کی حرف نہ آئے
ہوس لقمہ ہائے تر نہ رہے
ظلم کا ظالموں کا ڈر نہ رہے
دوستوں سے ملے نہ پیار کی خو
پاس پھٹکے نہ اقتدار کی بو
ہم کو کار گدا گری سے بچا

1۔ مضمون "سفرزاد" علی احمد فاطمہ، صفحہ ۷، شعبہ اردو، الٰہ آباد، اپریل، ۱۹۹۳ء

باب سینے کے سارے کھل جائیں
سارے دنیا کے دکھ سمٹ آئیں
شمر دوراں کے روبرو نہ جھکوں
ہے گلا پاس تو حسینؑ بنوں
سچ پہ جب بھی پڑے کوئی افتاد
ہو ادا قرض سنت سجاد

یہ نظم آخر میں واقعہ کربلا کی طرف گھومتی ہے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں اجمل نے اپنے عہد کی بے چینی کو شمر دوراں اور امام حسینؑ مظلوم کے درمیان کی جنگ سے ملایا ہے اور اپنے عہد کے حکمراں انہیں شمر کی طرح ظالم نظر آتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی احساسات و تجربات کو اس طرح فن کاری سے بیان کیا ہے کہ وہ زندگی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے جو وہ محسوس کرتے ہیں وہی تحریر کر دیتے ہیں مقصدیت کی کثرت کے باوجود اجمل اس لطافت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں جو ہماری شاعری کا حصہ ہے، زبان و بیان کی ندرت بندشوں کی چستی اور اظہار کی بے ساختگی نے غزل کے اشعار میں بلا کی کاٹ پیدا کر دی ہے۔

فرعون وقت کوئی بھی ہو سرکشی کرو
یاران وقت میری طرح زندگی کرو
آؤ کسی سولی پہ سجا آئیں بدن ہم
کمبخت کو جاں دینے پہ اصرار بہت ہے

انکار کا وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں ایک بڑے مقصد کے حصول کیلئے سامنے مظاہر اور تمام چیزوں کی نفی کر دی جاتی ہے۔ ان کے یہاں انکار اور پھر جرأت انکار پر نازاں ہونے کی

کیفیت بھرپور توانائی کے ساتھ ملتی ہے

اقرار کی منزل بھی ضرور آئے گی لیکن
اس وقت تو بس جرأت انکار بہت ہے

پھر کسی فرد نے انکار کی جرأت کی ہے
جذبہ دار و رسن ہمت مردانہ لئے

ہر طرف قاتلوں کا مجمع ہے
اپنی بستی کو کربلا کیجئے

یہ مہک آشنا سی لگتی ہے
نوک نیزہ پہ کس کا سر ہے یہاں

جب سے دریا کا کنارا پیاسوں کا مسکن ہوا
دشت میں آئیں بہاریں گل کھلے گلشن ہوا
سوئے مقتل لے چلی ہے آج پھر دنیا ہمیں
قابل دار و رسن شاید ہمارا تن ہوا

ترقی پسند شاعروں نے جس راستہ کا تعین کیا، آگے چل کر جدید شعراء نے انہیں پر اپنی راہیں تلاش کی ہیں، اور نئی نئی منزلوں کا سفر کیا ہے۔

باب ہفتم

جدیدیت سے متاثر شعراء کے کلام میں واقعات کربلا

(الف) دور جدید کے انسان کی مایوسی اور انتشار

(ب) انفرادیت پرستی اور عدم استحکام کی کیفیت
مغرب کے جدید فلسفیوں کے نظریات کا مطالعہ

(پ) دور جدید کے غزل گو شعراء اور واقعہ کربلا

(ج) جدید نظموں میں واقعات کربلا کے اشارے

ترقی پسند شعراء اور ادیبوں نے جس آگ کو بھڑکایا وہ آزادی حاصل کرنے کی بھرپور جدوجہد میں بہت کام آئی اور یہ نعرے زبان زدعام ہو گئے کہ

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

راجندر پرساد بسمل

دراصل یہ انتشار برسوں سے سوئے ذہنوں میں کروٹیں لے رہا تھا اور سہارا ملتے ہی چونک کر جاگ اٹھا اور ایسے انقلابات برسوں سے دبے ہوئے طوفان کی طرح ہوتے ہیں۔ دراصل انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستانی زندگی پر یورپ کی سائنسی زندگی کا اثر ہونے لگا تھا اور ایک ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کا عالم جو کہ پہلی جنگ عظیم کے پندرہ بیس برس بعد بھی کم نہ ہو سکا تھا دھیرے دھیرے اپنا اثر دکھا رہا تھا جس کا اثر عوام سے لے کر خواص تک پر واضح تھا۔ بیسویں صدی کا روسی انقلاب دراصل مارکس کے ''جدلیاتی مادیت'' کے نظریے کا ایک عملی مظہر اور اشتراکیت کی تفسیر تھا چونکہ جدید ذہن اور شعروادب کی تشکیل میں اشتراکی نظریے نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

اشتراکی نظریات آناً فاناً روسی ادیبوں کے ذہن کا جز بن گئے اور روس کی سرحدوں کو پھاند کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔ ہندوستان بھی اشتراکی خیالات سے پوری شدت سے متاثر ہوا۔ چونکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کا دور اب زیادہ دن تک چلنے والا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

لاکھوں گاؤں میں رہنے والے لاکھوں افراد نہ صرف یہ کہ سیاسی بے حسی کا شکار تھے بلکہ ذہنی طور پر مکمل مفلوج ہوکر رہ گئے تھے افلاس اور بیماری کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور سرکاری افسروں زمین داروں اور مہاجنوں کے مظالم کے بری طرح شکار تھے‘‘ ۔[1]

محنت کش طبقہ جیسے فیکٹری مزدور، کسان وغیرہ بے دار ہوگئے تھے اور اپنے حقوق کے لئے لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئے تھے یہ ماحول اشتراکی خیالات کی اشاعت اور تبلیغ کے لئے بہت سازگار تھا اس سلسلے میں ترقی پسندوں کا جو کردار مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقہ کے افراد کی طاقت کو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موڑ دینا، اور ادبی کاوشوں سے عوام میں احساس شعور، جوش عمل، حرکت اور اتحاد پیدا کرنا تا کہ ملک میں ایک بہتر زندگی کا خواب پورا ہوسکے نہ صرف شاعری میں بلکہ افسانوں، ڈراموں، ناولوں اور تنقیدوں میں مارکسی نقطہ نظر کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا اور ادب میں سیاست کی کارفرمائی زیادہ بڑھ گئی اس سے جہاں ایک طرف عوام کے حوصلوں امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمانی ہوئی وہاں دوسری طرف نعرے بازی سستی جذباتیت اور یکانگت طرز عمل کا اثر بھی ادب پر پڑنے لگا اس طرح اردو شعروادب میں اشتراکی خیالات واضح طور پر ابھرنا شروع ہوئے اور خاص کر کے ان قلم کاروں کی تحریروں میں جھلکنے لگے جو ۱۹۳۵ء میں ’’انجمن ترقی پسند مصنفین‘‘ کے قیام کے بعد اس ادبی تحریک سے وابستہ رہے اس سلسلے میں ہم ایک حوالہ شمیم حنفی صاحب کی تحریر میں پیش کر رہے ہیں، شمیم حنفی کہتے ہیں کہ

’’ہمارے زمانہ کی نظمیہ شاعری کا وہ حصہ جسے کچھ لوگ ترقی پسند کہتے ہیں اس کے لئے زمین ہموار کرنے کا کام اصلاً اشتراکی حقیقت نگاری ہی نے انجام

---

[1] تاریخ تحریک آزادی، صفحہ ۱۹۹، تاراچند، جلد سوم

دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک بلاشبہ ایک ایسے ادبی میلان کی نقیب تھی جو تاریخ تہذیب اور تخلیقی سرگرمی کے ایک نئے معیار سے وابستہ تھا اور اس معیار کے قیام میں حواس اور بصیرتوں کے سفر کا ایک پورا سلسلہ معاون ہوا تھا۔"[۱]

اب سوال یہ ہے کہ اشتراکیت سے انفرادیت تک کا سفر انسان نے کس طرح طے کیا اور ادیبوں شاعروں نے اسے کس طرح محسوس کیا۔ تو اسے سمجھنے کے لئے ہمیں انگریزی شاعری کے بیسویں صدی میں مخصوص رجحانات اور خصوصیات کا ذکر کرنا پڑے گا چونکہ ہمارے ادب میں وہ رجحانات کافی بعد میں آتے ہیں، جو مغرب میں بہت پہلے آگئے تھے، یہ شاعری دراصل اپنے عہد کا گہرا شعور رکھنے کے ساتھ آگہی کی انتہا پر ہے، یہ شاعری سائنسی اور صنعتی ترقی کے لئے حیرت انگیز کارناموں کے زیر اثر زندگی کے مختلف شعبوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور گہرائیوں کا شدید احساس رکھتی ہے، جدیدیت اور نیاپن اس کا بنیادی آہنگ ہے اور گزشتہ دور کی روایت سے سمجھوتہ کرنے کے لئے یہ ہرگز تیار نہیں ہے، اس سلسلے میں جناب اجمل اجملی صاحب کی تحریر یہاں پر دیکھئے کہتے ہیں کہ

ترقی پسندوں نے ہماری شاعری کا رشتہ قومی اور عوامی تحریکوں کے علاوہ بین الاقوامی تحریکوں سے جوڑ کر ایک نئی انسانی اخوت اور نئی عالمی یک جہتی کا تصور دیا اس کی خوب صورت مثالیں فیضؔ، سردار جعفریؔ، کیفی اور مخدوم کی شاعری میں ملتی ہیں۔ سردار جعفری کا کارنامہ یہ ہے کہ اقبالؔ اور جوشؔ کے اثر سے جو لہجہ ہمارے مزاج میں رچ بس گیا اس فضا اور اس لہجہ کے اثر کو سردار جعفری نے توڑا"[۲]

---

۱ ترقی پسند ادب، شمیم حنفی، صفحہ ۲۶۹

۲ ترقی پسند ادب، صفحہ ۲۷۶ تحریر اجمل اجملی، قمر رئیس عاشور کاظمی

نئی صدی میں انسان سائنسی انداز نظر کے فروغ کے ساتھ ہر خیال پر تنقیدی و تشکیکی نگاہ ڈالنے لگا یہاں تک کہ اسے اخلاقی مذہبی اور سماجی قدریں زندگی، یقین اور ایمان سے محروم نظر آنے لگیں نتیجتاً اس کے بہت سے روحانی جذباتی سہاروں کی شکست ہوگئی، جس سے انسانی روح میں خلاء پیدا ہوگیا اور محرومی کا احساس داخلی عذاب بن کر ذہنی فضا پر چھانے لگا۔ یہ احساس محرومی روز بروز بڑھتا گیا اس کے بڑھنے کی ایک اہم وجہ یہ ہوئی کہ انسان کو نئے تہذیبی وسائنسی تصورات نے مادی آسائش اور فراوانی تو عطا کی لیکن پرانے ٹوٹے ہوئے اخلاقی اور روحانی تصورات کے بجائے نئی قدریں نہیں دیں۔ اور انسان کی وہی حالت ہوئی جو ایک ایسے گمراہ مسافر کی ہو جو ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے مایوس ہوکر اپنی منزل کی تلاش میں تاریک سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہو، یہ جو جدید تہذیب کا المیہ ہے۔

جس کی نوحہ خوانی داخلی قنوطیت کی شدت کے ساتھ ہارڈی، اور ہاؤس متین نے کی اور ایزرا پاونڈ، ایلیٹ، اور آڈن نے جسے پوری شدت اور روحانی کرب کے ساتھ محسوس کیا اس دور میں شدید احساس تنہائی کا رجحان شاعری میں واضح ہے نئی مشینی تہذیب کی مصروفیت کثرت کار اور گہما گہمی کے باوجود انسان اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہا ہے، اور انجمن آرائی کے باوجود اسیر تنہائی ہے۔ شعراء تنہائی کے ویران لمحوں میں اجتماعی دل چسپیوں میں کھو جانے کے بجائے داخلی زندگی کے سلگتے ہوئے ویرانوں میں کھو جاتے ہیں، اس لئے جدید شاعری میں انسان میں اس وقت جو مایوسی ابھر کر سامنے آئی ہے، اور جس انتشار میں اس عہد کا آدمی بتلا ہے اسے بہت ہی واضح شکل میں پیش کیا جا رہا ہے، اس بارے میں ۱۹۳۹ء میں سجاد ظہیر صاحب نے کہا تھا:

یہ ایک طرح کی ادبی دہشت انگیزی ہے یہ ایک ذہنی اور جذباتی بلوہ ہے جو ایک درمیانی طبقے کے انقلاب پرست کے لئے ابتدا میں تو شاید جائز ہو، لیکن

ایک اشتراکی شاعر کو اس سے دور رہنا چاہئے۔[1]

انسان اپنے حالات سے فوراً متاثر ہوتا ہے، اور ایک مدت سے انسان روزی روٹی اور اقتصادی مساوات کا خواب دیکھتا آیا ہے، اس کی تعبیر شوشلزم تھی جسے مارکس نے عینی سے عملی اور سائنٹفک بنا دیا ترقی پسندوں نے اشتراکی نظام کی خواہش جا بجا کی لیکن دھیرے دھیرے انسان تنہائی کے اس شدید احساس میں مبتلا ہو گیا اور فرد کا تصور ذہن میں آ گیا یعنی سماج کے بجائے وہ فرد میں تبدیل ہو گیا اور بجائے اشتراک کے اکائی بن گیا، ایسا کیوں ہوا اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون پیش ہے، دیکھئے۔

"دراصل موت تنہائی محرومی اور مایوسی زندگی، سماجی، کامرانی، اور کامیابی تو عام ہے سماج کے ہر دور میں ان دونوں مثبت اور منفی پہلوؤں کا چولی دامن کا ساتھ ہے جسے سماجی حقیقت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ دراصل دو سچائیوں سے ضرورت عبارت ہوتی ہے ایک مرتی ہوئی گذرے ہوئے کل کی سچائی جو آنے والے کل میں اپنی جگہ نہیں پا سکتی۔ اور بے قراری کے ساتھ زندگی سے چمٹے رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری پیدا ہوتی ہوئی ابھرتی ہوئی کمزور اور نحیف نئی سچائی جو آہستہ آہستہ بلکہ کبھی اکثر تکلیف دہ آہستگی کے ساتھ اس مرتی ہوئی سچائی کی جگہ لیتی ہے، یقیناً جو لوگ (خواہ وہ اپنے آپ کو نیا کہتے ہوں یا پرانا) گذرے ہوئے کل کی مرتی ہوئی سچائی ہی کو دیکھتے ہیں اور جنہیں ابھرتی ہوئی کمزور نحیف سچائی کا چہرہ ابھی دکھائی نہیں دیتا انہیں چار سو موت، تنہائی، محرومی اور مایوسی نظر آئے تو کچھ تعجب نہیں"۔[2]

---

[1] اردو میں ترقی پسند تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، صفحہ ۳۵۱، بحوالہ سجاد ظہیر، اردو کی جدید انقلابی شاعری

[2] جدیدیت تجزیہ و تفہیم، صفحہ ۵۲-۵۱، ڈاکٹر مظفر حنفی، ۱۹۸۵ء، نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

بہر حال یہ صورت صرف فکری خلا سے پیدا ہوتی ہے اور فکری خلا میں حالات پر گرفت نہ ہونے اور ان حالات کو گرفت میں لانے کی بصیرت نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ انسان نے حیاتیاتی ارتقاء کا پورا سفر حالات کو قابو پا کر ہی طے کیا ہے۔ اور اس میں اس کے جنون وخرد نے اس کی رہنمائی کی ہے۔ اور اگر وہ حالات کو اپنے خلاف پاتا ہے اور جس کے لئے وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تو لازم ہے کہ اسے شدت سے احساس تنہائی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور یہی احساس بڑھ کر انتشار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور انتشار کی شکل میں عوام تو احتجاجی جلسے یا نعرے بازی شروع کر دیتے ہیں لیکن دانشور طبقہ اپنے دل کا غبار کاغذ پر نکالتا ہے اور پھر وہی احساس تنہائی اس کے شعروں میں بولنے لگتا ہے، یا اس کے افسانے میں ایک اینگری مین ہیرو بن جاتا ہے۔ جو کہ بالکل تنہا ہے اکیلا ہے اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہے، اور وہ اپنے ماحول سے بغاوت کرتا ہے، یا پھر شاعر اپنے کلام میں ظلم کے خلاف بغاوت کرنے کی رائے دیتا ہے اور یہ رائے وہ ایک اشارے میں دیتا ہے اور یہ اشارہ واقعہ کربلا سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے تو اس طرح وہ خود کو مظلوم اور باغی ایک وقت میں دونوں شکلوں میں پاتا ہے اس کے شعر اس خیال کی غمازی کرتے ہیں جہاں وہ تنہا دشت میں کھڑا ہے، اور ظالموں کے لشکر صف بہ صف اسے چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں، یہ تنہائی اور انتشار اس کے عہد کی دین ہے۔ اور فرد علامت ہے اس گھٹن کی جس میں آج کا انسان مبتلا ہے، اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس دور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر انگریزی ادب کی گہری چھاپ موجود ہے اور انفرادیت کے خدوخال بہت دھندلے سے ہیں۔ انیسویں صدی میں بزینٹ کے بعد ایڈگر ایلن کے یہاں پہلی بار ایک آزاد انفرادی تخلیقی قوت کا اظہار ملتا ہے۔ دراصل ہر انسان کسی نہ کسی حیثیت سے اپنی ایک کمزور یا قوی انفرادیت رکھتا ہے، اور دوسرے یہ کہ ہر شخص کسی نہ کسی جگہ کسی نہ کسی زمانے میں اور کسی نہ کسی سماج میں پیدا ہوتا ہے، دنیا میں آ کر آنکھ کھولتے ہی

انسان کو بہت سے ناپسندیدہ حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جن میں سے کچھ وہ بخوشی کچھ مجبوری میں قبول کرلیتا ہے۔

ادیب بھی اس اعتبار سے عام انسان سے مختلف نہیں ہوتا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ ادیب تخلیقی قوت اور اظہار کا مالک ہونے کی وجہ سے اپنی پسند اور اختلاف کو بھی برابر ظاہر کرتا رہتا ہے، اور دنیا کی تعمیر نو چاہتا ہے، وہ دنیا جسے اس نے خوابوں میں دیکھا اور بسایا ہے اسی کے بارے میں مجنوں گورکھپوری صاحب فرماتے ہیں کہ

> ''حقیقت یہ ہے کہ ادب بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور زندگی نام ہے ایک جدلیاتی حرکت کا جس کے ہمیشہ دو متضاد پہلو ہوتے ہیں، ادب بھی ایک جدلیاتی حرکت ہے، اور اس کے بھی دو متضاد پہلو ہیں۔ ایک تو خارجی یا عملی یا افادی، دوسرا داخلی یا تخیلی یا جمالیاتی۔ حسن کار یا ادیب کا کام ہے کہ وہ ان دو بظاہر متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قائم کرے''[۱]

جہاں تک انفرادیت کا سوال ہے انفرادی اثرات اور تجربات، مشاہدہ اور مطالعہ سے وسیع تر ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے خیالات میں تدریجی اضافی یا بنیادی فرق پیدا ہوسکتا ہے، یہ بات فرد کے اندر بھی ہوسکتی ہے اور دوسروں کے مقابلے میں بھی انہیں اختلافات کی بنیاد پر انفرادیت کے پہلو نمایاں اور واضح ہونے لگتے ہیں، اور شخصیتوں کی الگ الگ تشکیل ہوتی ہے۔ ادیب کی انفرادیت اور شخصیت کا مطالعہ بھی انہیں حقائق کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے زمانے اور سماج میں گرفتار بھی ہے اور انفرادی سوجھ بوجھ قوت تخلیقی اور اظہار کی وجہ سے آزاد بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادیت سماجی تعینات ہی کے پردے میں اپنا اظہار کرسکتی ہے۔ یہی وجہ عدم استحکام کی بھی ہے کہ کوئی زمانہ اور کوئی سماج ایسا نہیں ہوسکتا جس کو ہر فرد

۱؎ ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری، صفحہ ۵۴۹

اپنے لئے سازگار پائے اور اب وہ ماحول بھی نہیں ہے جو چند سال قبل تھا، دور حاضر میں قومی کلچر اور تہذیب کا کوئی ایسا تصور ممکن نہیں ہے، جس میں دیگر قوموں کے کلچر اور تہذیب کی کوئی آمیزش نہ ہو دور حاضر کی جدید ترین اختراعات ریڈیو، ٹیلی ویژن، ڈاک تار، جہاز، راکٹ، اور خلائی پرواز، اخبار نے ہمارا رشتہ ذہنی طور پر ان سے جوڑ دیا ہے، جن سے جسمانی طور پر ہم ہزاروں میل دور ہیں۔ ہم ذہنی طور پر غیر ممالک کا ہر نیا اور پر کشش اسلوب قبول کرنے کو تیار ہیں۔ ہم سب لباس، گفتگو، طرز رہائش اور طرز زندگی کے بہت سے رویوں کے اعتبار سے بالکل غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔ ہم نے بالکل نئی تہذیب کا لبادہ نہیں پہنا لیکن ہماری محفوظ تہذیبی زندگی قریب قریب مشکوک ہوگئی ہے۔

دراصل ہمارا تعلق دنیا کے رویوں اور قدروں سے زبردستی یا بلا ارادہ جڑ گیا ہے۔ اور اس تعلق کے نتائج بھگتنے پر ہم مجبور ہیں اسی طرح جنگ، بھوک، وبا، توسیع، شہر، بڑھتی ہوئی آبادی، بیماری، مفلسی اور موت ایک بین الاقوامی تصور ہے، اوران سب وجوہات سے فرد میں جو عدم استحکام کی جو کیفیت ہے وہ اپنے حالات سے متاثر ہو کر اور اپنے عہد کی بے ترتیبی اور بے چینی کی آئینہ دار ہے، اس کو ذرا بھی سکون حاصل نہیں وہ اپنے فیصلے پر قائم نہیں اسے خواہشات گھیرے رہتے ہیں اس لئے وہ مستحکم نہیں ہے، اس میں استحکام کی بجائے بے اعتمادی ہے ایک پاکستانی شاعرہ ریحانہ روحی کا شعر اس سلسلے میں دیکھئے:

دو نفل روز میں شکرانہ ادا کرتی ہوں
بچے اسکول سے جب لوٹ کے گھر آتے ہیں

اپنے عہد کے خلاف اس ماحول کے خلاف جو کہ ہمارے سماج میں پھیلا ہوا ہے، یہ احتجاجی لہجہ بتا رہا ہے کہ ہم عدم استحکام کا شکار کیوں ہو گئے ہیں یا اسی نہج پر یہ شعر کہ

مرزا غالب

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت گرانی کی

یہ شعر اس بات کی دلیل ہے کہ عہد کوئی بھی ہو انسان جب عدم استحکام کا شکار ہوتا ہے تو وہ اس طرح کے شعر کہہ کر جی ہلکا کر لیتا ہے، ترقی پسند شاعر احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر

خون ناحق کی تو خنجر ہی گواہی دے گا
اور جتنے بھی تھے سب ہو گئے قاتل کی طرف

اب یہ خون ناحق اور قاتل کی طرف داری اس طرف ہی اشارہ ہے کہ کوئی قابل اعتبار نہیں ہے اور یہیں سے عدم استحکام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اگر انسان اپنے معاشرے سے سماج کے نظام سے اپنے قانون یا سرکار سے غیر مطمئن ہے تو اس میں بے اعتباری کا پیدا ہونا لازمی امر ہے، اور جب بے اعتباری ہوتی ہے تو استحکام ہو ہی نہیں سکتا تو انسان میں انہیں وجوہات سے عدم استحکام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو آج کے انسان کا کرب ہے اور جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں علی سردار جعفری کی رائے دیکھئے:

"انسانوں کے بارے میں جب کبھی آزادی اور حقیقی آزادی کا خیال آتا ہے انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی قوتوں سے نبرد آزمائی ضروری ہو جاتی ہے، ادب عرفان و آگہی کا وسیلہ ہے اور مختلف منطقوں کے ادب کا سرسری جائزہ جس نکتہ کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتا ہے، وہ انسان کے ہاتھوں انسانیت کے استحصال اور اس استحصال کے گلو خلاصی کی کہانی ہے ہر علاقہ کی

کہانی کے کردار جدا ہیں لیکن محرکات یکساں ہیں۔ انسانی مسائل کی یکسانیت کا احساس بذات خود ایک ضروری تجربہ ہے'' ۱؎

اور یہ عدم استحکام بھی انسانی مسئلہ ہے بے اعتباری اور عدم استحکام کے سلسلے میں:

''لادینی وجودیت کا نظریہ پیش کرنے والے جدیدی فلسفی یعنی کارل جسپرس (Jespers) کامیو (Comus) اور سارتر (Sartre) وغیرہ کائنات میں فرد کی ذات کے مقام اور اہمیت کا تعین کرتے ہوئے اپنا سارا زور ذات کی انفرادیت پر صرف کرتے ہیں وہ وقت کے ابدی تسلسل میں مظاہر کے مابین وقوع پذیر ہونے والے تمام جدلیاتی تغیر کو صرف فرد ہی کی ذات پر موکوز مانتے ہیں ان کے خیال کے مطابق لمحہ موجود میں ساری کائنات میں رونما ہونے والے سارے تغیرات فرد کی ذات سے نمو پا کر اسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔'' ۲؎

سارتر وجودیت کے بنیادی مسئلے (یعنی انسانی وجود کی وہ بسیط حقیقت جو عقل کی حقیقت سے ممتاز ہو) کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور اپنی نظر کو فلسفیانہ موشگافی کے حوالے نہیں کرتا۔ دوسرے تمام وجودی مفکر اسی مسئلے کو تجزیے کا محور بناتے ہیں۔ سارتر برہنہ اور کھرے شعور کے تصور کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔ ایسا کھرا شعور جو سائنسداں میں ہوتا ہے اور جس کی مدد سے وہ ہر حقیقت کو اس سے قطعاً لاتعلق ہو کر دیکھنے پر قادر ہوتا ہے اس کے مطابق عمل انسان کا نشہ بھی ہے۔ اور نجات بھی۔ اس سے زندگی بنتی ہے اور انسانی وجود کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ سارتر کا اختلاف کامیو سے اس مسئلے پر ہوا تھا کہ وجودیت اور مارکسزم میں

۱؎ ''ترقی پسند ادب'' صفحہ ۸۱، بحوالہ علی سردار جعفری، مرتبہ: قمر رئیس، عاشور کاظمی

۲؎ ''جدید شاعری کی ابجد'' سلیم شہزاد، صفحہ ۶۰، سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء، منظر نما پبلشرز، مالیگاؤں

مفاہمت ممکن ہو سکتی ہے یا نہیں؟ کامیو نے اپنے عہد کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی سعی کی تھی اور وجود کے ایک ازلی اور ابدی مسئلے کو محض ایک خاص واقعے یا زمانے کی گرفت سے نکال کر وجود کے ایک ازلی اور ابدی مسئلے کے طور پر سمجھنا چاہا تھا۔ یہاں پر ہم مارکسزم کا ذکر کریں اور اس کے لئے سب سے معتبر حوالہ ہمیں ڈاکٹر قمر رئیس کی تحریر سے ملتا ہے دیکھئے:

"مارکس بنیادی طور پر ایک سماجی مفکر اور ماہر اقتصادیات تھا۔ تاریخ اور فلسفہ پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ اس لئے جو انقلاب آفریں تصورات اس نے دیئے ہیں ان کا زیادہ گہرا اثر سماجی علوم اور خود انسانی سماج کی تشکیل جدید پر پڑا ہے۔ کیوں کہ اس کی فکر کا مقصد ہی سماج میں بنیادی تبدیلیاں لانا تھا۔"[1]

لیکن "کامیو" زندگی کو اپنی ہی ذات کے آئینے میں دیکھتا ہے وہ اپنے شعور کو بیرونی حقائق سے آلودہ نہیں ہونے دیتا وہ درشت اور نفس پرستانہ یوں ہے کہ "کامیو" صرف اپنی ہی نظر کی رہبری کا قائل ہے اور دوسروں کی طرف سے تلقین و ہدایت کی تعمیل کا منکر ہے اس کی جنگ غیر یقینی اس وجہ سے ہے کہ اس کے پاس کسی سماجی یا سیاسی نظریے یا مذہبی عقیدے کا خواب نامہ نہیں اور مستقبل سے ایک بے نام رشتے کے باعث مستقبل کا کوئی فیصلہ اس کی گرفت میں نہیں آتا کیوں کہ مستقبل اس کی ذات سے الگ ہے وہ اس کے بارے میں صرف سوچ سکتا ہے اسے برت نہیں سکتا۔ اور اگر وہ اس کے بارے میں سوچے گا تو اپنی حقیقی اور برتی ہوئی صورت حال کے پس منظر میں۔ جب حالات اتنے بے یقینی کا شکار ہیں کہ حیاتیاتی سطح پر زندگی کا قیام بھی مشکوک نظر آنے لگا ہو ایسی صورت میں کسی یقینی نتیجے کا استنباط کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ کشمکش کا یہ احساس کامیو کی وجودیت کو سارتر کی بہ نسبت زیادہ حقیقی اور معنی خیز بنا دیتا ہے۔ اس کی گومگو کیفیت اس کا اضطراب اس کی مسلمات سے اس کا انکار۔ امتناعات سے اس کا انحراف

---

[1] ترقی پسند ادب، صفحہ ۵۶۸۔ قمر رئیس

ماضی اور مستقبل کے بجائے حال سے اس کی غیر مشروط وابستگی یہ تمام باتیں کامیو کو بیسویں صدی کے مسائل میں گھرے ہوئے نئے انسان کی ایک سچی تصویر کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

اسی طرح مارکس اور اینگلز نے اشتراکیت کے نظریات اور مقاصد کی اشاعت وحصول کے لئے ایک عوامی انقلاب کی بشارت تو دی ہے لیکن اس انقلاب کا آلہ کار ادب کو بنانے کا مشورہ نہیں دیا ہے۔ لیکن سارتر کے نظریے کے متعلق جناب علی سردار جعفری کی تحریر بھی ہم پیش کر رہے ہیں دیکھئے:

''لیکن سارتر کی وجودیت بے معنویت اور یاسیت کی طرف لے جانے والی نہیں تھی۔ اس کی وجودیت میں بے معنویت اور یاسیت سے زیادہ زور انسانی آزادی اور سماجی انصاف پر ہے۔ سارتر نے جہاں وجود کے ڈائلما پر زور دیا وہاں اس راز کو بھی سمجھ لیا تھا کہ یاسیت کا توڑ سماجی انصاف والی رجائیت میں ہی ہوسکتا ہے'' [1]

اشتراکیت کے ادبی مفکروں نے ادب کی باگ ڈور بھی سیاسی اور سماجی مصلحوں کے سپرد کردی۔ مارکس اور اینگلز نے کمیونسٹ پارٹی کے منشور کی شکل میں سماج کا جو خواب نامہ پیش کیا تھا اس کی نیک اندیشی اور برگزیدگی سے انکار نہیں لیکن کسی مخصوص سیاسی اور سماجی نصب العین کے لئے جدوجہد تخلیقی اظہار کی مرہون منت نہیں ہوتی۔

''مارکس'' کے متعلق مجنوں گورکھپوری کی ایک تحریر کا حوالہ پیش ہے:

''مارکس'' اور اس کے رفیقوں کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ ایک خارجی دنیا کی عملی تشکیل ایک غیر نامیاتی بے جان عالم عناصر کو حسب مراد صورت دینا اور اس میں نئی زندگی پیدا کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ انسان نوع حیوانی کا ایک

---

[1] علی سردار جعفری۔ ''ترقی پسند ادب'' صفحہ ۸۸، مرتبہ قمر رئیس

ارتقاء یافتہ رکن ہے، وہ حیوانات میں ایک ایسی مخلوق ہے، جس کی تخیل یہ ہے
کہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جائے جیسا کہ خود اپنی
ذات کے ساتھ۔ اپنی ضرورتوں کی طرح اپنے تمام ہم جنسوں کی ضرورتوں کا
رفیقانہ احساس آدمیت کی شناخت ہے'' ؎۱

اسی سلسلے میں بے حد اہم نام ''نطشے'' اور ''کر کے گار'' کے بھی ہیں۔ نطشہ کی طرح کر کے گار نے بھی موت کے ہم۔ گیر تجزیے میں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی وہ انسان کی عام مایوسی اور نامرادی کو موت کے دائم موجود آسیب کی آفریدہ بیماری سے تعبیر کرتا ہے، جس میں ہم تھک کر خود ہی مر جانے کی آرزو کرتے ہیں لیکن ایک معینہ مدت کے لئے زندگی پر مجبور بھی ہوتے ہیں ہم اپنے آپ سے بھاگنا چاہتے ہیں لیکن وجود کی زنجیر ہمیں جانے نہیں دیتی یہی کشاکش ہمیں بتاتی ہے کہ ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنا کتنا دشوار ہوتا ہے، لیکن کس قدر ناگزیر کر کے گار کی وجودی فکر کا مرکزی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انفرادیت آفاقیت سے ارفع تر ہے، انفرادیت مخصوصیت ہے، آفاقیت تفہیم۔ اس نظریے کی رہبری میں وہ عقیدے تک بھی جاتا ہے، اور سقراط سے بھی ایک ذہنی ربط قائم کرتا ہے۔ ''کر کے گار'' کہتا ہے کہ صرف داخلیت میں فیصلے کی صلاحیت ہے۔ معروضیت کی تلاش کا مطلب ہے غلطی میں پڑنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو جاننے کے لئے انسان پر لازم ہے کہ خارجی شرائط سے خود کو مغلوب نہ ہونے دیں۔ یعنی داخلی تصور وجود کے ہاتھ آنے والی حقیقت کو عقیدہ کے برابر کا درجہ دیتا ہے۔ انسانی صورت حال اپنے ارضی وجود کی محدودیت اور ساتھ ہی ساتھ ابدیت کی جستجو کے سبب ''کر کے گار'' کے نزدیک ایک عجوبہ ہے۔ شمیم حنفی صاحب کی تحریر کے مطابق:

''فرائڈ یونگ اور ایڈلر تینوں نے اپنے اپنے طریقے سے شخصیت کی باطنی

؎۱ ''ترقی پسند ادب'' صفحہ ۱۷۸، مجنوں گورکھپوری، مرتبہ قمر رئیس۔

پیچیدگیوں بے جابات کا تجزیہ کیا ہے، انہوں نے انسان کو ایک ازلی اور ابدی مظہر کے طور پر بھی دیکھا اور اپنے عہد کی مخصوص ذہنی اور جذباتی فضا کے آئینے میں بھی“ [1]

یہ مختصراً ایک مطالعہ ہے مغرب کے جدید فلسفیوں کے نظریات کا جن کے خاص خاص نظریوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اب ہم یہاں پر دور جدید کے غزل گو شعراء کا ذکر کریں گے ویسے یہ شعرا نظمیں اور دوسرے اصناف سخن میں بھی طبع آزما ہیں۔ لیکن ہم پہلے خصوصاً غزل میں واقعہ کربلا کا ذکر کریں گے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی فرماتے ہیں:

”ترقی پسند شعراء ۵۰-۱۹۵۱ء کے بعد جب غزل کی طرف واپس ہوئے تو ایک نیا لہجہ لے کر آئے جس میں ایک گہرے طنز کی سبک اور پھیل جانے والی لہر تھی اس کے لہجے میں بڑا ضبط تھا۔ اور ۱۹۶۰ء کے آس پاس نمایاں ہونے والی نئی نسل کی غزل نے دراصل اس باغیانہ کردار کو اور زیادہ فروغ دیا جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ابھرا تھا اب غزل میں طنز، اضطراب، اور دکھ پہلے کی طرح دبا دبا اور دھیما نہیں رہا، اس میں شوخی طراری اور کلاسکیت سے ایک خوش گوار گریز تھا۔“ [2]

جدید غزل کے سلسلے میں ہم چند ہندوستانی، پاکستانی شعراء کا ذکر کریں گے وہ شعراء جن کی شعری انفرادیت کی تشکیل میں اس مرکزی حوالے سے کچھ نہ کچھ پہچان قائم ہوئی ہے ان سب کا تقریباً ذکر یہاں پر کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔

---

[1] ”جدیدیت کی فلسفیانہ اساس“، شمیم حنفی، صفحہ ۲۱۶، مکتبہ جامعہ نئی دہلی

[2] ”ترقی پسند ادب“، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، صفحہ ۴۸۸

یہاں ہم ہندوستانی شعراء میں خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد علوی، شہریار، وحید اختر، شاذ تمکنت، کمار پاشی، صلاح الدین پرویز، حنیف کیفی، مظفر حنفی کا ذکر خاص طور پر اور پاکستانی شعراء میں مجید امجد، منیر نیازی، شہرت بخاری، مصطفیٰ زیدی، احمد فراز، کشور ناہید، افتخار عارف، اور پروین شاکر وغیرہ کا کلام نمونے کے طور پر پیش کریں گے۔

نئی غزل کا سفر خارجیت کی طرف ہے لیکن یہ داخلیت ایسی نہیں ہے کہ دوسرے افراد اس میں شرکت ہی نہ کر سکیں، نئی غزل لکھنے والوں میں مختلف نظریات اور عقائد کے ماننے والے شعراء شامل ہیں اور ان کے نظریات وعقائد کا اظہار اکثر و بیشتر ان کے اشعار میں ہوتا رہتا ہے، کہیں خدا کے وجود پر اصرار اور اس کے حضور دعائیہ لہجہ اور کہیں تشکیک یا تذبذب کی کیفیت واضح طور پر نئی غزل میں نظر آتی ہے، چونکہ جدید معاشرہ کسی ایک نظریے یا عقیدے کا پابند نہیں۔ لیکن نئی غزل کے شعراء نے اپنے نظریات وعقائد جگہ جگہ پر غزل یا نظموں میں پیش کئے یہاں پر ہم غزل میں یہ نظریات وعقائد دیکھتے ہیں جو کسی خاص کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اس سلسلے میں ہم مجید امجد کا پیرایہ فکر تلاش کریں گے، مجید امجد دنیا کے ہنگاموں اور ادبی بحث مباحثوں سے گریزاں ہمیشہ آزادروی سے موضوع اور اسلوب کے تجربے کرتے رہے ان کے یہاں تازگی اور تاثیر ہے۔ اور اس تاریخی حوالے سے متعلق بھرپور خیال آگے ان کی نظموں میں بھی ملے گا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں دیکھئے:

''مجید امجد کا پیرایہ بیاں حد درجہ غیر رسمی اور تازہ ہے، وہ کرداروں کے ذکر کے بجائے کیفیتوں کو کردار عطا کرتے ہیں، ان کی کامیابی کا راز ان کے احساس اور اظہار کے اسی اچھوتے پن میں ہے''[1]

---

[1] سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، صفحہ ۵۱، گوپی چند نارنگ

وہ کرداروں کا ذکر کرنے کے بجائے کیفیت کو کردار میں ڈھال دیتے ہیں، مجید امجد کے شعری اظہار میں دھیمی اور الم ناک کیفیت ملتی ہے، جس طرح اقبال نے کردار امام حسینؓ کی عظمت کو شعروں میں ڈھالا تھا تقریباً اسی طرح ایک نسل بعد مجید امجد کی نظموں سے اسی رجحان کے زیر اثر ایک نئی تخلیقی کیفیت کا اضافہ ہوا الم ناکی اور درد انگیزی کی دعائیہ کیفیت کا اضافہ حضرت زینبؓ اور اہل بیتؑ نے جس طرح اپنی حوصلہ مندی اور صبر و شکر کی مثالیں پیش کیں، اس کو انہوں نے اپنی ایک نظم ''بستے رہے سب تیرے بصرے کوفے'' میں پیش کیا ہے جو آگے چل کر نظم کے حصے میں ہم کو ملے گی، مجید امجد کا پیرایہ بیان بہت غیر رسمی اور تازہ ہے۔ ان کے یہاں احساس اور اظہار میں عجب سا اچھوتا پن ملتا ہے۔

وہ شام صبح دو عالم تھی جب بہ سرحد شام
رکا تھا آ کے ترا قافلہ ترے خیام
متاع کون و مکاں تجھ شہید کا سجدہ
زمین کربوبلا کے نمازیوں کے امام
یہ نکتہ تو نے بتایا جہان والوں کو
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل اک گام
سوار مرکب دوش رسولؐ، پورِ بتولؑ
چراغ محفل ایماں ترا مقدس نام

اور اسی انداز کا ایک شعر یہ بھی ہے

سلام ان پہ تہ تیغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم جو تیری رضا جو تو چاہے

منیر نیازی کی آواز میں صداقت و حقیقت ہے وہ انسان سے مخاطب ہے، اور معاشرے کے ایک فرد کے بطور اظہار خیال کرتا ہے، فرد سماج سے کٹ کر نہیں رہ سکتا اور انسانیت کی شناخت معاشرہ میں رہ کر ہو سکتی ہے، ''محسن'' میں ابو سفیان اصلاحی نے منیر نیازی کے سلسلے میں تحریر کیا ہے

''منیر نیازی کے یہاں انسان اور کائنات کی حقیقت واضح ہوگئی ہے یہ حقیقت ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے، منیر نیازی کے مجموعہ کلام ''تیز ہوا''، ''تنہا پھول''، ''جنگل میں دھنک''، ''دشمنوں کے درمیان شام''، ''ماہ منیر''، ''اس بے وفا کا شہر''۔

یہاں پر آفت زدہ شہروں کی وحشت اور آپسی کیفیت منیر نیازی کے سحر کار شعری وجدان سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ منیر نیازی عہد کی شاعری کرنے والوں سے زیادہ عہد کا شاعر نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کے اندر رہ کر ایک آفت زدہ شہر دریافت کیا ہے۔ منیر نیازی کا عہد منیر نیازی کا کوفہ ہے۔ اس سے شاعر کا اپنے اردگرد کے ساتھ گہرے رشتہ کا پتہ چلتا ہے۔ منیر نیازی کے یہاں اس نوع کی کیفیات حیرت انگیز طور پر کربلا کے حوالے سے جڑی نظر آتی ہے:

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
ان امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں
صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے

کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں

پس ایک ماہ جنون خیز کی ضیا کے سوا
نگر میں کچھ نہیں باقی رہا ہوا کے سوا
ہے ایک اور بھی صورت کہیں مری ہی طرح
اک اور شہر بھی ہے قریہ صدا کے سوا
''چھ رنگین دروازے'' یہ ہیں اردو میں''[1]

منیر نیازی کے شعری تجربے میں حیرت واستعجاب کی کیفیت ہے ہمارے موضوع کا مرکزی استعارہ ان کے یہاں ایک نئی تخلیقی کیفیت اور تازگی کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔ اس شعر میں وہ خدا کو عشق کے نام سے مخاطب کرتے ہیں اور امام حسینؑ کے ذکر میں عقائد جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ''دشمنوں کے درمیان شام'' کے یہ اشعار اسی کا اظہار ہیں۔

پھیلتی ہے شام دیکھو ڈوبتا ہے دن عجب
آسمان پر رنگ دیکھو ہوگیا کیسا غضب
کھیت ہیں اور ان میں اک روپوش سے دشمن کا شک
سرسراہٹ سانپ کی گندم کی وحشی گر مہک
اک طرف دیوار و در اور جلتی بجھتی بتیاں
اک طرف سر پر کھڑا یہ موت جیسا آسماں

منیر نیازی نے اپنے مجموعے ''دشمنوں کے درمیان شام'' کا انتساب بھی امام حسینؑ

---

[1] ''محسن'' ابوسفیان اصلاحی، صفحہ ۵۸، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے نام کیا ہے۔ایک غزل کے دو اشعار میں دیکھئے:

دل خوف میں ہے عالم فانی کو دیکھ کر
آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر

ہے باب شہر مردہ گذرگاہ بادشاہ
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر

زوال عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں
کھلا نہیں کوئی درباب التجا کے سوا

مکان زر لب گویا سہرو زمیں
دکھائی دیتا ہے سب کچھ یہاں خدا کے سوا

اسی دور کے ایک اور شاعر مصطفیٰ زیدی کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔جس کے یہاں نظریات وعقائد اس کی جدت پسندی کے باوجود جگہ جگہ سر اٹھائے ملتے ہیں۔شاعر کا دل اس سانحہ عظیم کی عظمت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔

گوپی چند نارنگ کی رائے میں:

''مصطفیٰ زیدی کا شعری وجدان شدید طور پر المیہ ہے،اور وہ تاریخی روایت سے فیضان بھی حاصل کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں تخلیقی ارتکاز کی کمی ہے وہ باصلاحیت شاعر تھے لیکن پر گوئی اور مشاقی نیز جوش ملیح آبادی کے حد سے بڑھے ہوئے اللہ نے انہیں نقصان پہنچایا۔[1]

مصطفیٰ زیدی کا ایک نامکمل مرثیہ ''کربلا اے کربلا'' بہت مشہور ہے جس کے چند

---

[1] ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ''،صفحہ ۵۹،گوپی چند نارنگ

اقتباسات ان کے آخری مجموعہ کلام ''کوہ ندا'' میں شامل ہیں، مصطفیٰ زیدی کے مجموعوں میں ''موج مری صدف صدف''، ''گریباں''، ''قبائے ساز''، ''روشنی''، ''شہر آزر''، اور ''کوہ ندا'' ہیں، ان میں جو اشعار ملتے ہیں ان کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا شعری وجدان شدید طور پر المیہ ہے، اور وہ اس تاریخی روایت سے فیض بھی حاصل کرتے ہیں ان کے یہاں زور بیان سلاست اور روانی تو ہے لیکن تہ داری نہیں ہے اس لئے وہ معنی و مطلب پیدا نہیں ہوتے جو دوسرے شعراء کے یہاں نمایاں ہیں۔ مصطفیٰ زیدی خون شہید کی اہمیت اس طرح بیان کرتا ہے۔

(سایہ)

اصولوں کی مظلومیت کون دیکھے
کسے اس کی جرأت کہ اس کربلا میں

(بازار)

اماموںؑ کا خوں در بہ در بہہ چکا ہے
رسولوں کے نقش قدم بک چکے ہیں

(کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ مدد دے)

لٹ گئی دولت ایمان و متاع عرفاں
کیسہ و منبر و محراب و کلیسا مدد دے
آج اولاد پہ ہے قحط ضمیر و جرأت
خون اجداد رسد! عزت آبا مدد دے
پیاس ایسی کہ زباں منہ سے نکل آئی ہے
کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ مدد دے

حلق اصغر کی طرف ایک کمان اور کھنچی
اے ہواؤں کے رخ اے گردش صحرا مددے
اک رسن اور بڑھی سوئے سکینہؑ ہوشیار
اک صلیب اور ہوئی در پہ عیسیٰ مدد ے
کس طرف سجدہ کروں کس سے دعائیں مانگوں
اے مرے شش جہت قبلہ و کعبہ مددے

نام حسینیت پہ سر کربلائے عصر
کس کا علم ہے کس کے علمدار دیکھنا
مجھ پر چلی ہے عین بہ ہنگامہ سجود
اک زہر میں بجھی ہوئی تلوار دیکھنا
ہر کوہ کن نے مصلحت شب شعار کی
نرغے میں ہے صداقت اقدار دیکھنا

''قبائے ساز'' میں کچھ اس طرح کے اشعار ہیں جو اسی استعارے سے تعلق رکھتے ہیں
اک موج خون خلق تھی، کس کی جبیں پہ تھی؟
اک طوق فرد جرم تھا کس کے گلے میں تھا؟

نظر میں عصر جواں کی بغاوتوں کا غرور
جگر میں سوز روایات لے کے آیا ہوں

افسانوں کے لطف کے پیچھے روتی ہوئی تاریخ
ظلم کی تلواروں کے نیچے مظلوموں کے گلے

ایسی سونی تو کبھی شام غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں اے تیر گئی صبح وطن

جرس گل نے کئی بار پکارا لیکن
لے گئی راہ سے زنجیر کی جھنکار مجھے

ناوک ظلم اٹھا دشنہ اندوہ سنبھال
لطف کے خنجر بے نام سے مت مار مجھے

الحزر خون بہاتے ہوئے آداب کرخت
الاماں تیر چلاتے ہوئے اخلاق سیاہ

میں تشنہ کام غم آگہی کدھر جاؤں
ادھر شعور کا صحرا ادھر نظر کا سراب

سلیم احمد پاکستان کے ایک مشہور شاعر ہیں ان کے بارے میں ابوسفیان اصلاحی نے لکھا ہے کہ

''جدید شعراء کی صف میں سلیم احمد ایک ایسا شاعر ہے جس کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی ہے''۔[1]

سلیم احمد کی شاعری ماضی، حال اور مستقبل کے لئے ایک پل ہے، سلیم احمد زمانے سے آنکھیں ملانے اور اور زمانہ کے ساتھ مل کر ماتم کرنے میں بڑا مخلص ہے، وہ غیر معمولی صلاحیت کا آدمی ہے۔ ان کے تین مجموعہ ہائے کلام ''اکائی''، ''بیاض''، اور ''چراغ نیم شب''، منظر عام پر آچکے ہیں۔ صدیوں سے چلی آنے والی روایتی غزل کو ایک نیا موڑ سلیم احمد نے دیا ہے۔ اب غزل حالات اور معاشرے کی سچی ترجمانی ہے۔ سلیم احمد کی نظمیں جدید شاعری میں اپنا الگ اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی غزل میں بھی اپنے آج کا درد موجود ہے۔ سلیم احمد تاریخ کلچر تجربہ اور شعور سے گذر کر لاشعور تک پہنچ کر پوری شخصیت میں سرایت کر جانے کے عمل کو شاعری کہتے ہیں۔

جدید تہذیب میں زمانہ کی علامت ایک دائرہ ہے اور جدیدیت دائرے کے سفر کو کہا جا سکتا ہے۔ سلیم احمد نے بھی اس دائرے میں سفر کیا ہے اور مذہب و کلاسکیت کا ساتھ چھوڑنا چاہ کر بھی نہیں چھوڑ سکے کچھ اشعار ان کے اسی لئے سانحہ کربلا کے استعاروں سے سجے ہوئے ملتے ہیں:

کیا بتاؤں کیوں ہوئی مجھ کو شکست
میرا دشمن تھا مرے لشکر کے بیچ

کون دفناتا اسے وہ اک برہنہ لاش تھی
سب نے پوچھا کون ہے وہ کون سے لشکر کا ہے

---

[1] ''محسن'' سالانہ رسالہ علی گڑھ یونیورسٹی۔ صفحہ ۴۸

جس طرح دریا بجھا سکتے نہیں صحرا کی پیاس
اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جایئے

غنیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

وہ مرا گرد کی مانند ہوا میں اڑنا
پھر اسی گرد سے پیدا مرا لشکر ہونا

تمام عمر کا حاصل سراب تشنہ لبی
مرا قصور یہی تھا کہ سوچتا تھا میں

طاق بے دیاروں کے بے چراغ ہیں کب سے
اک دیا جلا دینا شب کو شہر غربت میں

آدمی خود اپنے اندر کربلا ہو جائے گا
سارے جذبے خیر کے نیزوں پہ سر ہو جائیں گے

میری خون آلودہ آنکھوں نے یہ منظر بھی سہا
جو مرا ساتھی تھا بیٹھا تھا مرے قاتل کے پاس

اور کیا بتاؤں میں زندگی کی ظلمت میں
وہ چراغ روشن تھا آدمی کی صورت میں
سمندروں کو بھی لب تشنگان بے پروا
غرور تشنہ لبی سے سراب لکھتے ہیں

جعفر طاہر کی منظوم تمثیل ہفت کشور میں ایک پورا باب ''عراق'' پر ہے لیکن اس میں مختلف انداز سے حصوں میں بانٹ کر نظم کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے یہاں منظر نگاری بھی ہے اور الفاظ کی گل کاری بھی ہے اور تصویر کربلا واضح طور پر ابھری نظر آتی ہے۔

دعوت حق سے نہ بڑھ کر تھی وہاں کوئی خطا
آپ کیا پوچھتے ہیں سلسلہ جرم و سزا
دیکھئے معرکہ سامانی نمرود و خلیل
یہ چتا شعلوں کی فطرت کی یہ لالہ کاری
اک پیمبر کے مقابل میں خدائی ساری
کرب تخلیق نئی رت کی تڑپ پھول ہی پھول
اور نمرود کھڑا سوچ رہا ہو جیسے
جانے اب رنگِ جہانِ گزراں کیا ہوگا
قسمت کج کلہاں تاجوراں کیا ہوگا

شہرت بخاری بہر حال ایک غزل گو شاعر ہیں
''وہ اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں جہاں برہنہ خرف نہ گفتن کمال گویائی

سمجھا جاتا ہے، ان کے لہجے میں رچاؤ اور شائستگی ہے۔ وہ نہ طوفان اٹھاتے ہیں نہ کھل کھیلتے ہیں نہایت متانت اور وقار سے تھمے ہوئے لہجے میں دل کی بات کہتے ہیں۔ ان کی آواز ایک چوٹ کھائے ہوئے دردمند دل کی آواز ہے جس میں سماجی، سیاسی احساس تو ہے ہی کہیں کہیں صدیوں کی تاریخ کی گونج بھی شامل ہوگئی ہے۔"[1]

انسان کا تعلق ہر دور و عہد میں دو چیزوں سے رہتا ہے غم اور خوشی انسان کے جملہ افعال واعمال میں ان دو کیفیتوں کا عمل دخل ایک مسلم حقیقت ہے۔ خیر و شر، سکون و غارت گری اور بغاوت و بندگی کی تمام تاریخ اسی نقطہ کے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔ جسے عرف عام میں غم یا خوشی کہتے ہیں، یہی وہ بنیاد یا محور ہے جس سے انسان کی تعمیر یا تخریب وابستہ ہے۔ شہرت بخاری کے یہاں بھی جو اسلوب ہے ان میں سے ایک رنگ تعلق حزن وملال ہے۔ شہرت بخاری کے المناک احساس میں کوفہ کے تصور کو مرکزیت حاصل ہے۔

(دیوار گریہ)

لاہور کہ اہل دل کی جاں تھا
کوفے کی مثال ہوگیا ہے

تیار رکھو چراغ اپنے
سورج کو زوال ہوگیا ہے

ان کی مشہور غزل کے شعر ہیں

---

[1] سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ"، صفحہ ۶۳، گوپی چند نارنگ

کوئی یوسف نہیں اس شہر میں تعبیر جو دے
خواب آتے ہیں زلیخا کو مسلسل کیا کیا
جز حسینؑ ابن علیؑ مرد نہ نکلا کوئی
جمع ہوتی رہی دنیا سر مقتل کیا کیا
آباد پھر اک کرب و بلا ہو کے رہے گی
یہ رسم بہرحال ادا ہو کے رہے گی

اس صحرائے کرب و بلا میں عمر بسر کی ساری
پانی کی اب چاہ نہیں ہے، زہر پلا دے کوئی

اس شعر کی ایمانیت قابل غور ہے

آتا ہو سلیقہ جو کسی کو طلبی کا
کافر ہے جو سر دینے سے انکار کرے ہے

پھر وہی دشت، وہی دھوپ، وہی لو، ہوگی
یہ گھٹا پہلے بھی چھائی تھی کسے یاد نہیں

ایسی آندھی میں کہ سورج کا دیا گل کردے
تم نے اک شمع جلائی تھی کسے یاد نہیں

آل نبی پر تنگ ہے اب تک ہر کوفے کی بستی
پائے امیر شام پہ سجدہ عین عبادت ٹھہری
پھر کوئی حسینؑ آئے گا اس دشت ستم میں
پرچم کسی زینبؑ کی ردا ہو کے رہے گی

جی مارنا پروانوں کا ایمان بنے گا
روشن یہاں پھر شمع وفا ہو کے رہے گی

وہ جو مغضوب تھے اب درخور الطاف ہوئے
کون سے گوشے سے تابوت سکینہ نکلا

سنت آل نبیؑ کون کرے گا پوری
آج جس شہر کو دیکھا وہی کوفہ نکلا

آل علیؑ کا جیسے لہو سرد ہوگیا
بستی ہر ایک کوفہ و بغداد ہوگئی

ان شعراء کے بعد ہم ان شاعروں کا تجزیہ کریں گے جو نہ تو بالکل جدید ہی ہیں اور نہ ہی بالکل ترقی پسند بلکہ انہوں نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس میں وہ غزل کے روایتی حسن کے ساتھ ساتھ شاندار ماضی سے کٹ جانے کا احساس اور تخلیقی سطح پر اس کی بازیافت کی

آرزو رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ آسمان سے نئے رابطوں اور رشتوں کے لئے بھی سرگرداں نظر آتے ہیں یہ عمل اس لاتعلقی کے بعد شروع ہوتا ہے جب شاعر یہ محسوس کر لیتا ہے کہ ماضی بہرحال ماضی ہے اور اسے واپس لانا ناممکن ہے۔

ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مگر شاعری کے دائرے میں بندھ کر خطابت کرتا ہے، کربلا، کمان، سناں، تیر، دریا، خیمہ، زنجیر و طوق، ظلم و جبر، خیمہ یہ سب ماضی کے استعارے بھی ہیں اور ظلم و جبر کا منظر نامہ بھی انہیں علامتوں کے سہارے شاعر تشکیل دیتا ہے۔ احمد فراز نے رومانی اور غنائی شاعری کی سطح سے اٹھ کر جو احتجاجی شاعری کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا تازہ مجموعہ ''بے آواز گلی کوچوں میں'' قابل ذکر ہے۔ دبئی میں جشن فراز کے سلسلے میں نکلنے والے سوونیز میں ''احمد فراز اور ان کی نظم'' کے عنوان سے مضمون جناب ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ان کے تاثرات دیکھئے۔

> ''قلم کی ناموس اور انسان کی حرمت کا تحفظ ہی احمد فراز کی شاعری کا دستور العمل رہا ہے، لیکن اپنے شعری لہجے کے امتیازات کو پانے کے لئے انہیں بڑی ریاضت کرنا پڑی ہے، غزل ہو یا نظم شعری پیکروں کی نرمی اور سبک روی ان کے یہاں تازگی اور تاثر کی ایک نئی فضا پیدا کرتی ہے۔''[1]

یہ اشعار احمد فراز کی غزل کے ہیں جس میں شہر ناپرساں کی تصویر کشی ہے۔ حقیقی طور پر وہ کوئی شہر ہو لیکن ایمائی طور پر ہمارے تاریخی حوالے کی یاد دلاتا ہے۔

چاند رکتا ہے نہ آتی ہے صبا زنداں کے پاس
کون لے جائے مرے نامے مرے جاناں کے پاس

۱۔ چند تاثرات ''ڈاکٹر قمر رئیس، احمد فراز اور ان کی نظم۔ سوونیر جشن فراز ۱۹۸۸ء

چند یادیں نوحہ گر ہیں خیمہ دل کے قریب
چند تصویریں جھلکتی ہیں صف مژگاں کے پاس
شہر والے سب امیر شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریب شہر ناپرساں کے پاس

ہر کوئی طرہ پیچاک پہن کر نکلا
ایک میں پیرہن خاک پہن کر نکلا

اور پھر سب نے یہ دیکھا کہ اسی مقتل سے
میرا قاتل مری پوشاک پہن کر نکلا

ایک بندہ تھا کہ اوڑھے تھا خدائی ساری
اک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نکلا

نبھائی وضع بسمل انتہا تک
نہ مانگا قاتلوں سے خوں بہا تک

نہ جانے کیا ہوا زندانیوں کو
کہ بے آواز ہے زنجیر پا تک

اڑا کر لے گئیں ان موسموں میں
ہوائیں بے نواؤں کی ردا تک

اس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

احمد فراز کی ''جاناں جاناں'' میں کچھ اشعار اور نظمیں اسی استعارے سے تعلق رکھتی ہیں وہ اشعار یہاں پر تحریر کئے جا رہے ہیں:

جس کو دیکھو وہی زنجیر بہ پا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخل زنداں جاناں

صلیبوں پر کھنچے جاتے ہیں لیکن
کسی کے ہاتھ میں پرچم نہیں ہے

ہم دشت تھے کہ دریا ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

وقت نے وہ خاک اڑائی ہے کہ دل کے دشت سے
قافلے گذرے ہیں پھر بھی نقش پا کوئی نہیں
امکاں میں ہے تو بند و سلاسل پہن کے چل
یہ حوصلہ نہیں ہے تو زنداں کے در نہ کھول

اس طرح خوش ہو رہا ہوں جشن مقتل دیکھ کر
جس طرح ہر نوک خنجر پر لہو میرا نہ تھا

خنجر در آستیں ہی ملا جب کبھی ملا
وہ تیغ کھینچتا تو یہ سر بھی اسی کا تھا

پاکستان میں خواتین شاعرات کی بھی ایک ایسی تعداد ہے جنہوں نے شعر گوئی کے میدان میں نئی فکر اور نئے استعاروں کا سہارا لیا ہے۔ ان کی خدمات اردو ادب کا روشن باب بن چکی ہے۔ ان شاعرات میں ایک نام ''کشور ناہید'' کا ہے۔ وہ نہایت جیتی جاگتی اور حساس دل کی مالک ہیں۔

انہیں اپنے احساسات، جذبات، خیالات کو شعری قالب میں ڈھالنے کا بڑا عمدہ سلیقہ ہے۔ غزل گوئی میں انہیں مہارت حاصل ہے اب تک ان کی تصانیف ''لب گویا''، ''بے نام مسافت''، ''ایشیا کی لوک کہانیاں''، ''نظمیں''، ''گلیاں''، ''دھوپ اور دروازے'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ادب کے اس تاریخی حوالہ میں صرف شعراء نے ہی مشق نہیں کی ہے بلکہ شاعرات بھی اس راہ میں شعراء کے شانہ بہ شانہ گامزن ہیں، انہوں نے بھی وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور عصر نو کا کرب انہیں بھی کربلا کے مقتل میں لے چلتا ہے، کشور ناہید پاکستان کی معروف شاعرہ ہیں ان کے لہجہ میں غزل کی پاسداری کے ساتھ ساتھ بغاوت کا لہجہ بھی ملتا ہے۔

دشت بے محبت میں تشنہ لب یہ کہتے ہیں
سارے شہسواروں میں کون اب کے سر دے گا

باد بے جہت اب کے سارے گھر اجاڑے گی
کن کے سر قلم ہوں گے کون نقد سر دے گا

اب ہم اس شاعر کا ذکر کریں گے جس کے یہاں یہ شعری رجحان اس کے شعری شناخت نامے کا ناگزیر حصہ بن گیا ہے۔ ہماری مراد افتخار عارف سے ہے۔

افتخار عارف کے کلام کا تجزیہ کرنے سے قبل ان کی شخصیت پر کچھ تبصرہ:

افتخار نئی نسل کے شعراء میں سب سے سنجیدہ شاعر ہیں اور اپنے فن میں بڑی مہارت رکھتے ہیں محض روایات کو دوہرانے سے شعروادب کا بھلا نہیں ہوسکتا۔ لیکن باکمال لوگ اسی پرانی راہ پر چل کر نئے زاویے تلاش کرلیتے ہیں اور فن کار ایک رنگ کے مضمون کو سو طرح سے نباہتے ہیں اور اس طرح بہتر سے بہتر ادب کی تخلیق کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور افتخار عارف نے یہی کمال دکھایا ہے انہوں نے روایات کا ساتھ دینے کے باوجود ایک ایسی راہ اختیار کی جو منفرد ہے اور لوگوں کو فوراً متوجہ کرنے کی کشش رکھتی ہے ان کے مجموعہ کلام مہر دونیم میں فیض احمد فیض نے ان کے اور ان کی شاعری کے بارے میں کافی کچھ فرمایا ہے۔ یہاں پر ہم ان کے لفظوں کو پیش کررہے ہیں کہتے ہیں کہ

"افتخار عارف کے کلام میں میر و غالب سے لے کر فراق و راشد تک سبھی کی جھلکیاں موجود ہیں لیکن آپ نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی بلکہ لے اور آہنگ کی طرح کچھ ایسا ہی اجتہاد لغت اور محاورے میں بھی کیا ہے۔ موضوع کی رعایت سے کہیں کلاسیکی اور ادبی زبان کے شکوہ سے کام لیا ہے، تو کہیں روزمرہ کی بولی ٹھولی کو شعریت سے پیوند کیا ہے۔ حتیٰ کہ غزل جیسی کافر صنف میں بھی کچھ انفرادی برھت کی ہے۔ آج کل غزل سے جو دراز دستیاں کی جارہی ہیں ان پر توجہ دینے کے

بجائے غزل کے کبھی تلازمے برقرار رکھے ہیں لیکن نہ چلتی ہوئی بحروں کا سہارا لیا ہے نہ روندی زمینوں پر انحصار کیا ہے نہ لفظی چٹخاروں سے داد وصول کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بدل میں کم مستعمل بحریں استعمال کی ہیں اور نفس مطالب کو قافیہ بند کرنے کے بجائے غیر متوقع اور برمحل سلیقے سے شعر کو جگمگا دیا ہے''۔[1]

ان کی مہر دو نیم جدید ادب میں انہیں ایک معتبر مقام دلوانے کے لئے بہت کافی ہے۔ اب ہم ان کا کلام دیکھیں گے۔ افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس حوالے سے جو گہری مناسبت ہے اس کی نئی شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

ان کے اشعار صدیوں کے درد کا منظر نامہ بن جاتے ہیں اور ان میں وہ لطف و تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جسے خداداد کہا گیا ہے۔

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے
دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

---

[1] مہر دو نیم''، صفحہ ۴، پیش نامہ، فیض احمد فیض۔

بستی بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خواب پریشاں بھی مرا ہے

وارفتگی صبح بشارت کو خبر کیا
اندیشہ صد شام غریباں بھی مرا ہے
جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلہ بے سروساماں بھی مرا ہے

ویرانۂ مقتل پہ حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ یہ عنواں بھی مرا ہے

مٹی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی
یوں ہو تو یہ زنجیر یہ زنداں بھی مرا ہے

خلق نے یہ منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

افتخار عارف نے اس تاریخی حوالے سے فیض حاصل کیا ہے، اور اس سے گوناگوں شعری کیفیات ابھارنے کا ان کا شعری پیرایہ شدید انفرادیت رکھتا ہے۔

کہیں سے کوئی حرف معتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے

کسے معلوم اہل ہجر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت سر سے گذرے اور خبر شاید نہ آئے

سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا
وفا کے باب میں کار سخن تمام ہوا
مری زمین پہ اک معرکہ لہو کا بھی ہو

موج ہوائے شہر مقدر جواب دے
دریا مرے نہ تھے کہ سمندر مرا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے
اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں
سو میرے بعد مرا خوں بہا نہ مانگے کوئی

دمشق مصلحت و کوفہ نفاق کے بیچ
فغان قافلہ بے نوا کی قیمت کیا

اب بھی توہین اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے

مہر دو نیم کے شائع ہوتے ہی جدید شاعروں میں افتخار عارف نے اپنی شناخت سب سے الگ کر لی اوران کی انفرادیت فوری طور پر تسلیم کی جانے لگی۔

زرہ صبر سے پیکان ستم کھینچتے ہیں
ایک منظر ہے کہ ہم دم ہمہ دم کھینچتے ہیں
حکم ہوتا ہے تو سجدے میں جھکا دیتے ہیں سر
اذن ملتا ہے تو شمشیر دو دم کھینچتے ہیں

میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمت غنیم اور
مجھے اعتبار یسار کا نہ یمین کا

کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

نہ جانے خلق خدا کون سے عذاب میں ہے
ہوائیں چیخ پڑیں التجا کے لہجے میں

دکھ اور طرح کے ہیں دعا اور طرح کی
اور دامن قاتل کی ہوا اور طرح کی
دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے کچھ اور
دیتی ہے خبر خلق خدا اور طرح کی
بس اور کوئی دن کہ ذرا وقت ٹھہر جائے
صحراؤں سے آئے گی صدا اور طرح کی

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو
ثبوت محکمی جاں تھی جس کی روش ناز
اسی کی تیغ سے رشتہ رگ گلو کا بھی ہو

خیمہ صبر سے ٹکرا کے پلٹنے لگے تیر
اب انہیں سینہ قاتل میں در آیا جانیں

وہ عجیب رات تھی سارے شہر میں اک چراغ نہیں جلا
مگر اک لکیر لہو کی ایسی کھینچی کہ نور ہی نور ہے

مٹی تو سامنے کا حوالہ ہے اور بس
کوزے میں جتنے رنگ ہیں دریا کے دم سے ہیں

یہاں افتخار عارف کے تمام اشعار کسی نہ کسی انداز میں واقعہ کربلا اور امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کی مظلومیت اور بے کسی کی پوری تفصیل بیان کر دیتے ہیں۔ حقیقتاً ان کی شاعری کی شناخت ہی اس استعارے کا احساس دلاتی ہے۔

ادا جعفری کو جدید اردو شاعری کی ''خاتون اول'' کہا جائے تو غلط نہیں ہے۔ ادا جعفری کا پہلا مجموعہ کلام ''میں ساز ڈھونڈھتی رہی'' ۱۹۴۷ء میں مرتب ہوا اور ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے پیش لفظ میں حمایت علی شاعر صاحب نے لکھا ہے:

> ''جدید ادب وشعر کے معماروں کی صف اول میں ادا بدایونی کا نام اور کلام بہت نمایاں ہے، ان کے کلام میں قدیم اور فرسودہ نظام زندگی کے خلاف بغاوت کا ایک بے پناہ جذبہ کارفرما ہے۔ ان کی آواز سراپا طلب واحتجاج ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک ایسی قوت ارادی متشرح ہے۔ جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہوسکتا ہے''۔[1]

ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''شہر درد'' ہے، تیسرا مجموعہ کلام ''غزالاں تم تو واقف ہو'' اور چوتھا مجموعہ ''ساز سخن بہانہ ہے''۔ ادا جعفری نسائی جذبات کا اظہار کرتی ہیں، لیکن ایک حد کے اندر رہ کر اسے نمائش کا ذریعہ نہیں بناتی ہیں۔

ان کے لہجے میں ایسا یقین ہے اور آواز میں ایسی تمکنت ہے جو شاعر کے جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آجانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ ادا جعفری جو کچھ محسوس کرتی ہیں اسے ادبی قرینے سے پیش کر دیتی ہیں۔ غزلوں کے علاوہ نظموں میں بھی انہوں نے بہت اچھی شاعری کی ہے۔ یہاں ان کا غزلیہ کلام ہے جس میں کربلا کے استعاروں سے فیض اٹھایا گیا ہے۔

---

[1] ساز سخن''، حمایت علی شاعر

وابستگان دل تھے بہرحال جی لئے
دارورسن کے ساتھ روایت کی بات تھی
بہت حسین بڑی دل نشیں حقیقت ہے
جو تشنہ لب تھا وہی اعتبار دریا تھا

اک سلسبیل درد مرے ساحلوں پہ تھی
دریا میں موج موج مری تشنگی رہی

ہر غنچہ بڑے چاؤ سے کھلتا ہے چمن میں
ہر دور کا منصور سر دار چلے ہے

میں تو خود خالق و کوزہ گرو صناع بنی
شہر بانوں بھی مرا نام رہا مریم بھی

انساں رہا ہے عظمت انساں کا معترف
ذوق سجود و شوق عبادت کی بات تھی

(مسجد اقصیٰ)

قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزرگاہوں میں
لوٹنے والوں نے کیا عزم سفر بھی لوٹا

جدید اردو شاعرات میں ایک بہت ہی واضح اور معروف و معتبر نام ہے پروین شاکر۔ یہاں ان کا ذکر بے حد اہم ہے جس کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکے گا۔

پروین اردو کی ایک خوش اظہار شخصیت ہیں انہیں غزل اور نظم دونوں پر بھرپور ملکہ حاصل ہے۔ وہ استعاروں کو بڑے سلیقے سے استعمال کرتی ہیں۔ ان کے شعری اظہار میں خیال کی تازگی، نفاست اور شائستگی موجود ہے، اور کربلا کے حوالے کا رجحان ان کے یہاں نسائی احساس کے گہرے درد و کرب کے ساتھ ملتا ہے۔ واقعہ کربلا میں جو درد انگیز اور پر آشوب فضا ہے اس کا ذکر پروین شاکر نے خاص طور پر کیا ہے اور شام غریباں کا استعارہ ان کے یہاں بہت واضح ہے۔ کہیں کہیں وہ اپنے عہد کے المیے کا ذکر بھی کرتی ہیں اور عہد حاضر کے غموں میں تصور کرتی ہیں کربلا کے غموں کا اور اسی لئے وہ حرم کے غم و آلام کا ذکر بڑے سلیقے سے کرتی ہیں۔ کہیں پر وہ حضرت زینب کی بے چادری کا ذکر کرتی ہیں اور کہیں رسن بستگی کا کرب انہیں غم زدہ کر دیتا ہے اور اسی حوالے کے ساتھ ساتھ وہ درد و غم کا زہر پینے والی اور دکھوں کا بوجھ ڈھونے والی عورت کی ازل سے چلی آ رہی ستم زدگی کا ذکر کرتی ہیں۔ ''خوشبو'' اور ''صد برگ'' ان کے دو شعری مجموعے ہیں اور ماہِ تمام کلیات کی شکل میں ہے

پا بہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون
میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فرد جرم کو تحریر کون

(صد برگ)

کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے در خیمہ پہ اب تک صورت تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

یہاں غزل میں عورت پر کیے گئے ظلم و جبر کو کربلا کے استعاروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ اشعار بھی اسی رنگ کے ہیں اور یہاں بھی اپنے عہد کے کرب کو کربلا کے پس منظر میں دکھایا گیا ہے

ہم وہ شب زاد کہ سورج کی عنایات میں بھی
اپنے بچوں کو فقط کور نگاہی دیں گے

آستیں سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہل کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے

شہر کی چابیاں اعدا کے حوالے کر کے
تحفتاً پھر انہیں مقتول سپاہی دیں گے

خیمے نہ کوئی میرے مسافر کے جلائے
زخمی تھا بہت پاؤں مسافت بھی بہت تھی

وہ بھی سر مقتل ہے کہ سچ جس کا تھا شاہد
اور واقف احوال عدالت بھی بہت تھی

خوش آئے تجھے شہر منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

اور ''صد برگ'' کے یہ اشعار بھی اسی قبیلے کے ہیں یہاں بھی وہی کرب موجود ہے

جب بنام دل گواہی سر کی مانگی جائے گی
خون میں ڈوبا ہوا پرچم ہمارا دیکھنا

کسی بیمار کی بیعت میں روشن
ہماری گردنوں پر سرخ دھاری

اسیر کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

خود ڈھونڈھ رہا ہے آب حیواں
اور پیچھے قبیلۂ جاں بلب ہے

امید فاضلی پاکستان کے ایک منفرد شاعر ہیں ان کی شاعری کی موجیں ساحل حقیقت

سے ٹکراتی ہیں ان کے یہاں بیسویں صدی کی منحوستیں اور وحشت بڑے واضح انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ انہیں الفاظ پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ جدید غزل میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے، انہوں نے بہت سی نئی تراکیب ایجاد کی ہیں ان کے مجموعہ ہائے کلام ''دریا آخر دریا ہے''، ''سرفرات''، ''حرف جاں'' منظر عام پر آچکے ہیں بالخصوص انہیں غزل گوئی میں بڑی انفرادیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں بے پناہ کرب و درد اور شکست و ریخت پائی جاتی ہے۔ امید کی شاعری کی خصوصیت اس کی ذات کو کائنات سے اس طرح وابستہ کرتی ہے کہ اس کا انفرادی جوہر اجتماعی تجربے کو سمیٹے ہوئے ایک باطنی انفرادیت عطا کرتا ہے جو صرف انفرادیت تلاشنے والے حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کے چند اشعار یہاں پر دیئے جا رہے ہیں جن میں عصری آگہی اور کرب رونما ہیں:

سچائی نمو پاتی ہے مقتل کی زمیں پر
یہ فصل صحیفوں میں اگائی نہیں جاتی

خیمہ گاہ تشنگاں میں پیاس کی لہروں کے ساتھ
تیر دریا کی طرف سے رات بھر آئے بہت

سلام خانہ زہراؑ ترے چراغوں پر
بجھے ہیں شمع رسالتؐ کی روشنی کے لئے

یوں بھی لہو نے صورت اظہار پائی ہے
مقتل سے دل دھڑکنے کی آواز آئی ہے

جن کو نگہ دوست کے پیغام ملے ہیں
مقتل میں وہ باندھے ہوئے احرام ملے ہیں

سچ جب کھلا تو سر سے فقیہان شہر کے
نشہ اتر کے رہ گیا دستار کی طرح

زندگی کے دیوانوں سوئے کربلا دیکھو
عشق کس سلیقے سے زندگی میں ڈھلتا ہے

نکل کے جبر کے زنداں سے جب چلی تاریخ
نقاب اٹھاتی گئی قاتلوں کے چہروں کا

قاتل جسے بے مصرف سمجھے وہ خون بہا جب مقتل میں
مٹی میں ملا گلزار بنا دامن پہ گرا گفتار ہوا

پھر سوچ لو اے دشنہ گرو سنگ نژادو
سجتی ہے مرے جسم پہ زخموں کی قبا بھی

مقتل عشق میں سچائی نے
زخم کھائے ہیں رسولوں کی طرح

عالم تاب تشنہ پاکستان کے ایک اہم اور معروف شاعر تھے ان کا مجموعہ کلام ''آئینے کے اس طرف'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ وہ ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جہاں انسان اپنے مادی اور روحانی ربط کی تلاش میں ہے جو عہد نو کی افراط وتفریط میں کہیں کھو گیا ہے۔ مادی ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ آج رونما ہونے والا واقعہ کل تاریخ بن جاتا ہے۔ عالم تاب تشنہ کی شاعری سراپا جمال ہے ان کے یہاں جو انتشار بے چہرگی اور تجریدیت ملتا ہے وہ ہمارے عہد کے تضادات کا بھی مظہر ہے جو اپنے تخلیقی تصور میں عصری آگہی یا دانش حاضر سے مرعوب بھی نظر آتا ہے اور تضادات میں گم ہوا ملتا ہے۔ عالم تاب تشنہ فکر کی ان بلندیوں کو اجاگر کرتے ہیں جو نئی جہتوں اور نئی منزلوں سے آشنا کرے ان کا پہلا مجموعہ کلام ''موج موج تشنگی'' تھا اور نظموں اور گیتوں کا ایک اور مجموعہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کی شاعری ان کے ادراک کا وظیفہ اور مطالعہ ومشاہدہ کا مربوط اظہار ہے۔ چند اشعار ان کے اسی تاریخی حوالے سے متعلق ملتے ہیں ان میں کرب ودرد کے منظر نمایاں ہیں:

پہلے نصاب عدل ہوا ہم سے انتساب
پھر یوں ہوا کہ قتل بھی ہم کردیئے گئے

ہر دور میں رہا یہی آئین منصفی
جو سر نہ جھک سکے وہ قلم کردیئے گئے

سنان غم کی نوک سے کھنچا ہے خط آرزو
لہو کی نقش کاریاں ہیں زخم تازہ کار سے

کیا اسیری کا کریں غم کہ ہمیں تو تشنہ
جو نہ تھا پا بہ رسن وہ بھی گرفتار لگا

کربلا در کربلا ہوتا رہوں میں بھی شہید
اپنے خوں سے داستان خیر و شر لکھتا رہوں

کچھ جاں فروش آئے تھے مقتل میں سر بہ کف
ہر دست کج کلاہ سے تلوار گر گئی

ہم نے دیکھا ہے سیاست کا یہ حسن انصاف
جس پہ دستار سجی تھی وہی سر کاٹ دیا

لہو اجالوں کا ہے تیرگی کے خنجر پر
اندھیرے ٹوٹ پڑے روشنی کے لشکر پر

پہلے لہو لہان کیا ہم کو شہر نے
پھر پیرہن ہمارے علم کردیئے گئے

یہی ایک رسم ہے تشنہ سر دربار ستم
واجب دار ہے دستار کا سر پر ہونا

عبید اللہ علیم نوجوان شعراء میں ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں جدیدیت بڑے آب وتاب میں ملتی ہے۔ عبید اللہ علیم زندگی کے پر خار راستوں میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اضطراب، انتشار اور افتراق کے درمیان ہلکے ہلکے مسکرا رہا ہے۔ وہ حالات سے آنکھ نہیں میچتا بلکہ اسے اپنا مقدر تصور کرتا ہے۔ عبید اللہ کو زندگی ایک خواب نظر آتی ہے وہ اپنے خوابوں کی دنیا خوب سے خوب تر بنانا چاہتا ہے۔ خواب کو کائنات حتیٰ کہ ذات تصور کرتا ہے۔ یہی اس کے خواب اس کی تخیل ہیں۔ اس کے تخلیقی عمل کی بنیاد ہیں۔ اس کی شاعری ہیں خوابوں سے اس کی یہ گہری وابستگی بعض اوقات یہ شبہ کرتی ہے کہ وہ اصل زندگی سے کٹ کر اپنی ذات کے زنداں میں بند ہو گیا ہے۔ اور اس کے لئے سوائے اپنے کوئی چیز بامعنی نہیں ہے۔ عبید کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ''ویران سرائے کا دیا'' ۱۹۸۶ء ''چاند چہرہ ستارہ آنکھیں'' ۱۹۴۷ء اور بھی کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔ عجب بے فکر انسان ہے یہ شاعر لیکن عہد کا کرب اسے اپنے بے فکر مزاج سے خلاف ہو کر ایسے ماحول میں لے جاتا ہے کہ شاعر کو کربلا زندہ و جاوید نظر آنے لگتی ہے۔ شاعر نے اپنے عہد میں جا بجا کربلا کی محرومی و مظلومی کو محسوس کیا ہے۔

ابو سفیان اصلاحی نے عبید کے بارے میں اپنے تاثرات یوں درج کیے ہیں۔

''عبید اللہ علیم نوجوان شعراء میں ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں جدیدیت بڑے آب وتاب میں ملتی ہے'' [۱]

امام حسینؑ کے کردار کی عظمت اور سانحہ کربلا کے درد وغم اور کرداروں کی اخلاقی حد بندیاں یہ تمام خیالات اور جذبات نگاری کے پیرائے عبید اللہ علیم کی شاعری میں موجود ہے۔ اور تمام اشعار جن میں عظمت کربلا جگہ جگہ ملتی ہے۔ انہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر اس عصری سرمایہ سے فیض حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اشعار اس کے مظہر ہیں:

۱۔ محسن سال نامہ، صفحہ ۵۸، ابو سفیان اصلاحی، علی گڑھ

یار مرا زنجیریں پہنے آیا ہے بازاروں میں
میں کہ تماشہ دیکھنے والے لوگوں کے ماتم میں ہوں

تم لوگ وہ کہ چھوڑ گئے کربلا کے بیچ
ہم لوگ وہ کہ جن نے تمہیں معتبر کیا

ہر صدا آئی پر اس کی آواز
صرف تسلیم و رضا سے آئی

رکھو سجدے میں سر اور بھول جاؤ
کہ وقت عصر ہے اورکربلا ہے

اندھیرے میں عجب اک روشنی ہے
کوئی خیمہ دیا سا جل رہا ہے

اہل زمیں نے کون سا ہم پر ظلم نہیں ڈھایا
کون سی نصرت ہم نے اس کے ہات نہیں دیکھی

وہی دنیا وہی اک سلسلہ ہے تیرے لوگوں کا
کوئی ہو کربلا اس دیں کا رکھوالا فقط تو ہے

کوئی قاتل نہیں گذرا ایسا
جس کو تاریخ بچا کر لے جائے

دوستوں خونِ شہیداں کا اثر تو دیکھو
کاسہ سر لئے آئی ہے سحر تو دیکھو

صدیاں گذر رہی ہیں مگر روشنی وہی
یہ سر ہے یا چراغ سردار دیکھنا

اس قافلے نے دیکھ لیا کربلا کا دن
اب رہ گیا ہے شام کا بازار دیکھنا

آنکھ مظلوم کی خدا کی طرف
ظلم اک ظلمت کثیر کے ساتھ

زمین جب بھی ہوئی کربلا ہمارے لئے
تو آسمان سے اترا خدا ہمارے لئے

انہیں غرور کہ رکھتے ہیں طاقت و کثرت
ہمیں یہ ناز بہت ہے خدا ہمارے لئے

آج کی ہے جو کربلا کل پہ ہے اس کا فیصلہ
آج ہی آپ نے اگر جشن منالیا تو کیا

خاک شہدا نے ترے پرچم کو دعا دی
لہرا کے جو پرچم نے کہا جان گئے ہم

سلیم کوثر پاکستان کا ایک اچھا اور منفرد لب ولہجہ کا شاعر ہے۔ سلیم کوثر کی شاعری سچے لفظوں میں زندگی کی عکاسی کا نام ہے وہ جذبات کو ایسے لفظوں میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں جو سیدھے دل میں اتر جائیں شاعر کے مزاج میں ٹھہراؤ اور ایک پرسکون فضا ملتی ہے ان کے لہجے میں دھیما دھیما سرور چاندنی رات کی خنک فضا کا تصور پیدا کرتی ہے ان سب کے باوجود سلیم کوثر جدید شاعری کا ایک ایسا نام ہے جو اپنے عہد کے خلفشار کو محسوس کرتا ہے اور اسے لفظوں میں ڈھالنے کے لئے اسی تاریخی حوالے کا دامن تھام لیتا ہے، سلیم کوثر کے مجموعہ کلام ''ذرا موسم بدلنے دو'' ۱۹۸۹ء ''خالی ہاتھوں میں ارض وسما'' ۱۹۸۰ء اور کئی مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے لہجے میں کربلا بھرپور اظہار کے ساتھ گونجتی ہے۔ ادب صدیوں تک اس سانحہ عظیم سے فیض یاب ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

گروہ کشتگاں میں بچنے والے ایک ہم ہی ہیں
ہمارے سر میں سودا پاؤں میں زنجیر زندہ ہے

ادھر اعضا بکھرتے جارہے ہیں
ادھر دشمن کی تیاری بہت ہے

جسم پر زخموں کی اک فہرست لو دیتی ہوئی
اور پیشانی پہ سجدے کا نشاں اپنی جگہ

ایک صفحہ کہیں تاریخ میں خالی ہے ابھی
آخری جنگ سے پہلے تمہیں مہلت دوں گا

مرے خیموں میں راکھ اڑتی ہے اور میں
میان صحرا و دریا کھڑا ہوں

کوئی ابر تھا جو برس گیا کہیں دشت پر
کوئی آگ تھی کہ جو خشک کرگئی نہر کو

خیموں کی راکھ اجڑے ہوئے لوگ اور پیاس
زندہ دلان شام کی جاگیر کچھ تو ہو

آباد رہے زمین مقتل
ہم لوگ قطار میں کھڑے ہیں

غبار ہے کہ کوئی شہسوار آتا ہے
ادھر میان صف دشمناں گزرتا ہوا

جانے کس معرکہ صبر میں کام آجائیں
لشکری مارے گئے ایک ہمیں زندہ ہیں

وقت مقتل سے مری لاش اٹھا لایا تھا
لوگو! میں اپنی گواہی میں خدا لایا تھا

خیموں میں چراغ بجھ رہے ہیں
یہ وقت فرار کا نہیں ہے

دب گئی مال غنیمت ہی میں آواز جرس
کون خیموں سے یہ اسباب سفر لوٹتا ہے

دیکھو تو ذرا سخی سمندر
دریا سے خراج مانگتا ہے

مری صدا در آئندگاں پہ لکھی ہے
میں رفتگاں کی طرح چشم نوحہ گر میں ہوں

ہندوستان کے جدید لب ولہجہ کے شاعر ہیں عرفان صدیقی۔ ان کے یہاں جدید دور کے کرب وانتشار کے اظہار کے طور پر واقعہ کربلا کو خاص طور سے شامل کیا گیا ہے۔ اسعد

بدایونی کی رائے میں:

''عرفان صدیقی کی شعری کائنات کا احاطہ اگر صرف چند لفظوں میں کرنے کی کوشش کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ گم شدہ تہذیب و ثقافت کی باز آفرینی اور حال سے مثبت رابطے کی کوشش کے شاعر ہیں۔''[1]

لہجے کی شائستگی اور الفاظ کا انتخاب ان کے موضوعات کو انفرادیت بخش دیتا ہے۔ ان کے یہاں معاشرے کا کرب بھی ہے اور جدید لب ولہجہ امتیازی انداز بھی انہوں نے تاریخ کے اس عظیم سانحہ کو جسے موجودہ دور کے مسائل میں جذب کر دیا ہے۔ چنانچہ چند اشعار کی مثالوں سے اس رجحان کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

پانی پہ کس کے دست بریدہ کی مہر ہے
کس کے لئے ہے چشمہ کوثر لکھا ہوا

ہے خاک پر یہ کون ستارہ بدن شہید
جیسے ورق پہ حرف منور لکھا ہوا

نیزے سے ہے بلند صدائے کلام حق
کیا اوج پر ہے مصحف اطہر لکھا ہوا

اب جو چمکا ہے یہ خنجر تو خیال آتا ہے
تجھ کو دیکھا ہو کبھی نہر کنارے جیسے

---

[1] ''نئی غزل نئی آوازیں''، صفحہ ۱۰۵، ڈاکٹر اسد بدایونی

حضرت عباسؑ کا ذکر اپنے اشعار میں پیہم کرتے ہیں اور کہیں نیزے پر سر امام حسینؑ کے بلند ہونے کا منظر ان کی نظر میں رہتا ہے، عرفانؔ بنیادی طور پر جدید شاعر ہونے کے علاوہ اسی فکر و خیال کے حامی ہیں جس کے افتخار عارفؔ ہیں ان کی انفرادیت بھی اپنی جگہ برقرار ہے، ان کا مجموعہ کلام جس کا نام ''سات سماوات'' ہے جس کی اشاعت ۱۹۹۲ء میں ہوئی ہے، اس میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جس میں یہ شعری حوالہ ہر جگہ موجود ہے، بلکہ بڑی کثرت سے اس حوالے سے تعلق رکھنے والے اشعار ان کے یہاں موجود ہیں۔

فرض سے عہدہ برآ کوئی نہ ہونے پایا
سر تسلیم بھی چپ تیغ جفا بھی خاموش

خیمہ شب میں عجب حشر عزا برپا ہے
اور ابھی رات چراغوں نے اجالی بھی نہیں

تو نے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا
ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک

کوئی باشعور ذہن ان اشعار کو پڑھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان میں امام حسینؑ کی قربانی اور ان کی مقصدی موت اور شہادت عظمیٰ نے شاعر کے ذہن و فکر کو بے قرار رکھا ہے، اور وہ کہتا ہے

سروں کو ربط رہا ہے سناں سے پہلے بھی
گذر چکے ہیں یہ لشکر یہاں سے پہلے بھی

ہماری خاک پہ صحرا تھا مہربان بہت
ہوائے کوفہ نا مہربان سے پہلے ہی

نوک سناں نے بیعت جاں کا کیا سوال
سر نے کہا قبول، نظر نے کہا نہیں

شہر ہو میں ایک ویرانی کا لشکر صف بہ صف
ہر طرف تاراج بازار و سرا کرتا تھا رات

آج تک معرکہ صبر و ستم جاری ہے
کون جانے یہ تماشا اسے پیارا ہے کہ ہم

عرفانؔ صدیقی معرکہ صبر وظلم کا بیان کرتے ہیں اور کہیں صف بہ صف لشکر انہیں دکھائی دیتے ہیں شاعر کے ذہن میں یہ استعارے بہ کثرت موجود ہیں جنہیں شعری پیرائے میں ظاہر کرنا شاعر کی مجبوری ہے۔

گرمی شوق کا صلہ دشت کی سلطنت غلط
چشمۂ خوں کا خوں بہا جوئے رواں نہیں نہیں

خدا کرے صف سرداد گاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

ختم ہو جنگ خرابے پہ حکومت کی جائے
آخری معرکہ صبر ہے عجلت کی جائے

ہم نہ زنجیر کے قابل ہیں نہ جاگیر کے اہل
ہم سے انکار کیا جائے نہ بیعت کی جائے

یہاں پر شاعر اپنے عصری حالات کو کربلا کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ ہم نہ تو زنجیر کے قابل ہیں یعنی ہم میں صبر و برداشت کا مادہ بھی نہیں ہے اور ہم حکومت کے اہل بھی نہیں ہے تو ہم میں ایسے حوصلوں کا فقدان ہے کہ ہم نہ تو انکار ہی کر پاتے ہیں، اور نہ بزدلی کا ثبوت دیتے ہوئے ہم بیعت ہی کر پاتے ہیں عجب درمیانی کیفیت سے دوچار ہے انسان کا ذہن وہ کسی لائق ہونے کا تصور تک نہیں کرتا۔

میں نے کی تھی صف اعدا سے مبارز طلبی
تیر لیکن صف یاراں سے نکل کر آیا

منظر وہی پیکر وہی دیکھیں کوئی پیاسا بھی ہے
لشکر بھی ہے خنجر بھی ہے پہرا بھی ہے دریا بھی ہے

پیروں میں ہے زنجیر کیوں ہے خاک دامن گیر کیوں
رخصت بھی ہے مہلت بھی ہے ناقہ بھی ہے رستہ بھی ہے

پیاس نے آب رواں کو کردیا موج سراب
یہ تماشہ دیکھ کر دریا کو حیرانی ہوئی

شاعر نے امام حسینؑ کی تین روز کی پیاس اوران کے انصار کی قربانیوں کا ذکر کیا ہے اوراس شعری پیرائے میں اس سانحہ عظیم کو بارہا دوہرایا ہے

دور تک اڑنے لگی گرد صدا زنجیر کی
کس قدر دیوار زنداں کو پشیمانی ہوئی

تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آتے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمہاری شکل پہچانی ہوئی

طلسمات تھا شہ سواروں کا شہر
کہ زندہ جہاں لوگ مرنے کو تھے

ادھر تیر چلنے کو تھے بے قرار
ادھر سارے مشکیزے بھرنے کو تھے

ایک خیمہ زمیں پر کھجوروں کے نام
ایک نیزہ بلند آسمانوں کے نام

اے مرے طائر جاں کس کی طرف دیکھتا ہے
ناوک کور کماں کس کی طرف دیکھتا ہے

عرفان صدیقی نے واضح طور پر کہیں حضرت علی اصغرؑ کا پانی طلب کرنا منظر بند کیا ہے، اور کہیں امام حسینؑ کی بے بسی و مظلومیت دکھائی ہے۔

تری تیغ تو میری ہی فتح مندی کا اعلان ہے
یہ بازو نہ کٹتے اگر میرا مشکیزہ بھرتا نہیں

میں گر چکا تھا کہ نصرت کا راہوار لئے
مجھے مصاف سے کوئی نکالنے آیا

کم سے کم اب کسی شب خون کا خطرہ تو نہیں
کر دیا جلتے ہوئے خیموں نے صحرا روشن

روشنی میں لوگ اعلان وفاداری کریں
شمع گل ہوتے ہی سب چلنے کی تیاری کریں

ہم پہلے تشنگی کی حدوں سے گذر تو جائیں
سارے سراب آب بقا ہونے والے ہیں

سنو کہ بول رہا ہے وہ سر اتارا ہوا
ہمارا نام بھی جینے کا استعارہ ہوا

حنیف کیفی کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ ''چراغ نیم شب'' ۱۹۸۶ء ان کے اشعار میں ایسی توانائی ملتی ہے جو تعصبات و تحفظات سے آزاد قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے، حنیف کیفی شاعری کو ایک فن شریف سمجھتے ہیں اور اسے کسی طرح کی بھی آلودگی سے ملوث کرنا گناہ سمجھتے ہیں وہ نہ تو کھوکھلی روایت پرستی کرتے ہیں اور نہ ہی بے تکی جدت پسندی کا انہیں شوق ہے۔ زمانے کے ہم قدم چل کر وہ اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ اپنے متعلق حنیف کیفی نے ''چراغ نیم شب'' کے مقدمہ میں خود تحریر کیا ہے۔

''میرے نزدیک شاعری اپنی تلاش کا نام ہے میرے لئے یہ عرفان ذات کا راستہ بھی ہے اور انکشاف ذات کا دسیلہ بھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں صرف اپنی ذات میں محصور رہا ہوں اور اپنے داخل میں گم ہو کر خارج کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں'' [1]

انہوں نے ماورائے ذات بھی دیکھا ہے اور کائنات کا مشاہدہ بھی کیا ہے، وہ زمانے احوال و افکار سے متاثر ہوئے ہیں، وہ خود کو معاشرے کا ایک حصہ اور خود کو اپنے ماحول کا ایک فرد محسوس کرتے ہیں اسی لئے جب وہ اپنے عہد کے کرب میں ڈوبتے ہیں۔

تو پھر نہر فرات کے کنارے ابھرتے ہیں اور انہیں اس تاریخی حوالے کے بے مثل کرداروں کی ذات کا آئینہ اجالتا اور اپنے شعروں میں اس استعاروں کو ڈھالنا ایک اہم کام معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] چراغ نیم شب''، صفحہ ۹، حنیف کیفی

العطش کہہ کے چلا تھا کوئی پیاسا دریا
یہ صدا گونجتی ہے آج بھی دریا دریا

پانی کے پاس رہ کے بھی پیاسے ہیں کتنے لوگ
جاری ابھی روایت نہر فرات ہے

رہ سفر کی الٰہی یہ کیسی گردش تھی
اٹھا جہاں سے قدم لوٹ کر وہیں ٹھہرا

کربلا کی ریت دہراتا چلا
وہ سمندر تھا جو خود پیاسا چلا

گلہ ہر اک کو ہے تشنہ لبی کا
سمندر خشک ہوتا جارہا ہے

اگتے ہیں تو اگنے دو زباں پر مری کانٹے
رہ جائے نہ لیکن کوئی پیاسا مرے نزدیک

اک بوند کو لب میرے ترستے رہے کیفی
طوفان اٹھاتا رہا دریا مرے نزدیک

ہو جائے سرنگوں نہ کہیں غیرت طلب
خود داریوں کے ہاتھ میں تلوار دیجئے

شہریآر کی تصنیف ''خواب کا در بند ہے'' ۱۹۸۵ء شہریار کی شاعری میں روایت کی پاسداری کے باوجود جدید خیالات سماجی معاشی اور اخلاقی مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ سماجی، معاشی، اور اخلاقی اقدار میں ایک زبردست تبدیلی کی بنیاد پر فرد کو ایک قسم کی ناآسودگی یا اداسی بطور تحفہ ملتی ہے اور یہ اداسی شہریآر کے اشعار میں موج در موج مچلتی ہے، یہ اداسی اس رومانی اداسی سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ جو ماضی قریب کے شعری منظرنامے کا حصہ رہی ہے، لیکن کہیں کہیں اس قسم کی رومانی اداسی ان کے اشعار میں عیاں ہوتی ہے اور اس کے اظہار کے لئے وہ کربلا کو استعارہ بناتے ہیں:

حسینؑ ابن علیؑ کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

خموش رہنا ہے اے اہل درد یوں کب تک
رگ گلو میں چھپے گی یہ موج خوں کب تک

غرور تشنہ لبی بھی نہیں رہا باقی
سراب دیکھ کے آیا خیال دریا ہوں

دریا کے پاس دیکھو کب سے کھڑا ہوا ہے
یہ کون تشنہ لب ہے پانی سے ڈر رہا ہے

خوں میں لت پت ہو گئے سائے بھی اشجار کے
کتنے گہرے وار تھے خوشبو کی تلوار کے

راہ جیسے صلیب کا سایہ
نقش پا جیسے کوئی خنجر ہے

ایک مدت سے مری پیاس یہی سنتی ہے
انتظار اور سر چشمہ لب کرنا ہے

جدید شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اعتراف ذات کا برملا اظہار ملتا ہے، حساس اور ذہین فنکار اس موضوع کو الگ الگ ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ایک اور اسی عہد شاعری کے اہم نام ہیں وحید اختؔر ، وحید اختؔر نے غزل کے موضوعات میں ہم عصر زندگی کے مسائل کا اضافہ بھی کیا ہے۔مگر یہ اضافہ تو ناگزیر تھا کہ زندگی کے رواں دواں قافلے کی ضروریات اور محسوسات میں تبدیلی آگئی ہے۔فرد کے تعلق کی ایک غیر واضح اور پراسرار فضا ان کے کلام کا سب سے اہم وصف ہے۔لفظ کو نئے تلازمات کے حوالے سے برتنے کا سلیقہ بھی وحید اختؔر کے یہاں تمام تر تخلیقی قوت کے ساتھ نظر آتا ہے، ان کے یہاں لفظوں کی تراش خراش کے ساتھ ساتھ سچائیوں کا آئینہ آب دار شعروں میں اپنا پرتو چھوڑ گیا ہے شاعر نے اپنے عہد کے کرب و درد و غم کو کربلا کے حالات سے ملتا جلتا تصور کر کے کہا ہے کہ

فرات جیت کے بھی تشنہ لب رہی غیرت
ہزار تیر ستم ظلم کی کمیں سے چلے

وحید اختر کے مرثیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جس میں وہ میر انیس سے بھی غیر معمولی طور پر متاثر ہیں۔ لیکن غزلوں میں بھی اس عظیم سانحہ کے اشارے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

شہاب جعفری جدید شاعری کا ایک اہم نام ہے اور تمام جدید موضوع کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں بھی انقلاب وحق پسندی کے جذبے کے اظہار کے بطور کربلا واضح ہے۔ چند اشعار ان کے پیش ہیں:

سربلند اپنا لہو تھا سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر لے گئے

پھر سے لہو لہو درودیوار دیکھ لے
جو بھی دکھائے وقت وہ ناچار دیکھ لے

اپنے گلے پہ چلتی چھری کا بھی دھیان رکھ لے
وہ تیز ہے یا کند ذرا دھار دیکھ لے

ان اشعار میں واقعہ کربلا کے استعارے برمحل اور شعوری طور پر استعمال کئے گئے ہیں

محمد علوی جدید لب ولہجہ کا شاعر ہے اس کے یہاں وہ تمام الجھاؤ موجود ہیں جو جدید عہد کی پیداوار ہیں۔ ان کے لفظوں میں برہنگی اور کھلا پن ہے اور اپنے عہد سے حاصل صحرائی تشنگی ان کے اظہار میں حد درجہ شامل ہے لیکن اس کے باوجود وہ بہت کم ایسے اشعار کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک شعر یہاں درج کیا جا رہا ہے ان کے یہاں جدید لہجہ تو ہے لیکن درد وکرب کے ساتھ نہیں بلکہ خشکی ان کے لہجہ میں رچی ہوئی ہے اور برہنگی ان کے خیالات میں عہد نو کی زندہ لاش بے کفن کی طرح نظر آتی ہے۔

دل ہے پیاسا حسینؑ کی مانند
یہ بدن کربلا کا میداں ہے
کتنا مشکل ہے زندگی کرنا
اور نہ سوچو تو کتنا آساں ہے

مظفر حنفی کی شاعری میں جدت کے ساتھ ساتھ کرب تنہائی اور آبلہ پائی بھی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے عہد کی آلودگیوں کی گھٹن سے خوف و پژمردگی کا احساس کرتے ہیں، جہاں انتشار ہی انتشار ہے ذہنی سکون کا فقدان ہے، ایسے میں ماحول پراسرار پر خوف اور آسیب زدہ محسوس ہوتا ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری ایک لایعنی خوف کے حصار میں لپٹی نظر آتی ہے۔ ایسا خوف کہ انسان کو جہاں اپنے سائے سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ عقائد کی پامالی خوابوں کا شرمندہ تعبیر نہ ہونا اور نتیجتاً ذہنی خلفشار کا پیدا ہونا ایسے میں شاعری میں عجب اجنبیت کا احساس ابھرتا ہے اور اپنے آپ کو شاعر بھری پری دنیا میں بالکل تنہا محسوس کرتا ہے جیسے دشت نینوا میں حسینؑ ابن علیؑ تھے اور وہ بے ساختہ کہتا ہے۔

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا ظلم کو پہنچان جائے
خواہ اس کربوبلا کے معرکے میں جان جائے

آپ لاکھوں کی طرف میں ہوں بہتر کی طرف
تیغ چمکے گی بہرحال مرے سر کی طرف

زاہدہ زیدی اسی لب ولہجہ کی شاعرہ ہیں جو کہ جدید نسل نے عطا کیا ہے۔ انہوں نے

شعر گوئی کے میدان میں نئے سلسلے قائم کیے ہیں ان کی خدمات اردو ادب کا روشن باب بن چکی ہیں اور وہ نہایت جیتی جاگتی اور حساس دل کی مالک ہیں انہیں اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کو شعری قالب میں ڈھالنے کا بڑا عمدہ سلیقہ ہے۔ وہ ترقی پسند شاعری سے بھی وابستہ رہی ہیں اسی لئے ان کے یہاں باغی لہجہ میں اپنے عہد کے تمام درد کا اظہار موجود ہے، وہ انسان کے بے کراں دکھ کو کربلا کی عظیم قربانی اور مظلومیت کے ساتھ منسلک کر کے کہتی ہیں

نہ یہ حسینؑ اور نہ یہ مسیحا
بس ایک انسان عہد نو کا
برہنہ پا دشت کربلا میں
خود آپ اپنی صلیب اٹھائے

مصور سبزاوری کا نام جدید شعراء کی فہرست میں شامل ہے، ''مانجھی دھیرے چل'' اور ''برگ آتش سوار'' ان کے دو مجموعہ ہائے کلام ہیں تیسرا مجموعہ کلام ''رشتے ٹوٹنے کا موسم'' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ نئے انسان کی ہجرت معاشی تقاضوں کی لغت ہے، شکم کی آگ بجھانے کے لئے ہے۔ اس کا کوئی نصب العین یا کائنات کی فلاح و بہبود کا مقصد نہیں ہے۔ ویسے جدید شاعری کی ابھی عمر ہی کیا ہے آج کا فرد داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر اپنی ٹوٹی بکھری شخصیت لئے یوم حساب کا انتظار کر رہا ہے، سب سے بڑی بدنصیبی اس کی یہ کہ وہ خود اپنی روح میں جلاوطن ہے۔ اپنی معاشرت میں مہاجر ہے اس حساس ذی شعور جدید شاعر مصور سبزاوری کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ تمام تر بکھراؤ اور تناؤ کے باوجود نئے سے نئے فطری اور جذباتی رشتے تلاش کرنے کی لازوال امنگ رکھتا ہے۔ نئی علامتوں کے استعمال کے ساتھ نئی انسانی فکر اور انسانی تشخص کے کرب کو شائع کیا ہے۔ یہ غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ان کے ہاتھ میں جذبے

اور تاثر کی تلوار ہے۔ جس سے وہ میدان صاف کرتے بڑھتے چلے جاتے ہیں انہوں نے شاعری میں سانحہ کربلا کے استعاروں کا اکثر استعمال کیا ہے۔

نہ جانے کس کربلا کی جانب قدم برابر رواں دواں ہیں
سماعتوں کے کہر میں پھر روشنی کی تلوار گونجتی ہے

حسینؑ ہی تھا جو پیاسا اٹھا فرات سے وہ
لہولہان سمندر تھا اپنی ذات میں وہ

میں بے بصر ہوں مقدس سفر میں ہجرت کے
مرے بزرگ الم اور نشان دیکھتے تھے

یہ کیسی گرد اڑی تھی یہ شہسوار تھا کون
خلا میں سرنگوں سب آسمان دیکھتے تھے

جو گھر سے نکلی ہو کیا اس زکات سے لینا
حساب آب نہ نہر فرات سے لینا

بلند ظرفوں کو جھکتے سروں سے پہچانو
نسب ہمارے پھٹی چادروں سے پہچانو

عدم شناخت کے مقتل میں یہ تجسس کیوں؟
خود اپنی لاش تڑپتے سروں سے پہچانو

عظیم تر ہے جماعت سے انفرادیت
حسینؑ کو نہ بھرے لشکروں سے پہچانو

طلائی طشت میں نیزوں سے سر اترنے لگے
اب آسمانوں پہ ماتم اٹھا لئے جائیں

قناتیں عہد ریاکار کی کھڑی ہیں بہت
وفا کے کوفے سے پرچم اٹھالئے جائیں

فرات ہار کے ہم نے تو تشنگی جیتی
یہ سلسبیل یہ زم زم اٹھا لئے جائیں

وہ آخری غنیم تھا نصرت قریب تھی
اک نقش پا سے کیسا یہ لشکر ہوا طلوع

ایک شخص زد میں ہے سورجوں کے نیزوں کی
جسم تنہا پر لاکھوں برچھیاں نکلتی ہیں

دریا تھے جو خواب بجھ رہے ہیں
پیاسا ہوں سراب بجھ رہے ہیں

میں پیٹھ موڑلوں یہ فطرت حسینؑ نہیں
کھڑی ہیں میرے مقابل یہ کربلائیں مری

خیمہ ہائے تشنگی تک پہنچیں گے جب نصف ہاتھ
چھلنی مشکیزے کو پانی دیر تک یاد آئے گا

نہ بھیگے ہونٹ بھی کم ظرف دشت و دریا کے
کوئی حسینؑ لہو کی سبیل چھوڑ گیا

ریگ روانِ نہر سے منہ پھیر کر گذر
مشکیزہ ہے امام کا تیروں سے چھن کے چل

تھی ہراساں اک شکست فاش زخموں کے سفر سے
خون میں تر دشمنوں کی فتح کے نیزے گڑے تھے

تشنگی اور سرابوں کا اک فیصلہ کن محاذ اور ہے
آج بازو نہیں آج کٹ جائیں گے سارے سر دن ڈھلے

الجھ کے زغمہ اعدا کے قہر سے لوئے
ہے کوئی بھر کے جو مشکیزہ نہر سے لوٹے

ہے منصب آج معجز کا نوائے حرف حق بن کر
محاذ کربلا سے شام کے بازار تک جانا

ان شعراء کے یہاں واقعہ کربلا کے استعارے واضح طور پر موجود ہیں لیکن اردو شاعری کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں اس موضوع کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے نہ تمام شعراء کے اشعار سے مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ کسی شاعر کو اس سلسلہ کی فہرست سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ خاص کر جدید دور کے شعراء میں تو ہر ایک نے جیسے اسے لازمی سمجھ لیا ہے۔

جدید نظموں میں واقعہ کربلا کے اشارے

اردو میں نظموں کا وجود یوں تو عرصہ سے ہے مگر نظم جدید کا تصور مغرب کے اثر سے ہمارے ادب میں عام ہوا۔ نظم جب جدید نظم کے مرحلے میں داخل ہوئی، اس میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے کئی طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ہیئت کے اعتبار سے مروجہ ہیئتوں سے آگے بڑھ کر ترکیب بند اور ترجیع بند کے مرحلے تک تو ہمارے قدیم شعراء سے بھی آگے بڑھ کر ترکیب بند اور ترجیع بند کے مرحلے تک تو ہمارے قدیم شعراء بھی آ گئے تھے بعد کے شعراء نے معرّا اور آزاد نظموں کا اضافہ کیا۔ آزاد نظم کی صنف اس حد تک مقبول ہوئی کہ آج یہ ہیئت نظم کی مقبول ترین ہیئت ہو کر رہ گئی ہے نظم میں آج اظہار کے جتنے انداز جتنے فارم ہیں ان سے کہیں زیادہ نظم کی تفہیم اور اس پر تنقید کے نظریات اور اصول سامنے آ چکے ہیں۔ آج کی نظم میں کسی ایک تاثر یا تصور کو نظم کے قالب میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ نظم ایک مجسم طور پر کُل بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ بعض لوگ خیال کے ارتقاء اور کسی بھی غیر ضروری مصرعے سے اجتناب کرنے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ نظمیں جو انقلابی ہیں یا عوامی انقلاب کی راہ کو ہموار کرنے کے لئے کہی گئی ہیں عصری معنویت کے لحاظ سے ان کا درجہ خاصا بلند ہے۔ یقیناً انہوں نے عوام کو ان کی زبردست اجتماعی اور انقلابیوں کی قوتوں سے آگاہ کیا ہے۔ اس طرح ان نظموں میں افادیت کے ساتھ تاثیر پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔

ن م راشد، اختر الایمان، مجید امجد، منیب الرحمٰن، عزیز حامد مدنی، شاذ تمکنت، مصطفیٰ زیدی، کشور ناہید، وحید اختر، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض کے یہاں جو سیاسی و سماجی شعور ملتا ہے، وہ فیضؔ، مجازؔ، جذبیؔ، سردار جعفری، کیفی اعظمی، اور احمد ندیم قاسمی سے قطعی مختلف ہے۔ ان میں اکثر شعرا نے جدید انسان کی بے بسی اور ذات کے کرب کو بھی نظم کیا ہے۔

سیاسی معاشی و سماجی و اقتصادی صورت حال کی تبدیلی، علاقائی یا قومی و بین الاقوامی سیاقات کے تغیر زبان و بیان کے نئے تجربات و روایات کی نئی دریافتوں نے یقیناً ہمارے شعراء کے فکر و فن پر گہرے اثرات قائم کئے ہیں اب موضوع اور اسلوب کے تصورات بھی کافی حد تک بدل چکے ہیں۔

جدید نظم کا تصور سب سے پہلے میراجی نے پیش کیا، لیکن میراجی کے مقابلے میں ن م راشد کی مقبولیت اس لئے زیادہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں کو محض ذات کے اظہار کا پابند نہیں بنایا۔ راشد کا آہنگ زیادہ خطیبانہ اور متشدد ہے۔

پارۂ نان جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
ہیں مرے دوست، مرے سینکڑوں ارباب وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول
بس ایک زنجیر
ایک آہنی کمند عظیم
پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے ایک کنارے سے دوسرے تک
میرے وطن سے تیرے وطن تک

(ن م راشد) [من و سلویٰ]

آزادی کے بعد شعراء کی نظموں میں سیاست کی طرف جھکاؤ واضح بلکہ اظہار میں بڑی شدت پیدا ہوئی ہے۔ ان شعراء کے یہاں انفرادیت کی تلاش وذات کی تلاش کا پہلو بھی روشن ہے۔ میرا جی کے علامتی نظام اور ہندی کی آمیزش نے بھی انہیں عام پڑھنے والے سے دور رکھا ہے۔

فیض، ن م راشد اور میرا جی کے مقابلے میں اس لئے پسند کئے جاتے ہیں کہ ان کی شاعری کی کائنات ان ہی الفاظ اور علامتوں کے بدلے ہوئے رخ پر قائم ہے۔ جو ہمارے اندر رچ بسے ہیں۔ میرا جی نے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۴ء کے درمیان ان راستوں کو ہموار کیا تھا دوسرے جن پر چلنے کا ارادہ تو کیا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہیئت کے جن تجربات سے میرا جی اس وقت گزرے وہ ان کی اپنی ذہنی اپج تھی۔ جدید نظم اب چاہے جتنی فعال ہو جائے چاہے جتنی ترقی کر لے لیکن علامت اور ہئیت کے لئے ہمیشہ میرا جی کی ممنون کرم رہے گی۔ میرا جی یقیناً نئے آنے والوں کا ہمسفر ہے۔ اس سے سچی اور کھری بات اب تک شاعری میں نہیں کہی گئی ہے۔ میرا جی اپنی تمام جنسیت کے باوجود نئے لکھنے والوں کے ہمراہ قدم بہ قدم بڑھنے والا شاعر ہے۔ میرا جی زندگی کی شاخ سے ٹوٹا ہوا جدید نظم کا وہ سبز پتہ تھے جنہوں نے اپنے جیتے جی وہ کارنامے انجام دیئے کہ جدید نظم اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکی۔ ان کی نظموں میں جنسیت کے عناصر حد درجہ پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں ہم نے اکثر پڑھا ہے لیکن کہیں کہیں علامات واستعارے کا سہارا لے کر وہ مذہب وعقائد کے اثر کو شعروں میں ڈھال دیتے ہیں اور تب ہمیں اپنے تاریخی حوالے کا عکس جگہ جگہ نظر آنے لگتا ہے۔ جہاں تک واقعہ کربلا کے اثرات کا تعلق ہے۔ میرا جی کی نظموں میں ان کی تلاش فضول ہے۔

مصطفیٰ زیدی قلم کا مجاہد ہے عصر نو کا یہ لہجہ جدید اپنی شناخت اپنے شعروں کو سمجھتا ہے۔ اردو شاعری نے جدید شعراء میں مصطفیٰ زیدی کو عظیم شاعر کا درجہ دیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی غضب کا ذہین شاعر ہے۔ وہ ایسا شاعر ہے جو ماضی حال اور مستقبل کے لئے ایسا لمحہ پیدا کرتا ہے جو

صدیوں پر بھاری ہے۔ مصطفیٰ زیدی حالات اور معاشرے کی سچی ترجمانی کرنا اپنا فرض تصور کرتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ قدرت نے اس کے ہاتھ میں قلم اس لئے تھمایا ہے کہ وہ حق بات لکھ سکے اور اسے منفرد لہجہ و خیال قدرت نے اس لئے عطا کیا ہے کہ وہ حق کی حمایت کر سکے تو یہ حق گوئی اور حق پسندی اپنے عہد سے بغاوت کے تحفے میں اسے عطا ہوئی ہے۔ اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی لئے کربلا جو کہ حق و باطل کا ایک بے حد عظیم واقعہ ہے اس کے استعارے قائم و دائم ہیں اس لیئے وہ مصطفیٰ زیدی کی نظموں میں برملا نظر آتے ہیں ان کی ایک نظم ''سایہ'' کے کچھ حصے یہاں پر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں۔

(سایہ)

سنا ہے عالم روحانیاں کے خانہ بدوش
سحر کی روشنیوں سے گریز کرتے ہیں

سحر نہیں ہے تو مشکل کا آسرا لاؤ
لبوں پہ دل کی سلگتی ہوئی دعا لاؤ
دلوں کے غسل طہارت کے واسطے جاکر
کہیں سے خون شہیدان نینوا لاؤ

ان کی ایک اور نظم کا ایک شعر اسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔

(کارواں)

اسی طرف سے زمانے کے قافلے گذرے
سکوت شام غریباں کے خلفشار میں گم

ذرا سی آگ خموشی کے دوش پر لرزاں
ذرا سی بوند پہ اسرار آبشار میں گم

اسی طرح مصطفیٰ زیدی کی ایک اور نظم میں جب نظم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے تو وہ اس حوالے کو تحریر کرنے لگتے ہیں یہاں کرب عصر موجود ہے۔

(سفر آخر شب)

ہزار دشت پڑے لاکھ آفتاب ابھرے
جبیں پہ گرد پلک پر نمی نہیں آئی
کہاں کہاں نہ لٹا کارواں فقیروں کا
متاع درد میں کوئی کمی نہیں آئی

مصطفیٰ زیدی نے اپنے عہد کے کرب کا اظہار ایک نظم میں کیا ہے، اس نظم میں شاعر اپنے شہر کی حالت پر دل فگار ہو رہا ہے، اور اسے نئی روشنی نئے افکار کی تلاش بھٹکا رہی ہے نظم کا عنوان ہے ''بے سمتی'' لیکن نظم کے ایک حصے کی شاعری ہمارے تاریخی حوالے کے انہیں استعاروں پر مبنی ہے۔

(بے سمتی)

یہ قطرے قطرے پہ اعلان قلزم و جیحوں
ذرا ذرا سی نمی پر امید زرخیزی
یہ دشت بے سروساماں! یہ آفتاب! یہ لو
مرے وطن مرے مجبور تن فگار وطن
میں چاہتا ہوں تجھے تیری راہ مل جائے

میں نیویارک کا دشمن نہ ماسکو کا عدو
جلے جلائے کلیسا لٹے لٹائے حرم
طلوع ہو تو کدھر سے نئی سحر کا گجر
سکوت طوق بہ دست و صدا رسن بہ گلو

مصطفیٰ زیدی کہیں کہیں اقبال کے لہجے میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں جیسے ان کی ایک نظم کے کچھ حصے دیکھئے نظم بہ عنوان

(ایک گمنام سپاہی کی قبر پر)

اسی محراب کے سائے میں کئی ابن علیؑ
کئی خونخوار یزیدوں سے رہے گرم ستیز
تیرے مسلک میں ہوئی نام و نسب کی توقیر
تیرا ہیرو کوئی خسرو ہے تو کوئی پرویز

اور اسی نظم کے یہ اشعار بھی اسی قبیلے کے ہیں

(مصطفیٰ زیدی) قبائے ساز

تجھ سے ممکن ہو تو اے ناقدِ ایام کہن
اپنے گمنام خزانوں کو اٹھا کر رکھ لے
رات بے نام شہیدوں کے لئے روتی ہے
ان شہیدوں کا لہو دل سے لگا کر رکھ لے

مصطفیٰ زیدی نے کربلا کو اپنے شعری احساس میں سمو کر جذب کر دیا ہے۔ اسی لئے

ان کے اشعار درد و غم کی تصویر نظر آتے ہیں یہ اثر آفرینی واقعہ کربلا کا ہی تصدق ہے۔
مصطفیٰ زیدی کی ایک نظم کا اقتباس یہاں درج ہے۔

(تہدیہ)

زمیں کے کرب میں شامل ہوا ہوں راہ رود
فقیر راہ کی سوغات لے کے آیا ہوں
نظر میں عصر جواں کی بغاوتوں کا غرور
جگر میں سوز روایات لے کے آیا ہوں
بہت سے آئے ہیں تیری گلی میں لیکن میں
سوال عزت سادات لے کر آیا ہوں

(دیکھنا اہل جنوں)

دیکھنا اہل جنوں ساعت جہد آپہنچی
اب کے توہین لب دار نہ ہونے پائے
دشت میں خون حسینؑ ابن علیؑ بہہ جائے
بیعت حاکم کفار نہ ہونے پائے
یہ نئی نسل اس انداز سے نکلے سر رزم
کہ مورخ سے گنہ گار نہ ہونے پائے

ایک اور نظم جو براہ راست دعائیہ پیرائے میں پیش کی گئی ہے

(کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ مدد دے)

لٹ گئی دولت و ایمان و متاع عرفاں
کیسہ و منبر و محراب و کلیسا مدد دے

آج اولاد پہ ہے قحط ضمیر و جرأت
خون اجداد رسد عزت آبا مددے
پیاس ایسی کہ زباں منہ سے نکل آئی ہے
کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ مددے
علی اصغر کی طرف ایک کمان اور کھینچی
اے ہواؤں کے رخ اے گردش صحرا مددے
اک رسن اور بڑھی سوئے سکینہ ہشیار
اک صلیب اور ہوئی درپے عیسیٰ مددے
کس طرف سجدہ کروں کس سے دعائیں مانگوں
اے مرے شش جہت قبلہ و کعبہ مددے

(بنام ادارہ لیل و نہار)

نام حسینیت پہ سر کربلائے عصر
کس کا علم ہے کس کے علمدار دیکھنا
مجھ پر چلی ہے عین بہ ہنگامہ سجود
اک زہر میں بجھی ہوئی تلوار دیکھنا
ہر کوہ کن نے مصلحت شب شعار کی
نرغے میں ہے صداقت اقدار دیکھنا

اور ایک نظم بہ عنوان کربلا پیش ہے

(کربلا)

کربلا میں تو گنہ گار ہوں لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزندی کی
جسم سے روح سے احساس سے عاری کیوں ہیں
ان کی مسمار جبیں ان کے شکستہ تیور
گردش حسن شب روز پہ بھاری کیوں ہیں
تیری قبروں کے مجاور ترے منبر کے خطیب
فِلس و دینار و توجہ کے بھکاری کیوں ہیں
غیر تو رمز غم کون ومکاں تک پہنچے
کربلا تیرے یہ غم خوار کہاں تک پہنچے
دل کو تہذیب تمنا میں خدا ملتا ہے
جنبش یک لب عیسیٰ میں خدا ملتا ہے
شور ناقوس و نظارا میں خدا ملتا ہے
سنگ محراب و کلیسا میں خدا ملتا ہے
تیرے دیوانوں کو اے شاہد دریائے فرات
اپنی بے مائیگی ذہن میں کیا ملتا ہے

مجید امجد کی نظموں سے اسی رجحان کے تحت ایک نئی ذیلی تخلیقی کیفیت کا اضافہ ہوا ہے۔ درد اور غم الم ناکی اور درد انگیزی کی دعائیہ کیفیت ان کے یہاں ملتی ہے۔ مجید امجد کی نظموں میں ایک دھیمی دھیمی آنچ اور گداز کی موجودگی کا احساس قاری کو ہوتا ہے۔ شاید مجید امجد کے شعری

وجدان کو دھیمی اور المناک فضا سے خاص مناسبت تھی۔ ایک دبی ہوئی ٹیس اور بجھے ہوئے درد کی فضا کا احساس ان کے یہاں ملتا ہے۔ جس طرح اقبال نے کردار حسینؑ کی عظمت کی شعری بازیافت کی اور اردو شاعری میں اس حوالے سے تخلیقی اظہار کی ایک نئی راہ اختیار کی اسی طرح ان کے ایک نسل کے بعد مجید امجد نے اپنی نظموں میں وہی انداز اختیار کیا اور اس تخلیقی کیفیت کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ ان کی ایک نظم جو ہمارے موضوع پر ہی ہے۔ ہیئت، اظہار، معنی، ہر اعتبار سے یہ منفرد انداز کی نظم ہے۔ اس کا بنیادی انداز ایک دعا کی طرح ہے۔ لیکن پوری فضا ہمارے تاریخی حوالے کربلا کے پس منظر میں قائم ہے۔ اس میں انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا ہے، لیکن اس میں حمدیہ، نعتیہ دونوں انداز پائے جاتے ہیں اس میں زمین سے جڑی ان کی عقیدت واضح طور پر عیاں ہے۔ ان کی ایک نظم ''چہرہ مسعود'' میں اس کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ ایک دوسری نظم ''بستے رہے'' میں بھی اس موضوع سے متعلق مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

بستے رہے سب تیرے بصرے، کوفے
اور نیزے پر بازاروں، بازاروں گذرا

منیر نیازی ایک معروف شاعر ہیں، شاعری میں انہوں نے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے۔ انہوں نے جو آواز بلند کی ہے، اس میں صداقت اور حقیقت ہے۔ ان کی آواز انسان سے مخاطب ہے کائنات سے مخاطب ہے۔ اور کہیں وہ خود سے بھی مخاطب ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ وہ معاشرے میں صرف ایک فرد ہے اور فرد سماج سے کٹ کر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ انسانیت کی شناخت معاشرہ میں رہ کر ہو سکتی ہے۔ منیر نیازی کے یہاں انسان اور کائنات کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''تیز ہوا''، ''تنہا پھول''، ''جنگل میں دھنک''، ''دشمنوں کے درمیان شام''، ''ماہ منیر''، ''اس بے وفا کے شہر''، ''چھ رنگین

دروازے'' ہیں۔ ان کے شعری تجربے میں حیرت اور استعجاب کو بہت دخل ہے، ان کا شعری وجدان ہر چیز کو ایک طلسماتی رنگ میں دیکھتا ہے، ان کے یہاں ہمارے موضوع کا مرکزی استعارہ ایک نئی تخلیقی کیفیت اور تازگی کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔ ایک نظم میں اس طرح اس حوالے کا پس منظر ہے کہ ذہن بے ساختہ اسی طرف مڑ جاتا ہے۔

(ایک بہادر کی موت)

زخمی دشمن حیرت میں ہے
ایسا بھی ہوسکتا تھا
اس کو شاید خبر نہیں تھی
اب وہ گہری حیرت میں ہے

آسمان پر رب ہے اس کا اور صدائیں یاروں کی
آس پاس شکلیں ہیں اس کے لہولہان سواروں کی
دل میں اس کے خلش ہے کوئی، شاید گئی بہاروں کی
کھیل ذرا ہونی کے دیکھو اور جفا غداروں کی
فتح کے بدلے موت ملی اسے گھر سے دور دیاروں میں

منیر نیازی نے اپنے مجموعہ کلام ''دشمنوں کے درمیان شام'' کا انتساب ہی امام حسینؑ سے کیا ہے۔ آفت زدہ شہروں کی دہشت اور آسیبی کیفیت منیر نیازی کے سحر کار شعری وجدان سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ منیر نیازی عہد کی شاعری کرنے والوں میں سب سے زیادہ عہد کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ ان کا عہد ان کے لئے کسی کوفے سے کم نہیں ہے۔ شہر کا درد انہیں کربلا

کے استعاروں کی طرف لے جاتا ہے۔

جعفر طاہر بھی اسی قبیلے کا ایک فرد ہے جسے عہد کے کرب نے کربلا کے دشت میں پہونچا دیا ہے۔ جعفر طاہر کی منظوم تمثیل ہفت کشور میں ایک پورا باب ''عراق'' پر ہے۔ انہوں نے اس میں مختلف حصوں میں بانٹ کر نظم کو آگے بڑھایا ہے۔ کہیں وہ کوفے کے آثار دیکھتے ہیں کہیں انہیں نینوا نظر آتی ہے۔

دعوت حق سے نہ بڑھ کر تھی وہاںؑ کوئی خطا
آپ کیا پوچھتے ہیں سلسلۂ جرم و سزا
دیکھیئے معرکہ سامانیٔ نمرود و خلیل
یہ چتا شعلوں کی فطرت کی یہ لالہ کاری
اک پیمبر کے مقابل میں خدائی ساری
کرب تخلیق نئی رت کی تڑپ پھول ہی پھول
اور نمرود کھڑا سوچ رہا ہو جیسے
جانے اب رنگ جہان گزراں کیا ہوگا
قسمت کج کلہاں تاجوراں کیا ہوگا

ایسا لگتا ہے کہ جدید شعراء کا ذہن لاشعوری طور پر اقبال کے لہجے سے بہت متاثر ہوا ہے اسی کربلا کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ اسی طرح کا ہوجایا کرتا ہے۔

احمد فراز کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نت نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر رہی ہے۔ انہوں نے ظلم و جبر و استحصال کی سفاک طاقتوں کے مقابلے میں اپنے ستم کیش کوچہ میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ قید تنہائی کے اذیت ناک

دن بھی گذارے اور فیض کی طرح جبری ہجرت بھی اور آوارگی کے ایام بھی بسر کیے۔ قلم کی ناموس اور انسان کی حرمت کا تحفظ ہی احمد فراز کی شاعری کا دستور العمل رہا ہے۔ لیکن اپنے شعری لہجے کے امتیازات کو پانے کے لئے انہیں بڑی ریاضت کرنا پڑی ہے۔ غزل ہو یا نظم شعری پیکروں کی نرمی اور سبک روی ان کے یہاں تازگی اور تاثر کی ایک نئی فضا پیدا کرتی ہے اور اس لطیف لیکن گھنی فضا میں قاری کو شاعر کے تجربوں میں اس کی گہرائی معلوم ہوتی ہے۔

گلاب سے جسم اپنے خون میں نہا چکے ہیں
ہوائے جانکاہ کے بگولے
چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں
مسافران رہِ وفا لٹ لٹا چکے ہیں
اور اب فقط تو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارہ صبح کی طرح روشنی کا پرچم لئے کھڑا ہے
یہ ایک منظر نہیں ہے اک داستاں کا حصہ نہیں ہے
اک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
میں آج اسی کربلا میں بے آبرو نگوں سر شکست
خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی حسینؑ کل سرخرو ہو گیا ہے
میں جاں بچا کر فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسماں کے سارے عز و فخر سارے

حرام مجھ پر

وہ جاں لٹا کر منارۂ عرش چھو گیا ہے

سلام اس پر

سلام اس پر

(صفحہ ا، جاناں جاناں، احمد فراز)

اس نظم میں احمد فراز اپنے عہد کے انسان کی پستی پر طنز کرتے ہوئے حسینؑ کی شہادت کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں اور اپنی عقیدت کو سلام کی طرح پیش کر رہے ہیں۔ احمد فراز کا ایک اور سلام ہم یہاں پر پیش کر رہے ہیں۔

حسینؑ تجھ پہ کہیں کیا سلام ہم جیسے

کہ تو عظیم ہے بے ننگ و نام ہم جیسے

یہ بے کلیم جوہر کربلا کی زینت ہے

یہ سب ندیم یہ سب تشنہ کام ہم جیسے

خطیب شہر کا مذہب ہے بیعت سلطاں

ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے

تو سر بریدہ ہوا شہر ناسپاساں میں

زباں بریدہ ہوئے ہیں تمام ہم جیسے

احمد فراز کی ایک نظم (میں اکیلا کھڑا ہوں) کا آخری حصہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اے روشنی کے پیمبر

یہ شوریدہ سر حرف زن ہے

کہ محراب و منبر سے فتوہ گروہ فتنہ پرداز دیں
حرف حق بیچتے ہیں
فقیہان مسند نشیں حرص دینار و درہم میں
تیرے صحیفے کا اک اک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں
پیمبر مجھے حوصلہ دے کہ میں ظلم کی قوتوں سے اکیلا لڑا ہوں
کہ میں اس جہنم کدے میں اکیلا کھڑا ہوں

افتخار عارف کی نظموں میں خوف کے موسم کی کیفیت ہے، جبر کی دہشت ہے، جس نے روح کو جکڑ لیا ہے۔ عذاب دربدری بے گھری اور بے زمینی کے پیکر نظموں میں بھی بار بار ابھرتے ہیں۔ افتخار عارف جھوٹی بشارتوں کی ضمانت نہیں دیتے وہ دیکھتے ہیں کہ آرزومند آنکھیں بشارت طلب دل اور دعاؤں کو اٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہے کہ جب کبھی رنگوں، خوشبوئں، اڑانوں، آوازوں اور خوابوں کی توہین کی جائے گی عذاب زمینوں پر آتے رہیں گے۔ اسے دکھ ہے کہ اہل اعتبار کتنے بدنصیب ہو گئے ہیں کیوں کہ ان سے قرض آبرو بھی ادا نہیں ہوتا اور شاعر اپنے شعروں میں یہ درد اتار دیتا ہے۔ اکثر موقع پر شاعر چاہتا ہے کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں لیکن اسے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کیوں کہ انسان پابرہنہ سر کوچہ احتیاج رزق کی مصلحت کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے، اس کے آباء و اجداد نے حرمت آدمی کے لئے اور کلمہ حق کے لئے صلیبوں پر جو خون بہایا تھا وہ لہو اب بولتا نہیں ہے آج کے انسان کو تاریخ کے شہسواروں کا خون آواز نہیں دیتا اور اس کرب نے افتخار عارف کی شاعری میں جگہ بنالی ہے۔ افتخار عارف

نے گزارش احوال کے لئے اس ماخذ سے بہت اثر آفریں اور خیال افروز کام لیا ہے۔ ان کی نظموں میں یہ اظہار واضح طور پر موجود ہے۔

(ایک رخ)

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے
یہ سناٹا طبل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لئے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

اسی طرح ان کی مختلف نظموں میں یہ موضوع اہمیت رکھتا ہے، خاص کر یہاں ان کا احتجاجیہ لہجہ کسی قدر سوالیہ انداز اختیار کر گیا ہے۔

(انی کنت من الظالمین)

پڑھا تو یہ تھا زمین عنبر پہ کشت خاشاک کرنے والے
نہیں رہیں گے
سنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پہ بیعت خاک کرنے والے
نہیں رہیں گے
مگر ہوا یوں کہ نیزۂ شام پر سر آفتاب آیا
امانت نور جس کے ہاتھوں میں تھی اسی پر عذاب آیا
اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے
یہ پوچھتے ہیں
ہماری قبریں کہاں بنیں گی
خیام تسلیم و سائبان رضا کی ویرانیاں بتائیں
جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا خون دیکھیں اب ایسی
مائیں کہاں سے لائیں

افتخار عارف نے اپنی ایک نظم میں "آبا و اجداد کے حوالے" امام حسینؑ کا شہادت کے لئے اپنے سارے گھر کو قربان کر دینے کا بیان کیا ہے۔ "اعلان نامہ" "ایک سوال"، "صحرا میں ایک شام" وغیرہ نظموں میں یہ عناصر غیر معمولی طور پر متاثر کرتے ہیں، افتخار عارف کا لہجہ بالکل انفرادی ہے۔ ان کے لہجے میں بانکپن برقرار ہے ان کے یہاں احساس کی شدت جذبے کا خلوص اور شعور کی حدت کی وجہ سے لہجے میں ایک کاٹ سی پیدا ہوگئی ہے۔ جو کہ ایک اہم خوبی ہے۔ افتخار عارف کا انداز گفتار، کلاسیکی رچاؤ، شائستگی، اظہار گہری دردمندی اور

شدت احساس سے عبارت ہے۔ اس میں جو قوت نمو ہے اور انسان کے درد وغم سے اسے جو گہری نسبت ہے، اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی آواز ان کے نغمے ہمیشہ تازگی اور شگفتگی سے بھرے رہیں گے۔ نئی نسل کے شعراء میں افتخار سب سے سنجیدہ شاعر ہیں، وہ اپنے فن میں اتنے مکمل ہیں کہ ایسی پختگی دوسروں میں بہت کم ہی مل سکتی ہے، لیکن ان کی شناخت کے لئے واقعہ کربلا کا اظہار خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے۔

جدید شاعری نے جہاں شعرا کو متاثر کیا ہے۔ وہیں خواتین کو بھی حیات وکائنات کے مسائل پر نئے زاویے سے سوچنے پر آمادہ کیا ہے۔ چنانچہ پیرایہ اظہار کی اس روش میں بھی تبدیلی آئی جو روایت کی اندھی پرستش سے عبارت تھی۔ زندگی کی رواں دواں حقیقتوں پر نگاہ ڈالنے سے خود بینی وجہاں بینی کا ایک نیا انداز وجود میں آیا اور ادب وشعر کو وہ آگہی نصیب ہوئی جواب سے پہلے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی گروہ سے تعلق رکھنے والی شاعرہ ادا جعفری ہیں وہ جو کچھ سوچتی اور محسوس کرتی ہیں اسے ادبی انداز میں پیش کر دیتی ہیں۔ ان کے لب ولہجہ میں انفرادیت بھی ہے، اور جدت طرازی ورعنائی بھی وہ شاعری میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ وہ انسانی عظمت کے لئے ایسی قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کی قائل ہیں جو امام حسینؑ اور ان کے اصحاب نے پیش کی۔ یہی بات ان کے لہجہ میں حقوق انسانیت کے مطالبے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انہیں زبان وبیان پر پوری قدرت حاصل ہے اور انہیں باغی لہجہ اسی تاریخی حوالے کی وجہ سے ملا ہے۔ اس کا ثبوت ان کی شاعری میں موجود ہے۔ اس تاریخی حوالے کے استعارے بعض نظموں کے ذریعہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مثلاً ''مسجد اقصیٰ'' نظم کا یہ حصہ

قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گذر گاہوں میں
لوٹنے والوں نے کیا عزم سفر بھی لوٹا

دجلہ خوں تو نئی بات نہیں ہے یہ کہو
وہ جو ڈوبا ہے سفینہ ہے کہ ساحل ڈوبا

ادا جعفری کہتی ہیں کہ حق کی راہ پر چلنے والوں کا کیا کہنا یہ اتنے باہمت ہوتے ہیں کہ ان کا سفینہ خود اللہ کھیتا ہے ان کی کئی نظموں میں اسی طرح حق و باطل کی کشمکش کے اشارے موجود ہیں۔ اسی سلسلے کا ایک اور اہم نام ہے پروین شاکر۔ پروین شاکر نے جدید نظموں میں اس سلسلے کو آگے بڑھایا ہے ان کے اظہار میں بے ساختگی اور کھلا پن ہے۔ نسوانی جذبات کی عکاسی کی انہوں نے کامیاب کوشش کی ہے اسی لئے کربلا کے ان استعاروں کو انہوں نے اپنی نظموں میں جگہ دی ہے جن میں رداء، زنجیر، اسیری، بے چادری، پابرہنہ، شام کا بازار، شام غریباں، موجود ہیں، حضرت زینب کا عزم جابجا موجود ہے، کہیں انہیں بھائی کے کٹے شانوں کا غم ہے کہیں پابہ گل ہونے کا کرب ان کو ستاتا ہے، پروین کو زبان و بیان پر ملکہ حاصل ہے۔ وہ کردار نگاری اور منظر نگاری میں لاثانی ہیں۔ پروین شاکر نے اپنے عہد کی عورت کے درد و غم کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اور اسے سانحہ کربلا کے پس منظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے یہاں سچائی اور بیان میں درد انگیزی ملتی ہے، ان کی نظم کا عنوان بھی کربلا کا استعارہ ہے۔

شام غریباں
غنیم کی سرحدوں کے اندر
زمین نامہرباں پہ جنگل کے پاس ہی شام پڑ چکی ہے
ہوا میں کچے گلاب جلنے کی کیفیت ہے
اور ان شگوفوں کی سبز خوشبو
جو اپنی نوخیزیوں کی پہلی رتوں میں
رعنائی صلیب خزاں بنے

اور بہار کی جاگتی علامت ہوئے ابد تک
جلے ہوئے راکھ خیموں سے کچھ کھلے ہوئے سر
ردائے عفت اڑھانے والے بریدہ بازو کو
ڈھونڈھتے ہیں
بریدہ بازو کہ جن کا مشکیزہ
ننھے حلقوم تک اگرچہ پہنچ نہ پایا
مگر وفا کی سبیل بن کر فضا سے اب تک چھلک رہا ہے
برہنہ سر بیٹیاں ہواؤں میں سوکھے پتوں کے سرسراہٹ
پہ چونک اٹھتی ہیں
بادِ صرصر کے ہاتھ سے بچنے والے پھولوں کو چومتی ہیں
چھپانے لگتی ہیں اپنے اندر
بدلتے سفاک موسموں کی اداشناسی نے
چشمِ حیرت کو سہم نا کی کا مستقل رنگ دے دیا ہے
نگاہِ تخیل دیکھتی ہے
چمکتے نیزوں پہ سارے پیاروں کے سر سجے ہیں
کٹے ہوئے سر
شکستہ خوابوں سے کیسا پیماں لے رہے ہیں
کہ خالی آنکھوں میں روشنی آتی جا رہی ہے

پروین شاکر دکھ عرض کرنے کا ہنر خوب جانتی ہے کربلا کے استعارے ان کے لہجے میں بولتے ہیں اسی طرح کچھ اور نظمیں جیسے ''ادرکنی''، علی مشکل کشا سے اور کسے کہ کشتہ نہ شد''

وغیرہ ان کی بہت اہم نظمیں ہیں لیکن صفحات کی کمی کے سبب ان کا تفصیلی جائزہ بہت مشکل ہے۔ یہ نظمیں پروین کے دوسرے مجموعہ کلام ''صد برگ'' میں موجود ہیں۔

اسی قبیلے کے ایک اور شاعر امجد اسلام امجد کے نزدیک شاعری روایت میں موجود امکانات کی یافت کا عمل ہے اپنے عوام قوم، وطن اور تمام دنیا سے ایک فکر کرنے والے کے ناطے، ان کا تخلیقی رشتہ قائم ہے، ان کی نظمیں ان کے ذاتی، جذباتی روحانی، اور سیاسی مسائل اور احساسات کا عکس ہیں وہ داخلیت کے خلاف نہیں لیکن اپنے خول میں بند ہو جانے کو فنکار کی تخلیقی ناکامی سمجھتے ہیں۔ وہ ماضی کو حال اور مستقبل کی اکائی میں دیکھتے ہیں ان کی ''زمین پیاسی ہے''، ''آخری شام'' وغیرہ نظموں میں بہت گہرے اور پر اثر انداز میں واقعہ کربلا کے اشارے موجود ہیں۔ ان کی نظم بہ انداز سلام کا ایک اقتباس پیش ہے:

حسینؑ میں اپنے ساتھیوں کی سیہ لباسی کا نوحہ گر ہوں
ہمارے آگے بھی کربلا ہے ہمارے پیچھے بھی کربلا ہے
حسینؑ میں اپنے کارواں کی جہت شناسی کا نوحہ گر ہوں
نئے یزیدوں کو فاش کرنا ہے کام میرا
ترے سفر کی جراحتوں سے
ملا ہے مجھ کو مقام میرا
حسینؑ تجھ کو سلام میرا

شاذ تمکنت اردو شاعری کا ایک معروف و معتبر نام ہے۔ ان کا شمار جدید شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ بیسویں صدی کی دکھتی رگ پکڑنے میں ماہر ہیں انہوں نے نظموں میں بھی اپنی جادو بیانی کے کمال دکھائے ہیں۔ مشینی دور میں اپنے عہد کی تباہ کاریوں کا شعری پیرائے میں

ذکر خوب کرتے ہیں ان کے یہاں احساس، فکر محبت اور بصیرت کی چنگاریاں سلگتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی آگ ان کو روشنی دکھاتی ہے۔ جس میں وہ سچائیاں تلاشنے کی کوشش کرتے ہیں یہ کوشش انہیں کربلا تک لے جاتی ہے۔

(شب امتحان جاں)

شب امتحان جاں ہے ☆ یہ گھڑی ہے فیصلے کی
یہ ہے لمحہ غنیمت ☆ مرے ہم زبان منزل
ابھی سوچ لو بھلے کی ☆ ابھی رات درمیاں ہے
مری ہم رہی سے پہلے ☆ یہی زیر پا زمیں ہے
یہی دشت آسماں ہے ☆ نہ خرام ابر باراں
نہ پناہ نیستاں ہے ☆ شب آخر وطن میں
شب امتحان جاں ہے ☆ میں ہوں روشنی کا جویا
وہی روئے آفرینش ☆ وہی روشنی جو کن ہے
یہ چراغ سب بجھا دو ☆ جسے عُذر ہو سفر سے
بخدا اسکوں سے جائے

اس نظم کا بنیادی خیال شب عاشور سے لیا گیا ہے یہ ایک رات امام حسینؑ نے عبادت کے لئے مانگی تھی اور امام حسینؑ نے سب رفیق وانیس کو جمع کر کے خطبہ فرمایا تھا کہ جو جانا چاہے جاسکتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے شمع بھی گل کر دی تھی کہ اگر روشنی میں جانے میں شرم آتی ہے تو اندھیرے میں آرام سے چلے جاؤ۔ کیوں کہ اس جنگ کا انجام صرف اور صرف شہادت ہے ان لوگوں کو میں مل جاؤں گا تو یہ کسی کو تلاش نہ کریں گے لیکن وہ وفادار انصار جانے پر راضی ہی نہ ہوئے انہیں شہادت عزیز تھی اور بے مقصد اور بے عمل زندگی پر وہ با مقصد موت کو ترجیح دیتے

تھے اسی منظر کو شاعر نے نظم کیا ہے۔

اسی طرح شہریار کے یہاں ان رشتوں کی بازیافت کا عمل بہت تیز ہے، جو ماضی قریب کے شعراء نے توڑ دیئے تھے۔ یعنی فرد کے تعلق کی ایک غیر واضح اور پراسرار فضا ان کے کلام کا سب سے اہم وصف ہے۔ شہریار اپنی شاعری میں جدیدیت اور روایت کے بیچ کی راہ پر چلنا چاہتا ہے، اور وہ اس طرح حق و صداقت کے شہر تک پہنچنا چاہتا ہے ایک نظم یہاں پر درج کی جا رہی ہے:

ہوا کی زد میں چراغ امید کب نہیں تھا
مگر یہ ہاتھوں کی کپکپاہٹ
لبوں پہ ریگ سکوت
آنکھوں میں آنسو کے امنڈتے دریا
تم اپنے آبا کے کارناموں سے بے خبر ہو
حسینؓ ابن علیؓ کے وارث
شہید ہوتے ہیں کربلا میں

ایک اور نظم جس کا عنوان ہے ''ایک ادھوری خواہش''
یہ خنجر لو اور وار کرو
اور میرے سو ٹکڑے کر دو
پھر چھلنی جسم کو سہلاؤ
آنکھوں کی اوس میں نہلاؤ
اس دن کے لئے میں زندہ ہوں

اس طرح شہریار نئے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ چھلنی کرنا، جسم کے سو ٹکڑے کرنا، قاتل، یہ سب استعارے جدید نظم میں انہوں نے استعمال کئے ہیں اور اسی طرح اس نظم میں بھی کربلا واضح طور پر موجود نظر آتی ہے۔

(اداسی کی ہجو)

سمندروں سے خراج لے کر
مہیب صحراؤں سے گذر کر
حسینؑ ابن علیؑ کا لشکر
وہ آرہا ہے وہ آچکا ہے
تمام اشجار جھومتے ہیں
فرشتے سجدوں میں منہمک ہیں
چراغ ہر سمت جل رہے ہیں
بتاؤ اب تم اداس کیوں ہو
بتاؤ افتاد کیا پڑی ہے
تمہارے بازو پہ آج بھی کیوں
سیاہ پٹی بندھی ہوئی ہے![1]

شہریار کی شاعری میں عجب سے روکھے سوکھے لہجے کی جھلک ملتی ہے شاعر کا مزاج اکھڑا اکھڑا اور ذہن الجھا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن کربلا کے استعاروں کا ذکر وہ جابجا شعوری طور پر کرتے ہیں۔

کمار پاشی جدید شاعری کا ایک اور اہم شاعر ہے ان کے یہاں عہد کا کرب اور فرد کی

---

[1] خواب کا در بند ہے۔ شہریار

تنہائی دونوں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاعر خود کو اپنے معاشرے میں بالکل تنہا محسوس کرتا ہے۔ اور تشنگی کا احساس اسے ذہنی طور پر محسوس ہوتا ہے جو اسے کربلا کی یاد دلاتا ہے، ان کی ایک نظم یہاں درج کی جارہی ہے:

(ایودھیا میں آرہا ہوں)

ایودھیا میں آرہا ہوں
میں تیری کوکھ سے جنما
تری گودی کا پالا ہوں
تیری صدیوں پرانی سانولی مٹی میں کھیلا ہوں
ایودھیا میرا باہر کربلا ہے
اندروں میرا اکپل وستو ہے مکہ ہے مدینہ ہے

وزیر آغا اس شخص کا نام ہے جو نہ صرف تنقید بلکہ شاعری پر بھی ملکہ رکھتے ہیں انہوں نے شاعری میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے بلاشبہ یہ ادبی ہمہ جہتی بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے ان کی نظمیں نادر اور نایاب تجربوں کے انوکھے اظہار سے عبارت ہے۔ نیم روشن معنی خیز اور محرک خیال لفظ و پیکر اور استعارہ و علامت کی تدریجی تکمیل ان کی نظموں کا خاصہ ہے۔ اسد بدایونی کے خیال میں:

”وزیر آغاز کی غزلیں ان کی نظموں سے مختلف بھی ہیں کہ غزلیں ایک نئے انداز نظر کو پیش کرتی ہیں اور شاعرانہ تجربوں کی نئی سمتوں کی نشاندہی بھی کرتی ہیں ان کی غزلیں ان کی نظموں سے یوں بھی مختلف ہیں کہ ارتقا پذیری کے باوجود غزل کا ہر شعر خود مرتکز ہوتا ہے، شعر کا یہ ارتکاز نہ صرف معنوی سطح کا

ہے، بلکہ اس کا تعلق استعاروں کے ہیئتی استعمال سے بھی ہے۔"[1]

وزیر آغاز کی نظموں میں دور حاضر کے انسان کے انفرادی اور اجتماعی انتشار کا شکار ہونے کا غم کس طرح محسوس کیا گیا ہے۔ نمونے کے لئے ان کی نظم کا یہ اقتباس دیکھنے کی ضرورت ہے:

(ہوا کہتی ہے)
مگر میں خشک چھاگل
اپنے دانتوں سے دبائے
پیاس کی برہم سپہ سے لڑ رہا تھا
میں کہاں جاتا
مجھے — ایک جرعۂ آب صفا درکار تھا
اور میرے بچے نے صدا دی تھی مجھے
آ خدارا اب تو آ جاؤ

یوں تو یہ تمام مناظر میر انیسؔ اور مرزا دبیر کے یہاں بھی بہت اچھے ڈھنگ سے موجود ہیں لیکن وہاں شاعر صرف تماشائی ہے اور یہاں شاعر نے کردار کو خود پر طاری کرلیا ہے۔ شاعر اور کردار کی یہ ایک دردی جو کسی تیسرے وجود کی طرف مرکوز ہے اس منظر کو المیے کی رفعت تک پہنچاتی ہے اور قاری بھی اس تجربے میں شامل ہو کر اس المیے سے طمانیت محسوس کرتا ہے۔ یوں تو اور بھی بہت سے جدید شعراء نظم گو ہیں لیکن ہم نے ان شعراء کا ذکر یہاں کیا ہے جنہوں نے کربلا کے حوالے سے استفادہ کیا ہے۔

---

[1] نئی غزل نئی آوازیں۔ اسد بدایونی، صفحہ ۹۶

باب ہشتم

دور جدید کی شاعری میں واقعات کربلا کی اہمیت — ایک مجموعی جائزہ

تاریخ میں کسی عظیم واقعہ کی بھی اتنی اہمیت نہیں ہے جو عظمت اور اہمیت سانحہ کربلا کی آج تک ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شہیدوں کے خون کی تابندگی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ اور وہ شہادت کہ جس کا مقصد ہی حق و صداقت کی حفاظت تھا وہ تو کبھی بھلائی ہی نہیں جاسکتی۔ حق کی آواز کو دبانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خیر و شر اور حق و باطل کی جنگ میں انسان کو نئے مطالبات اور نئی ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب جبر و ظلم کا نیا باب کھلتا ہے تو آدمی یادوں کے اس قدیم دفینے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان تاریخی روایتوں کے خزانوں سے حرکت و حرارت کا نیا ساز و سامان لے کر فکر و عمل کی نئی راہوں کا تعین کرتا ہے۔ اور ایک دوسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ واقعہ کربلا بذات خود درد و غم کا واقعہ ہے اور حیات انسانی پر اس واقعہ کے اثرات سے انکار ناممکن ہے اسی لئے دانستہ اور غیر دانستہ دونوں طرح سے اردو شاعری کے المیہ مضامین واقعہ کربلا سے متاثر ہوئے ہیں۔ دراصل حق پرستی کی راہوں کا سفر شہیدوں کے خون سے طے ہوتا ہے۔ مختلف تہذیبوں میں اس کی مختلف مثالیں اور سلسلے ہیں ہر مثال اپنی جگہ اہم اور لائق احترام ہے لیکن اسلام اور انسانیت کی تاریخ میں کوئی قربانی اتنی عظیم و ارفع و مکمل نہیں ہے۔ جتنی حسین ابن علی کی شہادت جو کارزار کرب و بلا میں واقع ہوئی تھی۔ اس کی عظمت مختلف شکلوں میں سامنے آتی ہے امام حسینؑ نے ایک فاسق و فاجر حکمراں کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنے اصولوں کی قربانی دینا نہیں قبول کیا بلکہ اپنے پورے خاندان اور اصحاب و اقرباء کو شہید ہوتے ہوئے دیکھنا منظور کر لیا۔ وہ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا گئے چوں کہ وہ خوں ریزی نہیں چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ انہیں بیعت کے لئے مجبور نہ کیا جائے دراصل

دربدری، بے گھری اور بے زمینی کے سارے حوالے شاعری کو انہیں کیفیتوں سے ملے ہیں۔
حسینؓ ابن علیؓ کے ساتھ پورا کنبہ بلکہ جماعت بلکہ پورا قافلہ شریک تھا جن میں ہر فرد راہ حق میں اپنا سب کچھ لٹانے کو عین مقصد حیات سمجھ رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ معرکہ حق و باطل ہے اور ہمیں حق کا ساتھ دینا ہے وہاں کوئی مادی آلائش نہ تھی اسی لئے حسینؓ کے پورے لشکر نے موت کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور مسکرا کر لبیک کہا وہاں کسی کے عزم و استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ تھی۔ حسینؓ ابن علیؓ کی اس بے مثال شہادت نے اسلام کے فلسفہ جہاد و قربانی کی جس روایت کو روشن کیا اس کا گہرا اثر ادبیات پر بھی پڑا اور موجودہ عہد میں نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت شہادت حسینؓ کا تاریخی حوالہ رسمی رثائی ادب سے ہٹ کر عام اردو شاعری میں بھی پرورش پا رہا ہے۔ یوں تو اس عظیم مذہبی اور تاریخی کارنامے سے اردو شاعری کا ہر دور متاثر رہا ہے لیکن گزشتہ تین چار دہائیوں سے نئے تقاضوں کے زیر اثر معاشرے کی کشمکش اور استحصال و استبداد کی شدت کے خلاف حق و انصاف کی آواز بلند کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اسی لئے اب یہ رجحان بے حد اہم اور معنویت کا حامل بن چکا ہے، یہ حقیقت ہے کہ موجودہ عہد کی شاعری میں یہ تاریخی حوالہ جن نئے معنیاتی مضمرات کے ساتھ ابھر رہا ہے اس کا تقاضا رثائی ادب سے کیا بھی نہیں جا سکتا بے شک رثائی ادب میں دوسری جہات بھی کارفرما ہو سکتی ہیں لیکن وہاں بنیادی محرک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عام میں بنیادی حوالہ آتا تو ہے مذہبی اور تاریخی روایت ہی سے لیکن اس میں تہ در تہ استعاراتی اور علامتی توسیع ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس میں ایک عالم گیر آفاقی معنویت پیدا ہو جاتی ہے جس کا اطلاق تمام انسانی برادری کی عمومی صورت حال پر اور موجودہ عہد میں نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت شہادت امام حسینؓ کا تاریخی حوالہ رسمی رثائی ادب سے ہٹ کر عام اردو شاعری میں بھی پرورش پا رہا ہے۔

فنکار یا شاعر تاریخ کی عظیم روایتوں کی بازیافت بھی کرتا ہے اور ان سے نیا رشتہ بھی

جوڑتا ہے۔ نیز پرانی اور تاریخی سچائیوں کو نئی روشنی میں بھی پیش کرتا ہے۔ جس کی اس کے عہد کو ضرورت ہوتی ہے ادھر کئی برسوں سے سانحہ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کے حوالے سے جدید اردو شاعری میں ایک نیا تخلیقی رجحان فروغ پا رہا ہے جو معنیاتی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کے علاوہ کربلا والے عشق الٰہی کے جذبات کا موجزن سمندر دل میں لئے یزید کی باطل پرستی اسلام کشی اور ظلم و جور کا مقابلہ کرنے کیلئے کربلا کے میدان میں جس طرح نظر آرہے ہیں وہ دراصل عشق و عشق الٰہی کی مکمل داستان ہے اور اس داستان سے اردو شاعری نے بہت کچھ اپنے لئے حاصل کرلیا اور کربلا والوں کے ایثار و قربانی و شہادت سے ہمارے غزل گو شعراء نے متاثر ہو کر بے شمار اشعار کہہ ڈالے۔ اردو غزل اور اردو شاعری پر لفظ کربلا کا یہ اثر پڑا کہ صرف لفظ کربلا کو شعرا نے طرح طرح کے مفہوم اور مطالب میں ادا کیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ کربلا کا میدان نہ صرف جنگ کا میدان تھا بلکہ اس سے اخلاق، حفظ مراتب، صبر و رضا، حق کے مقابل باطل کی شکست، خدا پرستی، انقلاب شہادت، قربانی اور محبت اور ایثار کے عملی سبق حاصل ہوئے شعراء نے کربلا کو بمعنی شوق جاں نثاری کے اظہار کی جگہ بھی استعمال کیا ہے۔ اور کربلا کی سرزمین کو بے گناہوں کے قتل کی جگہ کے مفہوم کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ظلم و جور کے استعارے کے بطور کربلا کا استعمال بہت زیادہ ہوا ہے۔ مظالم کی انتہا، پیاس کی شدت اور اصحاب کی وفاداری و رشتے داروں کی قربانی یہ سب کربلا میں واضح طور پر برملا آئے ہیں۔ لفظ کربلا یعنی کرب و بلا تاریخ کے اعتبار سے یہ زمین مصیبت و بلا کی سرزمین رہی ہے۔ اور تشنگی یعنی پیاس کے عالم میں امام حسینؑ اور ان کے عزیز و انصار شہید کئے گئے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری میں پانی، پیاس، اور العطش سے مرکب محاورے و استعارے کا استعمال واقعہ کربلا سے ہی لئے گئے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

ترسا نہ آب تیغ سے ظالم تو کر شہید
کوچہ نہیں ہے تیرا کم از کربلا مجھے

معرکہ کربلا میں ہر ایک ظلم واذیت میں امام حسینؑ اوران کے رفقاء بڑی لذت محسوس کرتے تھے اور یہ ان کے لئے ایک مرغوب ودل پسند چیز بن گیا تھا اسی طرح ایک اور شاعر منتظر لکھنوی نے اس حوالے سے یوں استفادہ کیا ہے کہ

بخشا خدا نے وہ دل درد آشنا مجھے
ہر معرکہ ہے معرکہ کربلا مجھے

کربلا میں شہادت امام حسینؑ سے پہلے اور بعد میں پانی کے لئے بچوں کا تڑپنا چاروں طرف فوج کا نرغہ (جیسے قید میں پرندوں پر دانا، پانی بند ہو تو اسے قفس کا نام دیا جاتا ہے) ان تمام حالات کو شاعر آتم محمود آبادی نے اس طرح پیش کیا ہے

قفس میں بند ہیں ہم، ہم پہ آب و دانا بند
یہ گھر ترا ہے کہ صحرائے کربلا صیاد

کربلا کو معرکہ خیر وشر بھی کہا جاتا ہے شاعر نے اسے کس طرح نظم کیا ہے۔ دیکھئے:

وہ رن مجھ پہ پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں
(سلیم احمد)

امام حسینؑ اوران کے انصار یہ طے کر چکے تھے کہ اسلام کو بچانا ہے اور اقتدار اسلامی کو

بچانے کے لئے ان کا دل سراپا شوق تمنا سے گھرا ہوا تھا۔ اس طرح کربلا کی زمین اظہار شوق تمنا کا مرکز بن گئی تھی۔ سجاد لکھنوی کہتے ہیں

کربلا شوق تمنا کی ہے دنیائے شباب
ہر نفس دعوت زندان بلا آتی ہے

کربلا کوچہ عشق بھی ہے چونکہ دنیا کی دوسری جنگوں میں کہیں بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ صرف اصول کی خاطر، حق کی خاطر، صداقت کی خاطر اتنے لوگوں نے قربانیاں دی ہوں وہاں کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ نہ کوئی ذاتی مقصد ہی تھا، صرف جذبہ شوق شہادت ہی جذبہ عشق اور کوچہ عشق بن گیا تھا اسی لئے اثر لکھنوی نے اس شعر میں کربلا اور عشق کی تعریف اس طرح کی ہے

سینچا ہوا لہو سے اک گلشن وفا ہے
عشق غیور تیرا آئینہ کربلا ہے

اردو شاعری میں کردار حسینؑ واقعہ کربلا اور اس کے متعلقات ایک مسلسل موضوع کی حیثیت سے موجودہ شعری رویوں کا حصہ بن کر جاری و ساری ہیں۔ ایسا نظم و غزل دونوں میں ہو رہا ہے آج کل یہ اظہار براہ راست بھی ہو رہا ہے اور خالص استعاراتی اور علامتی پیرائے میں بھی۔ بہر حال اتنی بات واضح ہو گئی ہے کہ اردو شاعری میں واقعہ کربلا کی کیا اہمیت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ موجودہ ذہن و شعور اس سے آزاد آنا فیضان حاصل کر رہا ہے اور یہ موضوع ہمارے عہد کی تخلیقی شخصیت اور شعری وجود کا حصہ بن چکا ہے۔ علامہ اقبال اور ان کے عہد کے شعراء نے اس سلسلے میں نئی اظہاراتی اور معنیاتی جہات کو روشن کر کے اسے باقاعدہ شعری رجحان کی حیثیت دے دی۔ امام حسینؑ کی ذات اور ان کی بے مثال شہادت اسلامی تاریخ کا ایسا روشن نقطہ اور سرچشمہ فیض ہے جس سے آنے والے زمانے ہمیشہ کسب نور کرتے رہیں گے۔ تاریخ کا یہ منور نقطہ اردو شاعر کے حافظے سے کبھی محو نہیں ہوا ہے۔ دوہوں، عوامی گیتوں،

دو بولوں، چو بولوں، منقبتوں، سلاموں، مخمسوں، مسدسوں کی شکل میں صدیوں کا رثائی ادب اس کا شاہد ہے کہ مرثیوں کو جو فروغ اردو میں ملا وہ کسی اور زبان میں نہیں مل سکتا تھا۔

تاہم عہد حاضر میں یہ اظہار کا طریقہ رثائی شاعری سے ہٹ کر عام شاعری میں نئی شان کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہے، ایسی شاعری کا بڑا حصہ مزاحمتی ادب کے ذیل میں آتا ہے۔ جو تیسری دنیا کی شاعری کا خاص رجحان ہے دراصل زندہ زبانوں کا تہذیبی اور تخلیقی سفر جاری رہتا ہے۔ حسینؑ ابن علی کی حق شناسی، استقلال، ایثار و قربانی اور اہل بیت کا دکھ اور مصائب کو صبر و شکر کے ساتھ جھیلنے کی طاقت و توفیق ایسا سرچشمہ سعادت ہے جس سے جدید دور میں اردو غزل اور اردو نظم کی نئی تخلیقی جہات روشن ہوئی ہیں اور معنی آفرینی اور تاثیر و دردمندی کے نئے افق سامنے آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک سانحہ نہیں ہے بلکہ فرض شناسی، قربانی، ایثار، صبر، مظلومیت، جاں نثاری، بہادری، وفاداری، کی ایسی مثال ہے جو کہ رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ اور جب جب ظلم سر اٹھائے گا تو انسان کو ہر لمحہ واقعہ کربلا کے مناظر دکھائی دیں گے۔ اور جب قوم کی ہمت پست ہوگی تو یہ سانحہ حوصلہ افزائی کے فرائض انجام دے گا۔

یہ واقعہ انسان کے لئے ایسی مثال ہے جو ہر ہر قدم پر راہ دکھاتا رہے گا۔ ٹوٹی بکھری قوم کو امید اور حوصلہ اس واقعہ سے حاصل ہوگا۔ چونکہ انسان کے کردار میں جتنے رنگ بھر سکتے ہیں وہ تمام اس واقعہ میں موجود ہیں جب کہیں وفا کا ذکر آئے گا تو حضرت عباسؑ کی وفا ضرور یاد کی جائے گی۔ جو کہ بے مثل تھی بھائی سے ایسی محبت اور ایسی قربانی کہیں کسی جگہ پھر دیکھنے میں نہیں آئی اور جب فرض شناسی کا ذکر ہوگا جب قربانی اور صبر کی بات ہوگی تو امام حسینؑ کا ذکر ہر زبان پر ہوگا۔ کیوں کہ ایسی عظیم المثال قربانی آج تک کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ اور نہ ہی کسی کا جگر ایسا ہوا جو اتنی عظیم قربانی دے سکے اور اس بات کو شعراء نے شدت سے محسوس کیا اور شاعری میں ایک نئے رخ کا رجحان اس طرح وجود میں آیا۔

جدید غزل میں واقعہ کربلا کی علامتیں جس شدت سے استعمال کی جارہی ہیں۔اس سے صاف واضح ہے کہ یہ عقل وشعور کا ارتقا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید غزل گوشاعر نے ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے کا راز جان لیا ہے عہد حاضر کے انسان کے دلی جذبوں، دکھوں اور آرزوؤں کی عکاسی کے لئے جدید شعراء کربلا کے واقعات کا سہارا لے کر غزل کی فصاحت اور فکر کے ارتقائی عمل کو بڑھا رہے ہیں۔اس طرح وہ اپنے خلوص وصداقت کا اظہار کر کے اپنی شاعری کو زندہ رہنے والے ادب میں شامل کرتے جارہے ہیں۔دراصل کربلا کے واقعات پر لکھے گئے مرثیوں کے ارتقا نے بھی غزل کو متاثر کیا۔ مساوات، تزکیہ نفس، حق وباطل کا فرق، اظہار حق کی بے باکی، اخلاق وآداب کا بھرپور اظہار مرثیوں کے ذریعے سے ہوا ہے اور مرثیے نے واقعات کربلا کے بیان میں ان موضوعات کو سرفہرست رکھا یہ تمام موضوعات مرثیے کی راہ سے غزل میں بھی درآئے۔

اردو غزل گوشعراء نے زلف وگیسو، کمر ودہن وغیرہ موضوعات کو ترک کر کے مرثیوں کے علاوہ وہ مضامین جن میں اخلاقی پہلو نمایاں تھا غزل میں سمیٹ لئے واقعہ کربلا میں وہ تمام اجزاء مثلاً مظالم ومصائب صحرانوردی صبر ووفا، خانہ ویرانی، بے نوائی، اسیری وغیرہ غزل کے لئے بھی جاذب نظر تھے چونکہ یہ تمام مضامین کربلا غزل میں مشترک کہے جاسکتے ہیں۔اس لئے بھی غزل پر واقعات کربلا کا بھرپور اثر پڑنا لازمی تھا۔ بالکل اسی طرح بیکسی اور مجبوری، عاشق کا گریہ کرنا، جلتے ہوئے آشیاں کا ماتم، قاتل کی پشیمانی یہ تمام موضوعات غزل میں کربلا کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔غزل میں بے شمار محاوروں، استعاروں، اور تراکیب میں صاف صاف واقعات کربلا کا اظہار پایا جاتا ہے۔ جیسے خون میں لوٹنا، لہو میں نہانا، تشنہ دہانی، تشنگی، شوق، آب تیغ، خیمہ گاہ تشنگان، قبر شہید، کربلائے عشق، گنج شہیداں، خنجر قاتل، خون شہداء، تیغ ستم، وادی غربت، دشت بلا، سامان غم، دیوار زنداں وغیرہ۔

جدید غزل گو شعراء کے یہاں اسی طرح کے بے شمار الفاظ، محاورے، اور اسلوب کا نیا پن ملتا ہے۔ اس قسم کے اشعار پڑھنے کے بعد واقعات کربلا کے لاشعوری اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ شعراء نے اس تاریخی حوالے سے فیض حاصل کیا اور اس سے گوناگوں شعری کیفیات کو ابھارنے کا کام لیا ہے۔ آج کل جدید غزل میں واقعہ کربلا کی علامتیں جس شدت سے استعمال کی جارہی ہیں وہ قابل ذکر ہے پاکستان اور ہندوستان کے متعدد شعراء نے واقعہ کربلا کی روشنی میں اپنی شاعری کی منازل طے کی ہیں اور راستوں کا تعین کیا ہے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ جو اشعار اس موضوع کے پیش نظر کہے گئے ہیں وہ بہت زیادہ مقبول اور مشہور ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ لاشعوری طور پر عوام کے ذہن میں یہ واقعہ کہیں گہرے تک موجود ہے۔ جس کی بازگشت انسانی ذہن کو تسکین بخشتی ہے۔ اور اسی لئے پڑھنے و سننے والے ان اشعار سے متاثر ہوتے ہیں۔ یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ عہد حاضر کا انسان اپنے معاشرے میں مطمئن نہیں ہے اور اپنے ماحول میں خود کو بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے تو ایسے میں اس کا ذہن بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس کی طبیعت خود بخود ان اشعار کی جانب راغب ہوتی ہے اور وہ ان میں اس آواز کی گونج محسوس کرتا ہے جو کہ اس کے اندر کے انسان کی بھی آواز ہے۔ شعراء کو بھی اپنی ذہنی تسکین اور اپنے اندر کی آواز کی گونج سننے کے لئے ان اشعار کے اور واقعات کربلا کے دامن میں جگہ ڈھونڈھنی پڑی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں یہ سلسلہ عرصہ دراز سے یوں ہی چل رہا ہے اور چلتا رہے گا اسی طرح نئی نئی جہتیں نکالی جائیں گی اور اشعار ڈھالے جائیں گے اور واقعہ کربلا پوری تابناکی سے اپنی روشنی بخشتا رہے گا لیکن یہ نور نہ کم ہوگا نہ ختم ہوگا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری وساری رہے گا۔

دراصل اس واقعہ میں اپنے معنی خیز جزئیات وعناصر موجود ہیں کہ ادب کو اس میں اپنے کام کی لاکھوں باتیں ملتی ہیں اور وہ ان کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یہاں باطل کے

آگے سر نہ جھکانا صرف ایک انکار نہیں ہے بلکہ پوری تاریخ ہے۔ حق ہے سچائی کی اہمیت کا اعلان ہے۔ مقصد کی اہمیت ہے۔ قربانی کی مثال ہے جو کسی اور جگہ کسی اور واقعہ میں اس طرح جلوہ گر نہیں ہوتا۔ امام حسینؓ نے راہ حق میں اپنا سب کچھ لٹا دیا مگر باطل کے ہاتھ پہ بیعت نہیں کی انہوں نے اپنے پورے خاندان کو شہید ہوتے دیکھا لیکن کہیں کسی موقع پر وہ کمزور نہیں پڑے بھلا کون اتنا صبر ایسی قربانی کا جذبہ رکھ سکتا ہے۔ یہ ثابت قدمی اور مقصد کے لئے قربانی جدید ادب کے لئے بہت بڑی مثال بن گئی ہے۔

خدا کا بنایا راستہ، خدا کا بھیجا ہوا مکمل اور آخری دین ''اسلام'' کربلا میں خطرے میں تھا، اور سارا زمانہ اس بات سے واقف تھا کہ یزید کھل کر اسلام کی تعلیمات کی خلاف ورزی کر رہا تھا اور اس کے منافی حرکات کا مرتکب تھا پھر بھی وہ خلیفۃ المسلمین ہونے کا دعویدار تھا۔ اور امام حسینؓ سے بیعت کا طلب گار تھا۔ امام حسینؓ نے اپنا سر دے دیا۔ اپنا پورا گھر قربان کر دیا لیکن حق کو بچا لیا امام حسینؓ شہید ہو گئے لیکن حق و سچائی کا بول بالا ہو گیا۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
(مولانا محمد علی جوہرؔ)

جدید شاعری میں یہ رجحان عام طور پر بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ شاعر نے کربلا کے ظلم کی مثال زمانے کو یوں دی ہے کہ جب جب ظلم حد سے زیادہ بڑھے گا تو پھر صبر کرنے والے فاتح ہوں گے اور مرنے کے بعد بھی زندہ جاوید ہوں گے کیوں کہ وہ حق کی راہ پر چلنے والے ہیں اور ظلم کرنے والا مرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن مظلوم ہمیشہ کے لئے حیات جاویدانی حاصل کر لیتا ہے۔

تمام دنیا نے اس بات کو دیکھا کہ باوجود حکومت، دولت، ثروت، اور کثرت کے یزید

کسی کے دل پر قبضہ نہ کر سکا لیکن امام حسینؑ ان ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود سوتی ہوئی دنیا کو جگا گئے اور ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور دلوں کو فتح کر لیا۔ زمانہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سچائی کا علم بلند کرنے والے کثرت افواج اور شاہی عز و جاہ کے آگے جھکا نہیں کرتے اور غالباً یہی جذبہ تحریک آزادی کے زمانہ میں ترقی پسندوں کے خیالات میں بھی کارفرما تھا۔ اسی لئے ترقی پسند شاعری میں لہو کے رنگ، لہو بولتا ہے۔ چراغ ظلم، حق کے ساز، عصر نو کے شمر، کربلائے نو، طبل و پرچم و لشکر، دشت بلا، خون شہید، ماتم رفتگاں، خون کی پیاسی زمین، ایک قطرہ خون، آبلہ پا، شورش زنجیر، لہو سے سرخ کفن، مقتل تمنا، تلوار، قاتل، تہ تیغ، شہید کا سجدہ، فرات کا ساحل، خیام، قتل گاہ، لاشے، بے کسوں، خیمہ، نیزے پہ سر، جیسے الفاظ کا بہ کثرت استعمال کیا گیا ہے۔ اور جدید شاعری نے ان تمام استعاروں سے فیض حاصل کیا ہے۔ اور تمام جدید ادب ان استعاروں سے بھرا پڑا ہے اور یہ بات اس لئے ہے کہ انسان اپنے عہد میں ان علامات کو محسوس کر رہا ہے، دراصل جدید شاعری میں علامتوں کا رجحان بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ سلیم شہزاد کے لفظوں میں:

> ”جدید شعری روایت میں علامت پسندی نے نہ صرف ایک اہم رجحان کی حیثیت حاصل کی ہے بلکہ ہر جدید شعر کو علامتی شعر کے مترادف سمجھا جانے لگا ہے۔ اور علامت کے تعلق سے بہت کچھ صحیح اور غلط اتنے تصورات عام ہو گئے ہیں کہ علامت بذات خود ایک ارسطور (MYTH) بن گئی ہے بظاہر یہ لغو معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے حقیقت پر مبنی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال وہی علامتِ تخلیق قابل اعتنا ہو سکتی ہے جس میں شاعر نے پورے فن کارانہ شعور سے علامت کو اپنی تخلیق میں برتا ہو حالانکہ ایسا بھی نہیں ہے کہ علامات اور غیر علامات کے جنگل میں سچی علامتی تخلیقات بآسانی

دستیاب نہ ہوتی ہوں۔'' [1]

اور یہ بچی علامتی تخلیقات ہمارے جدید شعراء کے یہاں کربلا کی علامتوں اور استعاروں کی شکل میں موجود ہیں۔

کربلا کا سانحہ ایک درد کا دریا ہے، جو مسلسل بہتا رہتا ہے۔ جس کے آب غم کی فراوانی کہیں تھمتی ہی نہیں۔ رثائی ادب کا سرمایہ اردو میں بھی واقعہ کربلا سے بھرا ہوا ہے لیکن جدید شاعری میں نئی معنیاتی کیفیت کربلا کو حاصل ہوئی ہے۔ دراصل ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تہذب وثقافت ماضی کا ورثہ ہیں۔ انسان کو ورثے میں تاریخ اس کے اسلاف کے کارنامے اور روایتیں ملتی ہیں۔ انسان کے تمدن پر گزشتہ کہانیوں کی گہری چھاپ ہوتی ہے زمانہ حال انسان کے لئے ناکافی ہے اس لئے وہ آس پاس دیکھنا شروع کرتا ہے۔ مستقبل دھند میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے سامنے صرف ماضی کی کھلی کتاب ہوتی ہے، اور کچھ قصے یا واقعے ایسے ہوتے ہیں جنہیں یاد کرکے انسان چند لمحوں کے لئے اسی ماحول کے تصور میں ڈوب جاتا ہے۔ اور یا تو خود کو اس عہد میں پاتا ہے یا اسے اپنا عہد ویسا ہی محسوس ہونے لگتا ہے اور وہ کردار خود میں زندہ ہو جاتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ انہیں کرداروں کے بیچ وہ پہنچ جاتا ہے۔ موجودہ صدی میں زندہ انسان اپنی قدیم روح کھو چکا ہے جو اس کی معصومیت کی ضامن تھی، نئی دنیا کے پیدا کئے ہوئے انتشار اور خلفشار میں وہ اپنی کھوئی ہوئی روح کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ یعنی فرد اپنا ماضی تلاش کررہا ہے۔ اور یہ ماضی کی جستجو صرف جدید دور کے انسان کا ہی شیوہ نہیں بلکہ کل کا انسان بھی ماضی کو تلاش کرتا تھا اور شاید آنے والے دنوں میں اسے یہ تلاش اور بھی شدت سے ہوگی۔ ماضی سے انسان کا یہ لگاؤ تہذیب کی بے مقصد چمک سے اس کی بدظنی اور ناپسند کا ردعمل ہے اس کے علاوہ ایک عام انسان ہونے کے ناطے وہ خالی الذہنی کے موقع پر

---

1. جدید شاعری کی ابجد، سلیم شہزاد، صفحہ ۴۳

اپنی نفس اور جمالیاتی تسکین کے لئے اپنے روشن ماضی کو یاد کرتا ہے اور واقعات سے خوش ہوتا ہے اسی طرح یہ واقعہ کربلا ماضی کے حوالے کے بطور اسے بار بار یاد آتا ہے۔ اور وہ خود کو ان کرداروں میں پاتا ہے کبھی انسان اپنے عہد میں کربلا کو دیکھتا ہے اور کبھی خود کو کربلا میں پاتا ہے یہ ماضی سے اس کی بے حد جذباتی اور گہری وابستگی ہے جو نہ ختم ہو سکتی ہے اور نہ ہوگی۔ شاعر اس حوالے کو اسی لئے اپنی شاعری میں دوہراتے رہے ہیں۔

نئے ادب میں ان حوالوں کی افراط کی یہی وجہ ہے کہ نیا فن کار اپنے حال سے مطمئن نہیں ہے نئے انسان کی طرح وہ اپنے ماضی کی جستجو کر رہا ہے۔ ہر چیز کو عقل کے پیمانے سے ناپنے کی وجہ سے اس کو زندگی گزارنے کے لئے چند مخصوص اصولوں اور فارمولوں کا پابند ہونا پڑا ہے۔ اس میں مشینی انداز آ گیا ہے یہاں تک کہ اس پر جمود کی کیفیت طاری ہو چکی ہے اور مشین کی طرح وہ بے حس ہو چکا ہے ان فارمولوں سے آزادی حاصل کرنے اور بے حسی سے نکلنے کے لئے وہ ماضی کا متمنی ہے۔ وہ اپنے اسلاف میں اپنے وجود کو تلاش کر رہا ہے۔ اور یہ عمل مسلسل جاری ہے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے اپنی تسکین کے لئے وہ حال میں ماضی کی تصویر دیکھتا ہے اور خود کو اپنے اسلاف میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ مشین جیسی بے حسی میں مبتلا ہونے کے باوجود خود اطمینانی کے لئے وہ اپنے اندر کے کسی گوشے میں تاریخی کرداروں کو محسوس کرتا ہے اور ان میں ہمارے تاریخی حوالے کے کردار بے مثل ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ موجود نظر آتے ہیں۔ یہ واقعہ ایسا ہی بے نظیر ہے اور بے حد اہم کہ ذہن بے ساختہ ان کرداروں میں ذہنی آسودگی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اس سانحہ کا تاریخی پس منظر ہی ایسا ہے۔ سلیم شہزاد نے اپنے ایک مضمون ''شاعری اور ماضی کی دریافت'' میں جدید شاعری کے بارے میں ان الفاظ میں اپنی رائے دی ہے کہ

''نئے شاعروں نے جب شاعری کی قدیم روایات سے انحراف کیا تو قدرتاً

ان کے لئے میدان تنگ ہوگیا اس لئے جو کچھ ترک کیا گیا تھا یعنی لفاظی اور ماند ہوتی تشبیہیں وغیرہ ان کے متبادل تلاش کئے گئے اور جو کچھ ان کی فکر (عصری آگہی) نے مہیا کیا ہر شاعر اسے اپنی تخلیقات میں برتنے پر تل گیا۔ نتیجہ آشنا الفاظ (Familiar Diction) علائم اور تشبیہات اور استعارات کے دوہراؤ کی صورت میں ظاہر ہوا اور یکسانیت رونما ہونے لگی۔ چنانچہ اسے ختم کرنے کے لئے تمام حد بندیوں کو توڑنا پڑا۔ شعراء نے اپنے کلاسیکی ادب کو جسے وہ فراموش کر چکے تھے گرد سے پاک کیا اور اس طرح کلاسک سے بہت سارا "نیا مواد" حاصل ہوا نہ صرف اپنی بلکہ بیرونی ادب کی روایات کو بھی اپنایا گیا اور جو میدان شاعری کے پرانے لوازمات ترک کردینے سے کٹ گیا تھا قدیم داستانوں، اسطوری حوالوں اور علامتوں سے ان کی بھرپائی کی گئی۔ نئی شاعری میں اب نہ صرف مذہبی اساطیر کا استعمال عام ہے بلکہ پیش تر سے موجود ادبی اساطیر سے بھی فائدہ اٹھایا جارہا ہے" لے

اور یہ اساطیر ہمیں کربلا میں ملتی ہیں۔ اسلامی تاریخ کا یہ مشہور واقعہ علامات کی شکل میں جدید شاعری کو فیض پہنچا رہا ہے۔ انیس اور دبیر کے مرثیوں میں ان کرداروں اور واقعہ کو خوب خوب نظم کیا گیا ہے لیکن وہاں شاعر صرف رزم کا تماشائی ہے۔ اور یہاں شاعر نے کردار کو خود پر طاری کرلیا ہے۔ شاعر اور کردار کی یک دردی منظر نگاری کو المیہ کی رفعت تک پہنچا دیتی ہے اور قاری بھی ان کے تجربے میں شامل ہو کر اس المیے سے طمانیت (Katharsis) محسوس کرتا ہے۔

لے مطبوعہ "نشانات"، سلیم شہزاد، ۴ر اپریل ۱۹۷۵ء

کربلا کا یہ واقعہ جدید شاعری میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ شاعری کو نئی رفعتوں تک پہنچا دیا ہے۔ جدید علامت نگاری میں ایک پسندیدہ رجحان قدیم اساطیر (Myths and Legends) سے ادبی علامات اخذ کرنے کا رجحان ہے۔ اسطور نگاری کے علاوہ تمثیل (Allegory) بھی جدید شاعری کا ایک اہم رجحان ہے واقعہ کربلا میں علامات، اسطور نگاری، اور تمثیل کا بہت دخل ہے۔ جسے جدید شاعری نے اپنا لیا ہے۔ کربلا کے کردار خود بھی علامت ہیں جیسے کہ امام حسینؑ صبر و حق کی علامت، حضرت زینب صبر و استقلال کی علامت، یزید ظلم اور اندھیرے کی باطل کی علامت، حضرت عباسؑ وفاداری اور قربانی کی علامت، حضرت علی اکبر جوان پرارمان شجاعت اور فرماں برداری کی علامت۔ حضرت عابد مظلومیت کی علامت بے بسی کی علامت بہر حال کربلا میں حق و صداقت صبر و ظلم کی علامتیں جگہ جگہ نمایاں ہیں یزید کی سب سے بڑی سیاسی غلطی یہ تھی کہ اس نے امام حسینؑ سے بیعت طلب کی اور انکار کی صورت میں ان کے پورے خاندان اور اصحاب کو قتل کروا دیا اس طرح حسینؑ ہمیشہ کے لئے بقا پا گئے اور یزید فنا ہو گیا امام حسینؑ کی عظمت کے سلسلے میں خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا ہے:

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دیں است حسینؑ دیں پناہ است حسین
سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنا لا الہ است حسینؑ

دراصل امام حسینؑ کے کردار میں قربانی کا عجب رنگ تھا۔ جب انہوں نے حر کے لشکر کو پانی پلایا تو انجام کی فکر نہ کی۔ بعد میں جب حر نے دیکھا کہ حسینؑ کے تین دن کے پیاسے بچے تک کو بھی پانی نہیں مل سکا تو وہ امام حسینؑ کے لشکر میں شامل ہو گئے اب یہیں سے حق و باطل

میں حق کی فتح شروع ہوگئی۔ کسی کو قتل کردینا اور بات ہے لیکن کسی کا دل تسخیر کرلینا ایک بہت عظیم کارنامہ ہے۔ یہ عمل بہت مشکل ہوتا ہے۔ بیعت سے انکار کے عمل میں امام حسینؑ کا ایک عظیم پیغام تھا جو جدید شاعری میں حق وانصاف وصداقت کے لئے اپنے موقف پر قائم رہنے کو سمجھتے ہیں یہ ایسی علامت ہے جو کہ جدید شاعری میں شدت سے استعمال کی گئی ہے۔

کربلا نے ایک طرف سچے اسلام اور اس کی اقدار کا تحفظ کیا اور خون حسینؑ نے ان اقدار کی بقا کی ضمانت کی دوسری طرف کربلا نے فکر ونظر کے جادے روشن کئے اور عالم اسلام کی ذہنی وعلمی ترقی کا اثاثہ فراہم کیا اور تیسری طرف اس جذبہ آزادی کو فروغ دیا جو ہر دور میں انقلابی رجحانات وتحریکات کو اسلحے فراہم کراتا رہا۔ کربلا کا تیسرا فیضان تاریخ انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے دراصل کربلا تاریخ انسانیت کا وہ روشن سنگ میل ہے جس نے تمام انقلابوں، آزادی کی تحریکوں، اور عدل ومساوات کے نظریات کے لئے راستے کھول دیئے یہ ایک ایسا موضوع ہے۔ جس پر ہر قوم کے فرد کے بلکہ مختلف مذہب وعقائد کے قومی رہنماؤں کے تاثرات بھی بہت واضح طور پر ملتے ہیں، ان میں ایک شخصیت بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو (سابق گورنر یوپی) ہیں ان کے خیال میں کربلا کی کیا اہمیت ہے۔

> شاید ہی کوئی واقعہ اتنا الم ناک اور دل دوز ہو جتنا کہ کربلا کا سانحہ ہے آج تیرہ صدیوں کے بعد بھی یہ لاکھوں انسانوں کو خون کے آنسو رلانے کی صلاحیت رکھتا ہے تیرہ سو سال بعد بھی اس مقدس شہادت کی عظمت وشوکت ظلم اور باطل کے خلاف کش مکش کی اعلیٰ ترین نشانی ہے۔[1]

اس طرح اس سلسلے میں ہمارے ملک کے ایک اور مشہور ومعروف رہنما اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنی رائے کا اظہار کربلا کے عظیم سانحے کے بارے میں ان

---

[1] بحوالہ الواعظ (ذبح عظیم نمبر ۱۹۸۴ء) تقریر یادگار حسینی حیدرآباد

لفظوں میں کیا ہے کہ

"تاریخ کا ایک سبق آموز واقعہ اس میں وہ عظیم جاودانی اثر ہے جو کربلا کے غم انگیز سانحہ سے دنیائے اسلام پر مرتب ہوا۔ باعث تعجب یہ امر ہے کہ ان طویل صدیوں میں ان نفسوں پر یہ عظیم الشان اثر ہے اور یہ لاتعداد افراد کی ہمدردیاں حاصل کرتا رہا ہے۔[1]

یہ عظیم سانحہ اپنی تمام عظمتوں کے سبب ایک ایسی مثال بن گیا ہے کہ ہمیشہ اس کا چرچا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس میں زندگی کی پرتیں موجود ہیں یعنی وہ تہ داری جس میں ظلم کی مخالفت کے رنگ موجود ہیں وفاداری کی مثال ہستیاں، صبر کے جوہر، جاں نثاری کے جذبے خودداری اور قناعت کے رنگ میں امن و آشتی جاں بازی و جاں سپاری کے رنگ وفاداری اور استقلال کے رنگ روشن ضمیری اور احساس ندامت کے تمام رنگ اس سانحہ میں جا بجا ملتے ہیں۔ ہمارے ملک کے عظیم رہنما راشٹر پتا مہاتما گاندھی نے اس سانحہ کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

امام حسینؑ نے اپنی اولاد نیز پورے خاندان کے لئے پیاس اور موت کی تکالیف کو قبول کرلیا مگر ارباب حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کی ترقی اس کے ماننے والوں کی تلوار کی بدولت نہیں ہوئی بلکہ اس کے فقرا کی قربانیوں کی بدولت ہوئی۔"[2]

دنیا کے مختلف مذہبوں کے عظیم لوگوں کو بھی اس سانحہ عظیم کی عظمت کا اعتراف ہے۔

دراصل تلوار پر شہادت کی یہ فتح بڑی عجیب وغریب وحیرت انگیز تھی جدید شعراء کے یہاں بھی اسی واقعے کے استعارے تنہائی، محاورے اور علامتیں واسلوب کا نیا پن اسی واقعے کے سبب ابھرا

---

۱ بحوالہ الواعظ (ذبح عظیم، ستمبر ۱۹۸۴ء) مسیح ۱۵ مارچ ۱۹۴۱ء

۲ الواعظ: حسینی دنیا، اکتوبر ۱۹۸۴ء

ہے۔ اور واضح شکل اختیار کی ہے جدید شعراء کے ساتھ بھی یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی تنہائی، اپنے عصر کی کربلا، اندر کی گھٹن اور تشنگی کا شکار رہے یہ سب علامتیں اس نے کربلا کے پس منظر میں تلاش کی ہیں۔ یہ مقصد کے لئے شہادت کا ایک زبردست کارنامہ ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

معراج پاتا ہی رہا مقصد حسینؑ کا
بڑھتا رہا حسینؑ کا لشکر تمام رات

(ریاضت عابدی نوگانوی)

یہاں حسینؑ کے لشکر کا تمام رات بڑھنا عجیب حیرت ناک امر ہے۔ امام حسینؑ نے جب بیعت سے انکار کیا تو یزید اپنے مقصد میں اس طرح ناکام ہوا کہ ہر عہد میں ظلم کی شکست کی مثال بن کے رہ گیا:

بیعت سے کیا حسینؑ نے انکار کردیا
ہر مقصد یزید کو بے کار کردیا
خطبہ سے اہل شام کے دل کٹ کے رہ گئے
زینب نے لفظ لفظ کو تیار کردیا

(سروش مچھلی شہری)

امام حسینؑ نے کربلا میں شہادت کے فلسفے پر ایک زبرست جامع اور مکمل کتاب لکھ دی ہے ہر بے کس کے لئے انہوں نے نعرہ دے دیا انقلاب کا نعرہ، قربانی کا اصلاحی نعرہ، حصول حیات ابدی کا نعرہ، آپ نے ارشاد فرمایا تھا

"موت فی عز خیر من حیاۃ فی ذل"

ایک دوسرے مقام پر امام حسینؑ نے ارشاد فرمایا ہے

و زل الحیــوۃ و ذل الممات و کلا اساہ طعاما دبتلا فان

کانه بدا احداهما فیبروا الی الموت سیدا جمیددد[1]

(منتخب ربیع الابرار زمخشری)

یعنی ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے، زندگی کے آثار حسینیت میں ملتے ہیں، وفا اور جاں سپاری کے آثار کربلا میں امام حسینؑ معہ انصار اور اعزاء کے کردار میں ملتے ہیں۔

بات ہے ایمان کی قرآن ناطق ہیں حسینؑ
اور یہ عباسؑ اس کی بولتی تفسیر ہے
ان کے روضے کو نگاہ معرفت سے دیکھئے
ایسا لگتا ہے کہ اک قصر وفا تعمیر ہے

حضرت زینب کے کردار میں جو عزم و استقلال اور صبر کے جوہر ملتے ہیں۔ وہ بھی بے مثال ہے

ہٹا کر ظلم و استبداد کے چہرے سے پردے کو
سر زینب کی چادر نصرت شبیر کرتی ہے

اسی طرح حر کے کردار میں بھی ندامت، شرمندگی اور پھر حق کی حمایت میں شہادت کو اپنانا یہ سب چیزیں مل کر ایک نئے کردار کی تخلیق کرتی ہیں، حر علامت بن گیا اس انسان کی جو ظلم کا ساتھ چھوڑ کر حق کے ساتھ ہو گیا اور صداقت کے لئے شہید ہو گیا۔

حر کشمکش میں تھا کہ یہ آئی ندائے غیب
بدلیں گے اپنے ہاتھ سے قسمت تیری حسینؑ

(گوہر سالکی)

بہر حال یہ تمام کردار کربلا کے آئینے میں جگمگا رہے ہیں، کہیں یہ علامت بن گئے ہیں تو کہیں استعارہ بن گئے ہیں، کربلا کی علامتوں کا جدید اردو شاعری میں ایک اہم کردار ہے۔

---

[1] کاروان حیات ممبئی، ارشد حسین ایڈوکیٹ

علامت نگاری اظہار کا ایک خاص اسلوب ہے۔ کربلا کے کردار علامت نگاری کے لئے بہت مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ جہاں تک علامت کا تعلق شاعری سے ہے تو سلیم شہزاد کا خیال ہے کہ

> ''یوں تو علامت نگاری ادب میں کوئی نیا تصور نہیں لیکن علامت پسندی (Symbolism) یا نئی علامت نگاری کا تصور ضرور نیا ہے کیوں کہ یہ نئے ادب یا نئی شاعری سے متعلق ہے عموماً علامت نگاری کو ادبی یا شعری اظہار کا ایک اسلوب خیال کیا جاتا ہے'' ۱؎

ایسا نہیں کہ علامت نگاری صرف جدید شعراء کے یہاں ہی ملتی ہے بلکہ علامات میر اور نظیر کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں اور غالب اور اقبال کی شاعری بھی علامت سے مزین ہے (علامت استعارے ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے) ہاں یہ ضرور ہے کہ جدید ذہن نے اس سے کچھ زیادہ ہی استفادہ کیا ہے دراصل کربلا کا موضوع ہر عہد اور ہر دور میں ادب کا حصہ بنا رہا چاہے وہ قلی قطب شاہ کا دور ہو یا ولی دکنی کا۔ میر و غالب کی شاعری ہو چاہے آتش و مصحفی کا عہد ہو ہر دور میں شاعری کے دامن میں کربلا نے گل بوٹے کھلائے ہیں یہ ایسا بیش قیمت ادبی سرمایہ ہے جس سے ہر عہد میں شعراء فیض یاب ہوتے رہے ہیں لیکن جدید دور میں غزل اور نظم کے حوالوں میں بہت واضح شکل ہے یہ تاریخی حوالہ بار بار دوہرایا گیا ہے اس کی بے پناہ اہمیت اس لئے ہے کہ انسان اور معاشرے میں کہیں کسی دور میں اتنا غم ناک اور دلدوز اتنا اثر انگیز واقعہ رونما نہیں ہوا ہے یہ ایک عام خیال ہے کہ جدیدیت کے لئے روایت سے قطعی انحراف فرض ہے یعنی جب تک اپنے تاریخی شعور سے ذہنی و جذباتی طور پر خود کو منقطع نہیں کر لیتے کسی نئی شعری روایت کی تشکیل ممکن نہیں اس تصور کا اتنا زیادہ اثر پڑا کہ ہر جدید شاعر خود کو روایت سے نابلد کہنے میں فخر محسوس کرنے لگا منحرف شعراء کے الفاظ میں 'متعلق ہو جانے کے خوف یا اپنی فکر کے دباؤ میں قدامت کے دامن سے لپٹے'

۱؎ جدید شاعری کی ابجد۔ سلیم شہزاد۔ صفحہ ۳۴

رہے اس صورت حال کے دو نمایاں پہلو ہیں اولاً جدیدیت کے لئے ہم اپنی روایات کی زمین کو بنیاد قرار دیتے ہیں اور نتیجے میں خود کو دھارے سے کاٹ کر وسعتوں میں بہنے سے گریز کرتے ہیں اور یہ روایت شاعری کو ہمارے مذہبی عقائد اور تاریخی حوالے کی طرف بھی لے گئی ہے اور جدید شعراء نے اس تاریخی حوالے کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ دراصل موجودہ عصر اور جدید فکر کے پس منظر میں جدید لفظیات کے ذریعے کیا گیا شعری اظہار جدید شاعری ہے اور علامت، اسطور نگاری تمثیل یہ سب جدید شاعری کے اہم جزو بن گئے ہیں اور یہ سب جزو واقعہ کربلا میں ایک ساتھ مل جاتے ہیں۔

جدید شاعری میں پیکر نگاری (Imagery) کا عمومی مفہوم وہی ہے جو محاکات کا ہے یعنی واقعات کی صورت کشی کرنے والا حکایتی بیان۔ اور اس سے پیکر تراشی کا یہ مفہوم بھی لیا جاتا ہے پیکر صرف عمل یا اشیاء کی دکھائی دینے والی لفظی تصویریں ہیں جنہیں بصری پیکر (Visual Image) کہتے ہیں۔ کامیاب پیکر تراشی وہی ہے جس سے قاری کے تمام حواس بے دار ہوں۔ علامت کی خصوصیت اختصار اور پیکر کی خصوصیت وسعت ہے۔ علامت صرف اشارہ کرتی ہے جب کہ پیکر کے ذریعہ کوئی واقعہ من وعن یا چند صورتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ کربلا کے تاریخی حوالے میں پیکر نگاری کے کمالات بھی نظر آتے ہیں۔ مظہر امام کی ایک نظم ''اکھڑتے خیموں کا درد'' کا ایک حصہ پیکر نگاری کے سلسلے میں درج ہے

عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر

سسک رہے ہیں

یقین کی سانس اکھڑ چکی ہے

عزیز قدروں پہ جاں کنی کی گرفت

مضبوط ہو گئی ہے

یہ تمام مصرعے تمثیلی ہیں شاعر نے عقیدے، یقین اور اقدار و رشتوں کی تشخیص کی ہے۔ بہر حال ان سب رجحانات میں کربلا نے بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے جدید شاعری کے تمام رجحانات میں سانحہ کربلا کا بہت اہم رول ہے بہر حال یہ موضوع ہمارے عہد کی تخلیقی شخصیت اور شعری وجود کا حصہ بن چکا ہے۔

کربلا ابتداء سے شعراء کے کلام میں استعاروں کی شکل میں موجود ہے۔ سب سے پہلے تو رثائی ادب میں ایک بہت بڑا سرمایہ کربلا کی وجہ سے ملتا ہے بعد میں رثائی ادب کے اثرات غزلوں پر پڑنے لگے غزل میں جگہ بنانے کے بعد دھیرے دھیرے یہ قصہ نظموں میں لایا جانے لگا اور اس کے بعد جدید شاعری نے اسے قطعی طور پر اپنا لیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی رائے میں

> ''حسینؑ ابن علیؑ کی حق شناسی پامردی استقلال اور فقید المثال ایثار و قربانی اور اہل بیت کا دکھ اور مصائب کو صبر و شکر سے جھیلنے کی طاقت و توفیق ایسا سرچشمہ سعادت ہے جس سے جدید دور میں اردو غزل اور اردو نظم کی نئی تخلیقی جہات روشن ہوئی ہیں۔ اور معنی آفرینی اور تاثیر و دردمندی کے نئے افق سامنے آئے ہیں۔''[1]

دراصل واقعہ کربلا داستان عشق بھی ہے اور داستان غم بھی۔ امام حسینؑ نے لہو سے عشق الٰہی کی حفاظت کی۔

داستاں حسن کی سادہ سا ورق تھی پہلے
عشق نے خون سے رنگیں کیا افسانے کو

امام حسینؑ اور ان کے انصار کی وفاداری، صبر پامردی کے مظاہرے داستان عشق کی

---

[1] سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، گوپی چند نارنگ، صفحہ ۱۰۲

لوح کی زینت ہیں۔

داستاں حسن حقیقت کی تھی رنگین پہلے
اتنی رنگیں نہ تھی خون شہدا سے پہلے

سینچا ہوا لہو سے اک گلشن وفا ہے
عشق غیور تیر آئینہ کربلا ہے

نہ وہ شوق خونچکاں ہے نہ وہ کربلا کا مقتل
رہ عشق میں کسی کے قدم استوار بھی ہیں
(جعفر علی خاں اثر)

جب الفاظ وفور جذبہ شوق کے اثرات کو ظاہر کرنے کے لئے ادب میں ناکافی ثابت ہوتے ہیں تو اس جگہ کربلا کے لفظ سے اظہار و جذبات کی خانہ پری کی جاتی ہے۔ ضمیر اختری نقوی کی رائے میں

"غزل میں بے شمار محاوروں استعاروں اور تراکیب میں صاف صاف واقعات کربلا کا اظہار پایا جاتا ہے یہ فہرست خاصی طویل ہے لیکن چند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ ظالم و مظلوم۔ صیاد اور صید، قاتل اور مقتول، بسمل زخمی، دامن خوں آلود، خنجر، سناں تیر بھالے نیزے کے ہزاروں مضامین غزل میں ملتے ہیں اور یہ سب واقعہ کربلا سے ماخوذ ہیں۔"[1]

غزل اور اردو شاعری میں جو پیکر ملتا ہے وہ انہیں ترکیبوں سے ماخوذ ہے۔ جواں مرد،

---

[1] اردو غزل اور کربلا، صفحہ ۶۹، ضمیر اختر نقوی

شجاع، شہادت کا شائق، قربان گاہ محبت میں ہمت سے قدم رکھنے والا یہ سب امام حسینؑ کے کردار سے اردو شاعری نے اخذ کیا ہے۔

جدید اردو شاعری میں یہ تمام خصوصیات جمع کر لی گئی ہیں۔ ان تمام شعری خصوصیات نے ایک رجحان کی شکل اختیار کر لی ہے اور کربلا جدید اردو شاعری کا ایک بہت اہم رجحان اور استعارہ بن گیا ہے۔

کتابیات

کتاب	مصنف/مؤلف	سن اشاعت	مطبع خانہ	صفحہ
اسلامیات	حفیظ ہوشیار پوری	۱۹۵۱ء	ادارہ مطبوعات پاکستان	
شہید انسانیت	مولانا علی نقی نقگن میاں		نامی پریس لکھنؤ	
نقوش اسلام	رضوان الدین خاں	۱۹۷۹ء	فرینڈ بک ہاؤس علی گڑھ	
اسلام اور مسلم	بابا خلیل احمد	۱۹۶۰ء	عالم پورہ بنارس	
اسلام ایک نظر میں	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۹۶۱ء	مکتبہ اسلامی دہلی	
احیائے اسلام	مولانا وحید الدین خاں	۱۹۸۲ء	مرکز دہلی ٦	
دنیا اسلام سے پہلے	عبدالسلام قدوائی	۱۹۷۲ء	مکتبہ جامعہ نگر دہلی	
تاریخ احمدی	شیخ احمد حسین	۱۹۴۶ء	نامی پریس لکھنؤ	
اسلامی تاریخ	اے اے ہاشمی	۱۹۷۷ء	بک ہاؤس علی گڑھ	
تاریخ ائمہ	مولانا سید علی حیدر			
اسلامیات	مالک رام	۱۹۸۴ء	دریا گنج دہلی	

سیرت النبی	مولوی شبلی		
تاریخ اسلام (دوئم)	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی		اعظم گڑھ
ہماری بادشاہی	مولوی عبدالسلام قدوائی	۱۳۵۵ھ	اعظم گڑھ
توضیح المسائل	آیت اللہ اعظمی ابوالقاسم	۱۴۰۴ھ	نشان پاڑہ ممبئی
تاریخ احمدی	نواب احمد حسین پریاواں	۱۳۹۱ھ	نامی پریس لکھنؤ
رسول عربی	پروفیسر جی ایس دارا	۱۹۷۹ء	آفریدیان رامپور
تاریخ اسلام (اول)	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	۱۹۸۶ء	تاج کمپنی دہلی
تاریخ اسلام (اول)	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	۱۹۸۶ء	تاج کمپنی دہلی
پیغمبر اعظم و آخر	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	۱۹۸۴ء	تاج کمپنی دہلی
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	عبداللہ امان	۱۹۷۱ء	اردو بازار دہلی
تاریخ عرب	مسٹر او کلی		
چودہ ستارے	نجم الحسن کراروی	۱۳۹۳ھ	موچی دروازہ لاہور
انیس کے مرثیے	صالحہ عابد حسین		
اردو مرثیہ	سفارش حسین		
اردو مرثیے کا ارتقاء	سید علی حیدر	۱۹۸۴ء	الہ آباد
کلیات محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری		حیدر آباد
اردو مرثیہ اور مرزا دبیر	کاظم علی خاں		
اردو مرثیہ	ڈاکٹر شارب ردلوی		دہلی

اردو مرثیے کا ارتقاء ابتدا سے انیس تک	مسیح الزماں	۱۹۸۳ء	اردو اکیڈمی لکھنؤ
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	۱۹۸۵ء	اردو بیورو دہلی
تذکرہ مرثیہ نگاران اردو (دوئم)	امیر علی بیگ جونپوری	۱۹۸۶ء	لکھنؤ
دکن میں مرثیہ اور عزاداری	رشیدہ موسوی		حیدر آباد
مراثی میر انیس میں مناظر قدرت	سید منتظر جعفری	۱۹۸۸ء	لکھنؤ
طبقات شعرائے ہند	کریم الدین	۱۹۸۳ء	اردو اکیڈمی
تعارف مرثیہ	شجاعت علی سندیلوی		الٰہ آباد
موازنہ انیس و دبیر	شبلی نعمانی	۱۹۶۳ء	اردو اکیڈمی لکھنؤ
شعراء الہند حصہ دوئم	عبدالسلام ندوی	۱۹۵۴ء	دانش محل لکھنؤ
انیسیات	مسعود حسن رضوی ادیب	۱۹۷۶ء	لکھنؤ
انیس شناسی	صالحہ عابد حسین	۱۹۸۱ء	دہلی
انیس شناسی	علی جواد زیدی		اردو بیورو دہلی
دبستان دبیر	ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی	۱۹۶۶ء	نسیم بک ڈپو لکھنؤ
یادگار ضیغم	محمد عبداللہ خاں ضیغم		دہلی
میر عشق اور انکے خاندان کی مرثیہ گوئی	جعفر رضا		دہلی

انیس شناسی — علی سردار جعفری — ۱۹۸۱ء — دہلی

سانحہ کربلا بہ طور شعری استعارہ — گوپی چند نارنگ — ۱۹۸۶ء — دہلی

اردو مرثیے پاکستان میں — ضمیر اختر — ۱۹۸۲ء — جناح روڈ پاکستان

جدید اردو مرثیہ — محمد رضا کاظمی — ۱۹۸۱ء — مکتب ادب کراچی

افکار انیس — ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۹۷۲ء — گولہ گنج لکھنؤ

انتخاب قلی قطب شاہ — قلی قطب شاہ — اردو اکیڈمی لکھنؤ

دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی — اردو بیورو دہلی

کلیات ولی دکنی — ولی دکنی — اردو اکیڈمی لکھنؤ

کلیات شاہی — علی عادل شاہ شاہی — اردو اکیڈمی لکھنؤ

دیوان سودا — مرزا محمد رفیع سودا — دہلی

دیوان غالب — اسد اللہ خاں غالب — اردو اکیڈمی لکھنؤ

انتخاب مومن — مومن خاں مومن — اردو اکیڈمی لکھنؤ

اردو غزل اور کربلا — ضمیر اختر نقوی — پاکستان کراچی

انتخاب فضل الحسن حسرت موہانی — فضل امام — ,, ,, — اردو اکیڈمی لکھنؤ

مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی حیات اور ادبی کارنامے — سید سکندر آغا — ۱۹۸۵ء — نظامی پریس لکھنؤ

دیوان شوق — مرزا شوق — اردو اکیڈمی لکھنؤ

دیوان صفی لکھنوی — مرتب — اردو اکیڈمی لکھنؤ

تاریخ مسلم لیگ	مرزا دہلوی		اردو اکیڈمی دہلی
آزادی کی	دور آفریدی		
تینتیس سالہ تاریخ			
محمد علی جناح	رئیس احمد جعفری ندوی		اردو اکیڈمی لکھنؤ
تاریخ تحریک آزادیٔ ہند	تارا چند	۱۹۸۵ء	اردو بیورو دہلی
تاریخ کانگریس	ڈاکٹر پٹابھی ستیہ رمیہ		کشمیری گیٹ دہلی
ہماری آزادی	پروفیسر محمد مجیب	۱۹۶۱ء	ممبئی
اردو ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی		اردو بیورو دہلی
تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	۱۹۷۸ء	اردو بیورو دہلی
ترقی پسند ادب کے	قمر رئیس	۱۹۸۷ء	دہلی
پچاس سال			
ترقی پسند تحریک کی	علی سردار جعفری	۱۹۸۷ء	یونیورسٹی دہلی
نصف صدی			
جدیدیت تجزیہ و تفہیم	ڈاکٹر مظفر حنفی	۱۹۸۵ء	نسیم بک ڈپو لکھنؤ
جدید شاعری کی ابجد	سلیم شہزاد	۱۹۸۳ء	منظر نما مالیگاؤں
جدیت کی فلسفیانہ اساس	شمیم حنفی		جامعہ دہلی
اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم		دہلی
تنقید کے پرانے موضوع	انیس اشفاق		دہلی
کی خشت اول			
اردو میں ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی		لکھنؤ

ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری		گورکھپور
تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین		فروغ ادب لکھنؤ
لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی		اردو اکیڈمی لکھنؤ
انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام		اردو اکیڈمی لکھنؤ
روح چکبست	رضوان احمد	۱۹۸۸ء	نسیم بک ڈپو لکھنؤ
کلام ثاقب لکھنوی	مرتب		اردو اکیڈمی لکھنؤ
کلام آرزو لکھنوی	مرتب		اردو اکیڈمی لکھنوی
کلام یگانہ چنگیزی	مرتب		اردو اکیڈمی لکھنؤ
نشاط روح	اصغر گونڈوی	۱۹۲۵	اردو اکیڈمی لکھنؤ
سفر زاد	اجمل اجملی		اردو اکیڈمی لکھنؤ
گلدستہ سلام	سید علی امام زیدی گوہر لکھنوی		لکھنؤ
میراجی کی نظمیں	میراجی	۱۹۴۴ء	دہلی
جانان جاناں	احمد فراز	۱۹۷۹ء	لکھنؤ
رشتہ کلام	محسن زیدی		اردو اکیڈمی لکھنؤ
سفر ناتمام	وامق جونپوری		اردو اکیڈمی لکھنؤ
دست صبا	فیض احمد فیض	۱۹۸۸ء	علی گڑھ
ایک خواب اور	علی سردار جعفری		ممبئی
صد برگ	پروین شاکر		کراچی
ساز سخن	ادا جعفری	۱۹۸۸ء	دریا گنج دہلی

برزخ	امجد اسلام امجد		کراچی
ویران سرائے کا دیا	عبیداللہ علیم	۱۹۸۲ء	کراچی
خالی ہاتھوں میں ارض وسما	سلیم کوثر	۱۹۹۱ء	کراچی
خواب کا در بند ہے	شہریار	۱۹۸۵ء	لاہوتی فائن آرٹ
قبائے ساز	مصطفیٰ زیدی		راولپنڈی پاکستان
چراغ نیم شب	سلیم احمد	۱۹۸۶ء	لکھنؤ
سات سماوات	عرفان صدیقی	۱۹۵۲ء	تنویر پریس لکھنؤ
آئینے کی اس طرف	عالم تاب تشنہ	۱۹۸۵ء	کراچی آفسیٹ پریس
مہر دو نیم	افتخار عارف	۱۹۸۳ء	لنڈن دہلی
نئی غزل نئی آوازیں	اسد بدایونی	۱۹۸۷ء	علی گڑھ
ذرا موسم بدلنے دو	سلیم کوثر	۱۹۹۰ء	کراچی
یہ چراغ ہے تو جلا رہے	سلیم کوثر	۱۹۸۸ء	جناح روڈ پاکستان
مہر دو نیم (پیش نامہ)	افتخار عارف فیض احمد فیض		لنڈن
ساز و سخن (پیش لفظ)	حمایت علی شاعر		دہلی
غیر مطبوعہ منارہ ہدایت (کیفی اعظمی)	مرتب افتخار حسین		

رسائل

رسائل	مصنف/مؤلف	سن اشاعت	مطبع خانہ	صفحہ
شب خون	گوپی چند نارنگ	۱۹۸۷ء	الٰہ آباد	
الحسین	شیخ محمد احمد پانی پتی		لکھنؤ	
کاروان حیات	ڈاکٹر حسین فاروقی		ممبئی	
نیا دور	سید مسعود حسن رضوی	۱۹۶۲ء	لکھنؤ	
آج کل	علی احمد فاطمی	۱۹۹۳ء	لکھنؤ	
سفرزاد	پروفیسر سید محمد عقیل		اردو اکیڈمی	
حسینی دنیا (الواعظ)	مہاتما گاندھی	۱۹۸۴ء	لکھنؤ	
چند تاثرات احمد فراز اوران کی نظمیں	قمر رئیس	۱۹۸۸ء	سوئنر جشن فراز دوبئی	
مطبوعہ نشانات	سلیم شہزاد	۱۹۷۵ء		
محسن	عمران عظیم		علی گڑھ	
ادیب	پروفیسر عبدالعظیم	۱۹۸۱ء	علی گڑھ	
الواعظ تقریر یادگار حسینی	سروجنی نائیڈو	۱۹۸۴ء	لکھنؤ	

URDU SHAYERI ME WAQIAAT-E-KARBALA

ڈاکٹر نسیم نکہت
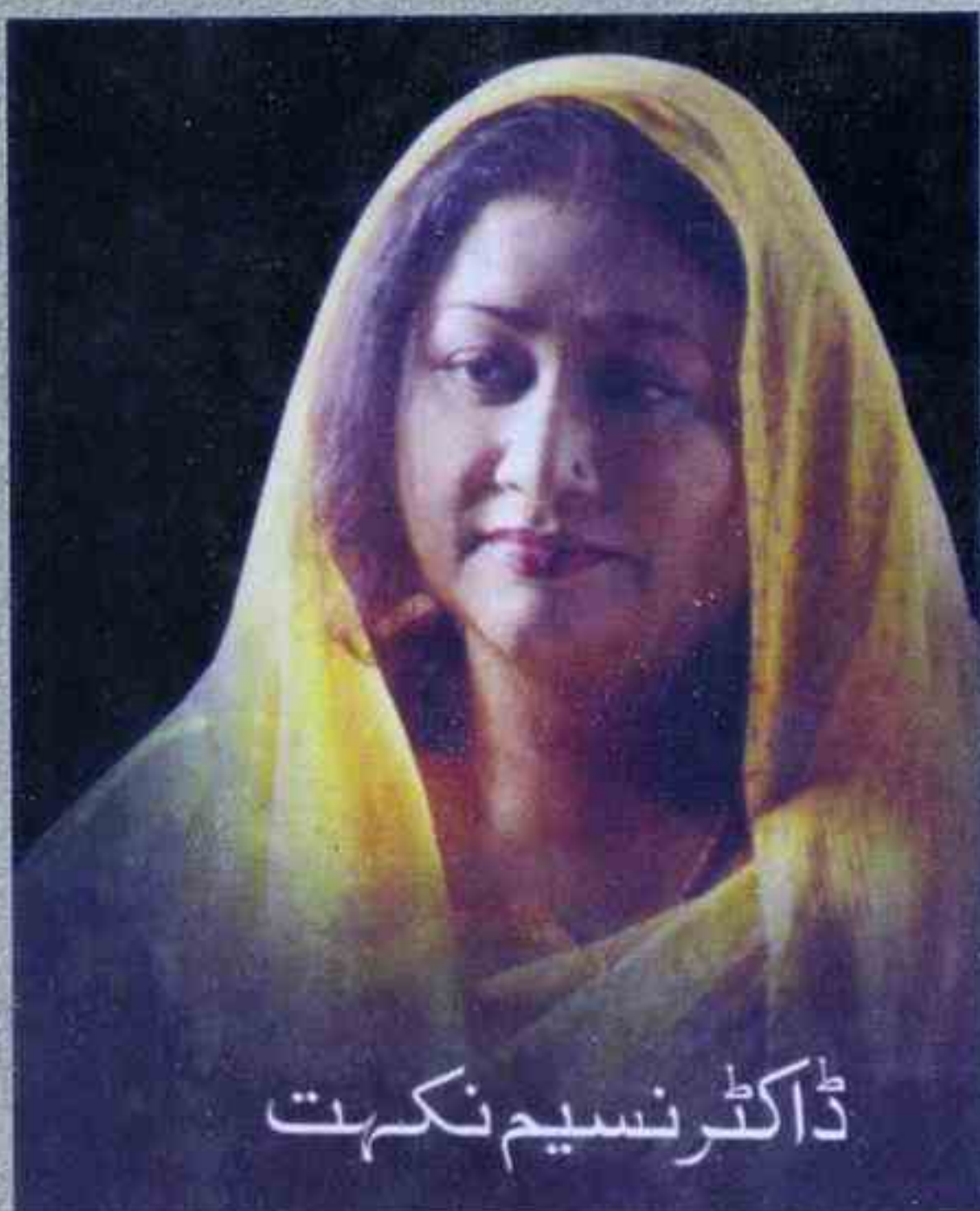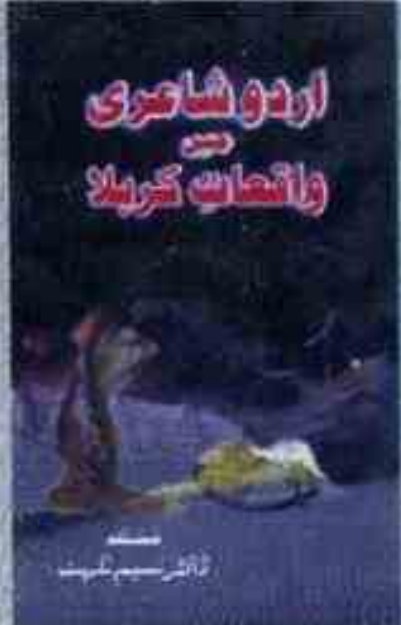
Dr. Naseem Nikhat
M.A. Ph.D. Lucknow University
Lucknow
Mob.: 09415015186
E-mail: naseemnikhat@yahoo.co.in